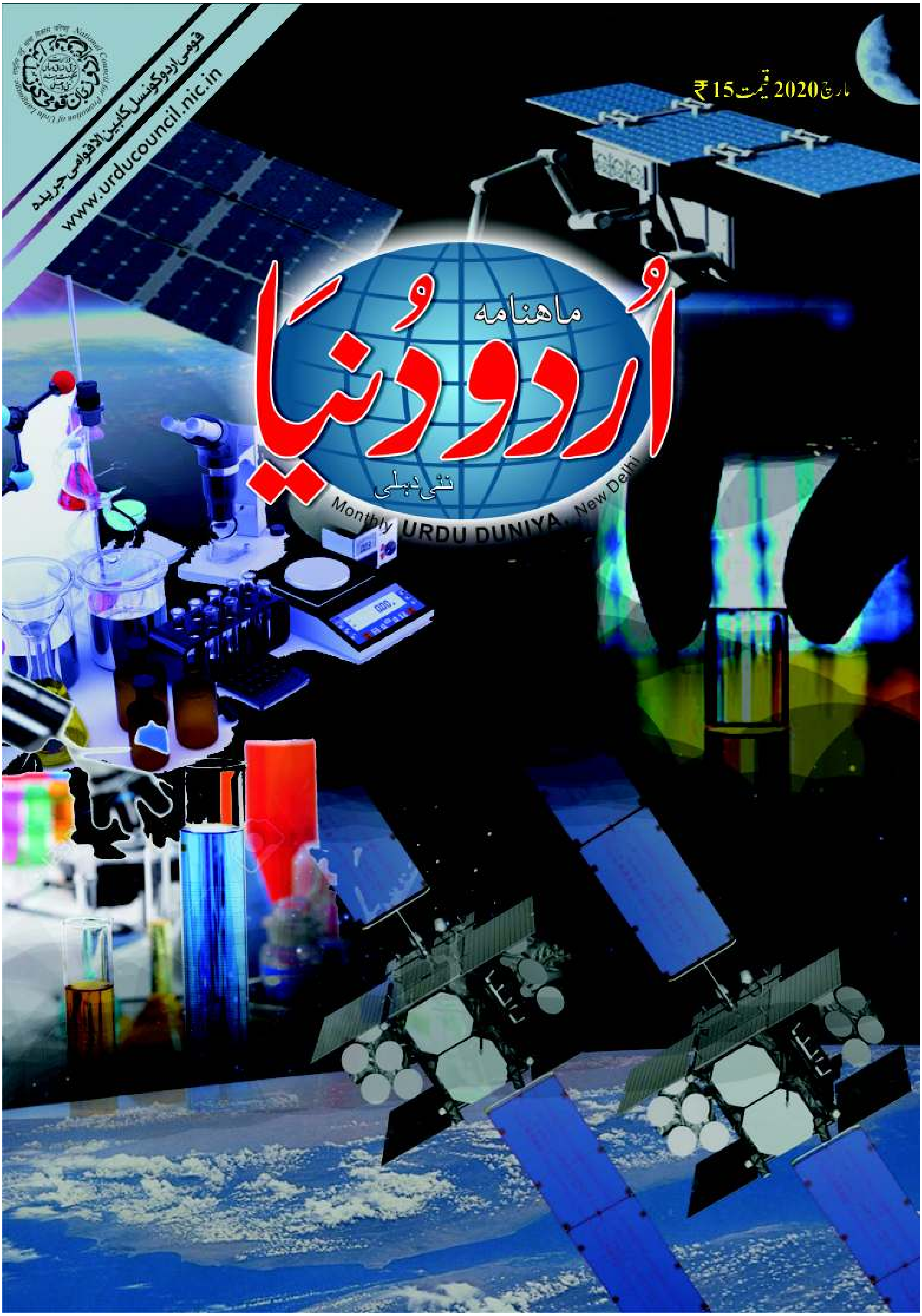
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in
مارچ 2020 قیمت 15₹
ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

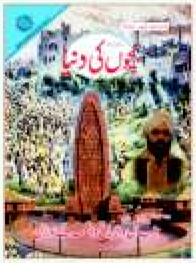
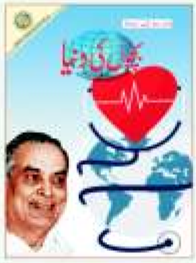

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

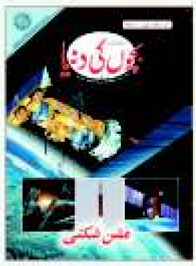

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:22، شمارہ:03، مارچ 2020

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 5

زبان و تعلیم
اردو زبان کی تدریس میں مبادلہ تدریس کا استعمال — آفاق ندیم خان — 8

نقد و نگاہ
فارسی میں درباری شاعری — شریف حسین قاسمی — 11
قرۃ العین حیدر — صدیق محی الدین — 14
داغ کے ایک شاگرد مولانا حسن رضا خاں بریلوی — اعلم شمس — 18
شخصی مرثیہ: معنی و مفہوم — نصرت نبی — 21
اردو میں انگریزی منظوم تراجم کی روایت — اسد عمران — 26
ترجمہ سے ترجمانی تک — امیر حمزہ — 30

جائزہ
2019 کا فکشن — اسلم جمشید پوری — 34

خراج عقیدت
سید محمد عقیل رضوی کے خطوط رضا نقوی واہی کے نام — مناظر عاشق ہرگانوی — 40
خدیجہ عظیم سے پہلی اور آخری ملاقات — فیضان الحق — 42

شخصیات
ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ بحیثیت نظم گو — کمار پانی پتی — 46
وفا ملک پوری — محمد اظہار حسین — 49

مانوس سہسرامی کی شاعرانہ عظمت — پرویز اشرفی — 51

تہذیب و ثقافت
قدیم گوالیار میں فن مصوری اور بت گری کی روایت — وقار صدیقی — 53

نیا آسماں نئے ستارے
دکنی منظومات میں نقد شعر کی روایت — آصف مبین — 55
صنف رباعی کا آغاز وارتقا — عامر شیرازی — 58

نگر نگر اردو
مشرقی خاندیش کے موجودہ نثر نگار — وسیم عقیل شاہ — 63

سائنس
البرٹ آئنسٹائن — نورالہدیٰ — 66
خلا تک پہنچنے والی لفٹ — انیس الحسن صدیقی — 68
انسانی زندگی میں کیمیائی ٹیکنالوجی کا دخل — محمد آصف — 72

کمپیوٹر
ریویو اور ویو — 75

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ — 78

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ — 87

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 88

ہماری بات

اکیسویں صدی میں اردو ادب کو بہت سے چیلنجز کا سامنا ہے۔ بہت سے سوالات ہیں جن کے معروضی اور منطقی جوابات کی ضرورت ہے۔ یہ سوال بھی پیدا ہو رہا ہے کہ اس عہد میں ادب کی سماجی معنویت کا دفاع کس طور پر کیا جائے اور اس کی افادیت کو بیان کرنے کے لیے کیا نقطۂ نظر اختیار کیا جائے کہ آج کا پورا معاشرہ افادی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دے رہا ہے اور جو غیر مفید اشیا ہیں ان سے گریز کی ایک صورت سامنے آ رہی ہے۔ اردو ادب کے ساتھ معاملہ یہ بھی ہے کہ ادب کے پرانے مسائل پر بھی کما حقہ گفتگو نہیں ہو پائی ہے۔ ادب میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان پر بھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا ہے۔ ہم سب اپنی پسند ناپسند، اپنی نظر اور اپنے نظریے میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں اسی لیے ادب کے بنیادی مسائل سے ہماری توجہ ہٹتی جا رہی ہے اور اس کی وجہ سے ادب کا ارتقائی سفر ایک نقطے پر ٹھہر سا گیا ہے۔ نئے عہد کے اپنے تقاضے و مطالبات بھی ہوتے ہیں اور ان مطالبات پر توجہ بھی بہت ضروری ہے ورنہ ہمارا ادب اپنے عہد سے ہم آہنگ نہیں ہو پائے گا اور اپنی معنویت اور افادیت کھو دے گا۔ جہاں ادب کے تعلق سے بہت سے چیلنجز ہیں، خاص طور پر آج کی کیبل، انٹرنیٹ کے زمانے میں، تو وہیں اردو صحافت کو بھی بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ماضی میں اردو صحافت کی ایک زریں تاریخ رہی ہے اور اس ملک کی تعمیر و تشکیل میں اردو صحافت کا بہت سرگرم کردار رہا ہے۔ خاص طور پر برطانوی شکنجے سے ملک کو آزاد کرانے میں اردو صحافت کا جو رول ہے وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے اور اس صحافت کی قوت یہ تھی کہ اس سے ہندوستان کا ہر طبقہ جڑا ہوا تھا۔ خاص طور پر غیر مسلموں نے اردو صحافت کے ارتقا میں بہت سرگرم اور معنی خیز کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اردو صحافت کا آغاز ایک ایسے اخبار سے ہوا جس کے مالک اور مدیر غیر مسلم طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ کلکتہ کے ہفت روزہ 'جامِ جہاں نما' سے اردو صحافت کی شروعات ہوتی ہے جسے اردو کا پہلا اخبار سمجھا جاتا ہے۔ 27 مارچ 1822 سے اس کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ اس کے مالک ہری ہر دت اور مدیر منشی سدا سکھ رائے تھے۔ یہاں یہ بھی یاد رکھا جانا چاہیے کہ 1823 سے 1900 تک تقریباً پچیس فیصد اردو اخبارات کے مالکان ہندو تھے اور پڑھنے والوں کی اکثریت بھی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ ان اخبارات نے جہاں برطانوی سامراج کے خلاف عوامی جذبات کو ابھارا، وہیں ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے میں بھی ان اخبارات کا رول قابل ذکر رہا ہے اور ہمارے لیے فخر اور مسرت کی بات یہ ہے کہ اردو صحافت صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہی بلکہ یہاں کی سرحدوں سے نکل کر دوسرے علاقوں میں بھی تحریک آزادی کے حامی اخبارات شائع ہوئے۔ امریکہ سے لالہ رام ناتھ پوری نے 'سرکلر آزادی' کے نام سے جنوری 1908 میں اردو کا پہلا اخبار جاری کیا تو وہیں جاپان سے 'اسلاک فریٹرنیٹی' کے نام سے مولوی برکت اللہ بھوپالی نے ایک رسالہ شائع کیا۔ لندن سے بپن چندر پال نے 'سوراج' نام کا ایک سہ لسانی رسالہ شائع کیا اور کیلیفورنیا امریکہ سے لالہ ہر دیال نے ہفت روزہ 'غدر' 1913 میں جاری کیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو ملک کی آزادی میں اردو صحافت کا بہت فعال کردار رہا ہے اور اردو صحافت انیسویں صدی سے اکیسویں صدی تک اپنے تسلسل اور تواتر کو قائم رکھنے میں کامیاب بھی رہی ہے۔

آج اردو صحافت کو ادب کی طرح چیلنجز کا سامنا ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو صحافت جدید ترین تکنیکی وسائل کی وجہ سے تمام چیلنجز کا مقابلہ کر رہی ہے اور معاصر قومی صحافت کے دوش بہ دوش عوامی بیداری کا اہم کام انجام دے رہی ہے۔ اب اردو صحافت کے موضوعات کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ سائنس، قانون، انفوٹینمینٹ، معاشیات، سماجیات بھی اب اردو صحافت کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ پھر بھی یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ سرمایے کی کمی کی وجہ سے اردو اخبارات مالی مشکلات کا شکار ہیں اور انھیں اشتہارات نہ ملنے کی وجہ سے بھی بہت سی دقتوں کا سامنا ہے۔ اردو صحافت ہمارے جذبات و احساسات کی نہ صرف ترجمانی کرتی ہے بلکہ علاقائی، قومی اور عالمی موضوعات اور مسائل سے ہمیں آگاہ کرتی ہے۔ اس لیے اردو صحافت کو درپیش مسائل پر ہمیں سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے!

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

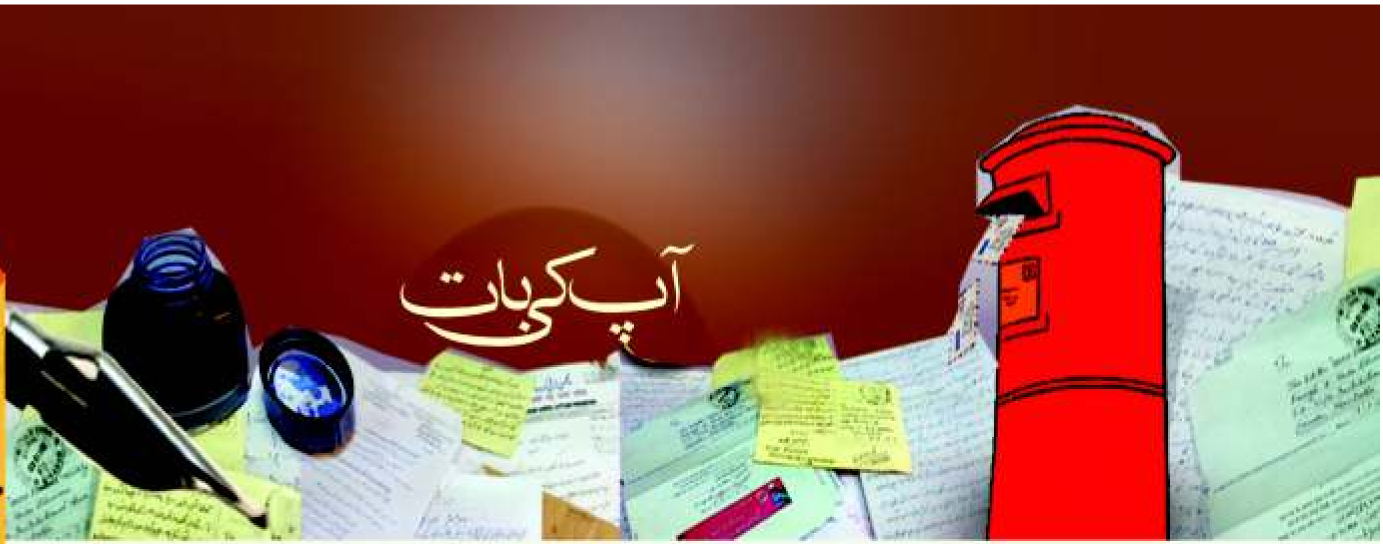

آپ کی بات

✍ 'اُردو دنیا' فروری 2020 نظر نواز ہوا۔ ممنون ہوں کہ تمام جرائد پابندیٔ وقت سے موصول ہو رہے ہیں۔ زیر نظر شمارہ کوئی چودہ شہ سرخیوں اور متعدد ذیلی سرخیوں سے آراستہ ہے۔ اداریے میں کسی بھی زبان بالخصوص اردو زبان کی ترقی کو تراجم سے مربوط کیا گیا ہے جو زندہ قوموں کی فوقیت کی علامت ہے۔ کہتے ہیں کہ یورپی قومیں خصوصاً فرنگی دنیا میں کسی بھی ملک کو فتح کرتے تو وہاں کے کتب خانوں پر پہلے قبضہ کر لیتے اور پھر ان کا سارا علم اپنی زبان میں بذریعہ ترجمہ منتقل کر لیتے جو ان کی طاقت اور عظمت میں

اضافے کا باعث ہوتا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے راج میں کبھی سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ لیکن اُردو تہذیب و زبان کا مزاج برعکس ہے۔ یہاں تصادم کو بذریعہ ترجمہ فرو کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ 'خطوط' کے ذیل میں تنقیدی اور معلوماتی مکتوبات درج ہیں۔ متواتر مراسلات کی ایک غرض و غایت یہ بھی ہوتی ہے کہ مراسلہ نگار کا کوئی مضمون یا مقالہ نظر سے گزرے تو قارئین اس سے متعارف اور اس کے طرزِ فکر سے مطلع رہیں۔

'زبان و تعلیم' کے ذیل میں دیا گیا مضمون بعنوان 'تدریس اُردو زبان.....' اہم مضمون ہے۔ اس میں تدریس کے دوران تحقیق اور اس کے داخلی اور خارجی مسائل کی باریکیوں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ ریسرچ اسکالرس کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ 'نقد و نگاہ' میں چھ قابل قدر مقالے دیے گئے ہیں۔ ان میں 'امراؤ جان ادا اور شاہد رعنا میں بُعد' کسی غیر ملکی کی اچھی تحقیقی کاوش ہے۔ 'یادِ نظیر' کے تحت دو مقالے درج ہیں۔ ان میں 'نظم جدید میں نظیر کا پرتو' کے مطابق جدید نظم کی تشکیل و تعمیر میں نظیر کا دبدبہ ہے جو ایک مبہم سا بیان لگتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ واضح بات کہی جاتی جیسے جدید نظم کی تشکیل نظیر کی مرہون منت ہے یا یہ کہ جدید نظم کی ابتدا نظیر کے کلام سے ہوئی یا جو بھی خیال ذہن میں ہو اُسے وضاحت سے بیان کر دیا جاتا۔ اس تحریر پر نظر ثانی کی کافی گنجائش تھی جو اَب بھی روا رکھی جا سکتی ہے۔ 'برج دیش کا سچا عاشق نظیر اکبرآبادی' اپنے تسلسل و علمی مواد کے اعتبار سے ایک جامع اور مکمل مقالہ ہے۔ ادب کے طلبہ کے علاوہ اسکالرس کو بھی اس مضمون سے اہم نکات بہم پہنچ سکتے ہیں۔ 'خراج عقیدت' میں دو توصیفی مضامین ہیں جن میں دو مرحوم شخصیتوں یعنی پروفیسر نورالحسن نقوی اور شفیع جاوید کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اچھے مضامین ہیں جن سے آپ کو ایسی معلومات بھی حاصل ہو سکتی ہیں جو آپ کے لیے اہمیت رکھتی ہوں۔ ''خصوصی گفتگو' میں سید احمد خاں کا انٹرویو درج ہے۔ اس میں اُردو زبان اور یونانی طرزِ طب کے ربط و ضبط کی وضاحت کی گئی ہے لیکن اس گفتگو کے عنوان سے تو فوری تاثر یہ ملتا ہے گویا اُردو اور یونانی زبان کا تعلق زیر بحث ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ توجہ راغب کرنے کے لیے یہ تکنیک اختیار کی گئی ہو۔ خیر جو بھی ہو پیشکش بہت عمدہ اور نرالی ہے کیونکہ طبی کالجوں میں اُردو میڈیم سے ہی تعلیم دی جاتی ہے۔ قومی اُردو کونسل نے طبابت کے میدان میں بیش بہا کتب تیار کر کے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ 'عالمی ادبیات' کے تحت 'میکبتھ' اور 'ابوعثمان الجاحظ' پر مضامین درج ہیں۔ میکبتھ پر مضمون نہایت سلیقے سے لکھا گیا ہے۔ اس میں شیکسپیئر کے حالاتِ زندگی اور پھر مذکورہ ڈرامے کی تشریح و تفصیل سے اُردو اور ہندوستانی تہذیب پر اس کے اثرات کو پُر اثر انداز میں پیش کیا گیا۔ اس میں نہ اختصار کا احساس ہوتا ہے اور نہ طوالت کا۔ اس لحاظ سے یہ درحقیقت قابل تعریف تحریر ہے۔ جبکہ 'ابوعثمان........' ایک تحقیقی اور عالمانہ مقالہ ہے اور اس درجہ انوکھا ہے کہ آپ علمی ذوق میں کھو جائیں گے۔ اور آپ کو ایک ایسے جذبے کا احساس ہوگا جسے آپ کوئی نام دینے سے قاصر رہیں گے۔ بہت دنوں کے بعد ایسا شاندار مضمون زیر مطالعہ رہا۔ 'نیا آسمان نئے ستارے' میں تین قطب تارے روشن ہیں۔ ان کی چکا چوندھ پڑھتے ہی بنتی ہے۔ 'اکبر الہ آبادی اور نظریہ ڈارون' میں جو چار اُصول دیے ہیں ان میں انگریزی اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ اُردو اصطلاح لکھ کر پھر ان کی صراحت کی جاتی تو بہتر ہوتا۔ مثلاً: (1) کشمکش برائے بقائے زندگی (Struggle for existence) (2) طبعی یا نظری انتخاب (Natural Selection) (متن میں اسے ہی مناسبت سے لکھا گیا) (3) مطابقت (Adaption) (4) قانون توریث (Law of Inheritance) باقی تحریر قابل داد ہے۔ مضمون 'سوشل میڈیا......' اور 'جنوبی ہند میں آن لائن اُردو رسائل.....' تکنیکی اور 'اُردو دنیا' کے مزاج و منہاج سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس لیے تعریف کے قابل ہیں۔ ان ادیبوں اور جرائد سے متعلقہ افراد بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ 'شخصیت' کے ذیل میں تین مضامین شامل ہیں۔ تینوں ادبی اور معیاری ہیں۔ ان میں 'جگن ناتھ آزاد کی تنقید نگاری' گہرائی و گیرائی لیے ہوئے ہے۔ تحریر عالمانہ ہے۔ 'سائنس'، 'انفارمیشن ٹیکنالوجی......کی حیرت انگیزیاں' اور ویسے ہی 'کمپیوٹر' میں 'ریڈیو اور ویڈیو ان میدانوں سے وابستہ لوگوں اور طلبہ کے لیے یکساں طور پر افادیت رکھتے ہیں۔ 'کتابوں کی دنیا' میں کوئی دس کتابوں پر تبصرے دیے گئے ہیں۔ اخیر میں 'خبرنامہ' ہے۔

✡ مصطفی ندیم خاں غوری: بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

✍ 'اردو دنیا' جنوری 2020 کا شمارہ بروقت وصول ہوا۔ میں NCPUL اور ماہنامہ 'اردو دنیا' کے ناظم اور ان کے رفقاء کار کو نئے سال کی مبارک باد دیتا ہوں، اللہ کرے کہ 2020 کا سال پرامن گزرے۔ مدیر صاحب نے ہماری بات میں اپنے قارئین کو نیا سال یومِ جمہوریہ کی مبارکباد دی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں 2020 کا ہر ایک پل ترقی کی کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ دو روزہ قومی سیمینار کی رپورٹ عبدالرشید اعظمی نے تفصیل سے لکھی ہے۔ داراشکوہ حیات و خدمات پر فکر انگیز مقالے پڑھے گئے۔ سیمینار میں موضوع سے متعلق نئے حقائق و نکات سامعین تک پہنچے۔ مظفر حسین سید نے اختر الایمان کی شاعری میں وقت کا حوالہ دیا ہے۔ سید یحییٰ نشیط نے علامہ شبلی کی شعری کائنات در سیاقی تناظر میں ایک عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔ محمد جمیل اختر جلیلی ندوی نے بغیر نقطہ والی کتاب کے تعارف پیش کیے ہیں۔ 21 ویں صدی میں غیر منقوط نثر و نظم لکھنے والے عنقا ہیں۔ محمد سہیل انور نے کلیم الدین احمد کا نظریہ نقد صنف غزل اور ترقی پسند مصنفین کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ اس میں کلیم الدین احمد کے تنقیدی نظریات سے بحث ملتی ہے۔ غزل پر کئی نقادوں نے اعتراض کیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے بھی کہا کہ غزل نیم وحشی صنف سخن ہے۔ عظمت اللہ خاں نے کہا غزل قابل گردن زدنی ہے۔ حالی نے غزل پر تنقید کی ہے ایسے بیانات پر ایک ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ دیگر مشمولات فکر انگیز اور ادبی و تنقیدی اور تحقیقی بصیرت کے حامل ہیں۔ 'اردو دنیا' کے شمارے موضوع سے متعلق نئے و جدید مواد کے لیے شہرت رکھتے ہیں اور بڑی محنت سے عرق ریزی کے بعد معیاری شمارے شائع ہو رہے ہیں اور ماحول میں اس کی خریداری ناگزیر ہے۔

✿ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

✍ اردو دنیا کے دسمبر کے اداریے میں مدیر صاحب نے اردو زبان کی بابت معدودے چند تلخ و شیریں باتیں و تجاویز پیش کی ہیں۔ شمارے کے تمام تر مشمولات معیاری ہیں اور مزید اس کے سرورق پر بھی ہر ایک مختلف الجہات شخصیت کی خوبصورت تصویر دیدنی ہے۔ 'آپ کی بات' کے آغاز میں آپ نے نہایت موزوں تجاویز اور غیر جانبدار خیالات کا اظہار کرنے والا جناب زبیر احمد بھاگلپوری کا ایک خط شائع کیا ہے۔ تیسرے نمبر پر بھی مصطفیٰ ندیم خان غوری کا بھی خط آپ کے حسنِ انتخاب کا آئینہ ہے۔ اس میں علامہ اقبال کے ایک شہرۂ آفاق شعر کے غلط مفہوم کو دیکھ کر از حد افسوس اور دکھ ہوا ہے۔ اسی سال ممبئی سے شائع جریدہ 'شاعر' میں اول نمبر پر ڈاکٹر صادق کا مضمون زیر عنوان 'بال جبریل' کے سرنامے کا شعر' شائع ہوا ہے۔ یہ شعر مجموعے کے سر فہرست درج ہے۔ اس مضمون میں متذکرہ بالا شعر کی مفصل تاریخ رقم کی گئی ہے۔ اس شعر کے محرک سنسکرت زبان کے بلند پایہ مہا کوی بھرتری ہری کی سطور بھی درج کی گئی ہیں۔ بھرتری ہری کی سطور کی بنا پر تا حال چھپی متعدد کتب کا مثبت حوالہ دیتے ہوئے اقبال کے شعر ''پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر'' کی خوبصورت تشریح دیدنی اور قابلِ غور و خوض ہے۔ جہاں آل احمد سرور اور ان کے عالم و فاضل شاگرد نواب زادہ راحت سعید خاں چھتاری میں اختلاف تفہیم کا ذکر ہوا ہے، وہاں آل احمد سرور تو شعر کے اول مصرعے کا استفہامیہ (سوالیہ) مفہوم درج کرتے تھے، یعنی کیا پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹا جا سکتا ہے ؟ دوسری تشریح کے بموجب استفہامیہ انداز کی بجائے ایک سادہ بیان کی صورت میں ہی دیکھنا چاہیے۔

جب علامہ اقبال سے اس بارے میں وضاحت کے لیے استفسار کیا گیا، تب ان کا جواب تھا، کہ آنے والے وقت میں کسی تیسرے مطلب کے اخذ کیے جانے کی بھی گنجائش ہے۔ اس ناچیز کی دانست میں اس شہرۂ آفاق شعر کا طنزیہ مفہوم یہ ہے'' کہ اگرچہ گل کے برگ سے ہیرے کو کاٹنا ممکن بھی ہو (جو کہ دراصل ناممکن ہی ہے)، تاہم ایک نادان یعنی احمق مرد پر تو نرم و نازک کلام کا اثر ہونا یکسر ناممکن ہی ہوا کرتا ہے۔

اس خط میں 'حب الوطنی' جیسے غلط رائج ہو چکے املا 'حب الوطنی' کا تصرف بھی متنازع فیہ ہے۔ اس خط سے قبل محمد علیم صاحب نے پاکستان میں ناول نگار اختر رضا سلیمی اور ان کی ٹیم کے نئے سوفٹ ویئر کے تیار کرنے کے ساتھ ہی این سی پی یو ایل ادارے کو ہی ایسا نیا سوفٹ ویئر تیار کرنے کا مفید مشورہ دیا ہے۔ اگر ممکن ہو تو ادارے کو اس مشورے پر جلد از جلد عمل پیرا ضرور ہونا چاہیے۔ اسی طرح اردو ادب میں 'حرف کار' کی مانند کونسل بھی لاکھوں روپے کی لاگت والا کوئی پراجیکٹ شروع کروا سکتی ہے۔

✿ **ڈاکٹر کرشن بھاوک**: کوٹھی نمبر A-201، گورو نانک نگر گلی نمبر K-18-A-201، پٹیالہ (پنجاب)

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: ➢ editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

اردو زبان کی تدریس میں مبادلہ تدریس کا استعمال

آفاق ندیم خان

تعارف:

زبان ترسیل خیالات کا اہم وسیلہ ہے۔ زبان ہی کے وسیلے سے انسان گرد و پیش کے ٹھوس حقائق کو تصوراتی پیکر میں ڈھالتا ہے اور تخیلات کی دنیا آباد کرتا ہے۔ زبان کے ہی ذریعے تجزیاتی فکر کی داغ بیل پڑتی ہے اور تخلیقی فکر کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ زبان ذہنی ترقی کا ایک نہایت لطیف اور مؤثر ذریعہ ہے۔ زبان کی تدریس کا بنیادی مقصد زبان کی چاروں بنیادی مہارتوں (سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا) کا فروغ کرنا ہے۔ چونکہ سننے اور بولنے کی مہارت تو انسان ماحول سے سیکھ سکتا ہے لیکن اچھا بولنے اور اچھی سماعت کے لیے بھی پڑھنا سیکھنا ضروری ہے۔ مزید یہ کہ لکھنا سیکھنے کے لیے پڑھنا سیکھنا ضروری ہے۔ اس لیے زبان کی مہارتوں کی تدریس میں پڑھنا سکھانا بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔

پڑھنا یعنی مطالعہ سے مراد لفظوں کو دیکھنا، پہچاننا اور بولنا ہے۔ اس ضمن میں قدرت کی عطا کردہ تین نعمتیں دیکھنا، بولنا اور سننا ایک ساتھ کام کرتی ہیں۔ پڑھنے کا عمل دراصل چھپی ہوئی یا لکھی ہوئی علامتوں اور ان کی آوازوں میں تعلق پیدا کرنا ہے۔ لیکن یہ عمل پڑھنے کا صرف مشینی پہلو ہے۔ پڑھنے کا کام اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک اس میں ذہنی افعال شامل نہ ہوں۔ تفہیم کے بغیر پڑھنے کا عمل بے معنی تصور کیا جاتا ہے۔ صحیح معنوں میں مطالعہ سے مراد کسی بھی موضوع پر آزادانہ طور پر پڑھنا اور علم حاصل کرنا ہے۔ پڑھنا علم حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ پڑھنے سے ذہن کو فکر اور بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ اخلاق، شائستگی، تلاش و تحقیق کا بھی تعلق پڑھنے سے ہی ہے۔ تعلیم کا اولین مقصد مطالعہ کی عادت ڈالنا ہے۔ کتابوں سے بڑا کوئی معلم نہیں ہوتا۔ عمدہ اور اعلیٰ معیار کی کتابیں زندگی کے اعلیٰ مفہوم کی وضاحت کرتی ہیں۔ انفرادی زندگی کی ترقی میں بھی مطالعے کی بڑی اہمیت ہے۔ دنیا بھر کے واقعات کا علم بھی ہمیں مطالعے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

مطالعے کی اہمیت کے پیش نظر زبان کے استاد پر فرض ہے کہ وہ اپنے شاگردوں میں صحیح اور فکر انگیز مطالعے کی عادت پیدا کریں۔ خاص طور پر ابتدائی جماعت کے بچوں کو سب سے پہلے اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ پڑھنا سیکھیں اور بعد میں حصول علم کے لیے مطالعہ کریں۔ مطالعے میں رہنمائی کی بڑی اہمیت ہے۔ لہٰذا معلم کو چاہیے کہ وہ مطالعے کے مشینی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں کو مطالعے میں رہنمائی کریں اور ان کے علم کو فروغ دینے میں معاون و مددگار رہیں۔

تفہیم کے ساتھ مطالعہ نہ کر پانا اکثر طلبا کے لیے ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ اکثر طلبا رفتار کے ساتھ مواد متن پڑھ تو لیتے ہیں لیکن اسے سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ اگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طلبا اچھی رفتار سے مواد متن پڑھ تو لیتے ہیں لیکن انھوں نے جو پڑھا ہے اسے یاد نہیں رکھ پاتے، مواد متن کے تئیں عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں، مواد متن میں فراہم کی گئی معلومات کی تفہیم میں دشواری محسوس کرتے ہیں، دقیق اور مشکل الفاظ کے معنی سمجھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں، مواد متن پر مشتمل سوالات کے جوابات دینے کے اہل نہیں ہوتے، مواد متن کے بنیادی تصورات اور ذیلی تصورات میں تفریق نہیں کر پاتے، پڑھنے کے بعد وقوفی، تاثراتی یا نفسی وحرکی طور پر کوئی تبدیلی محسوس نہیں کر پاتے، تو ان تمام مسائل کو حل کرنے کے لیے تفہیمی مطالعے کی چار حکمت عملیوں (پیش گوئی کرنا، سوال کرنا، وضاحت کرنا۔ خلاصہ کرنا) کی تربیت فراہم کر کے درج بالا تمام مسائل کو حل کر کے طلبا کے تفہیمی مطالعے کی اہلیت کا فروغ کیا جا سکتا ہے۔ تفہیمی مطالعے کی اہلیت کا فروغ کرنے والی اس تکنیک کا نام مبادلہ تدریس ہے جو دراصل مطالعے کی چار حکمت عملیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

مبادلہ تدریس کا تصور:

مبادلہ تدریس ایک تعمیری طریقہ تدریس ہے جو تعمیری آموزشی نظریات پر مبنی ہے۔ Jhon Dewey اور Jean Piaget نے طفولیت میں نشو و نما اور تعلیم پر تحقیق کے ذریعے یہ واضح کیا کہ رسمی طریقہ تدریس کے مقابلے غیر رسمی طریقہ تدریس سے آموزش زیادہ موثر ہوتی ہے۔ ڈیوی اور پیاجے دونوں ہی غیر رسمی تدریس سے زیادہ متاثر تھے۔ ڈیوی کا خیال تھا کہ موثر تعلیم وہ ہے جس میں حد سے زیادہ تجربات شامل ہوں اور جس کے ذریعے طلبا کی غور و فکر کی صلاحیتوں میں نکھار آئے۔ Piaget کا تعمیریت کے متعلق نظریہ تھا کہ بچے اپنے علم میں تجربات کے ذریعے اضافہ کر کے ہی سیکھتے ہیں جو کہ نئے علم کی تخلیق کرتا ہے۔ شیر خوارگی کے زمانے سے پختگی تک سیکھنے کا یہی فطری عمل ہے۔ بچے سادہ سلیٹ نہیں ہیں، انھیں اس وقت تک علم فراہم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ان کے موجودہ ادراک سے نئے علم کا انہماک یا اشتراک نہ کرایا جائے۔ بچے اس وقت زیادہ سیکھتے ہیں جب انھیں چیزوں کے تجربے کی بنیاد پر ذاتی تفہیم کا موقع فراہم کرایا جائے۔

تعمیریت پسند طریقہ تدریس اس بات پر یقین کرتا ہے کہ آموزش اس وقت زیادہ ہوتی ہے جب طالب علم آموزشی عمل میں سرگرم ہو کر شامل ہوتا ہے۔ مبادلہ تدریس کی بنیاد تعمیریت کے اسی فلسفہ پر مبنی ہے۔ اس کے مطابق طالب علم مفہوم اور معلومات کا کارساز ہوتا ہے۔ تعمیری تدریس تنقیدی فکر کو بالیدگی عطا کرتی ہے اور متحرک و خود

مختار (Independent) طلبا کی نشو ونما کرتی ہے۔اس طریقہ تدریس کا بنیادی مقصد طلبا کو یہ سکھانا ہے کہ سیکھا کیسے جاتا ہے۔تعمیری نظریات کے مقلدین کی تجویز ہے کہ آموزش زیادہ موثر اس وقت ہوتی ہے جب طالب علم آموزشی عمل میں سرگرم ہو کر شرکت کرتا ہے۔اس طرح کے تدریسی طریقے میں معلم اپنے طلبا کو سوالات اور سرگرمیوں کے ذریعے مشغول (Engage) کرتا ہے، انھیں خود تحقیق اور خود تفتیش (Explore) کے مواقع فراہم کرتا ہے، وضاحت (Explain) کی جانب گامزن کرتا ہے، روزمرہ زندگی سے متعلق مثالوں کے ذریعے تفصیل سے بیان (Elaborate) کرنے میں ان کی مدد کرتا ہے اور ایسے مواقع فراہم کرتا ہے جس سے کہ طلبا خود اپنا تعین قدر (Evaluation) کرتے ہیں۔بہترین تعمیری طریقہ اسے تسلیم کیا جاتا ہے جہاں سبھی سرگرمیاں حتیٰ کہ تعین قدر بھی طلبا اپنا خود کرتے ہیں اور معلم صرف سہل کار کے طور پر تدریسی واکتسابی عمل میں طلبا کو سہولت فراہم کرتا ہے۔

مبادلہ تدریس کا طریقہ کار:

مبادلہ تدریس ایک ایسا تدریسی عمل ہے جس میں معلم اور طالب علم کے مابین کسی متن کے مفہوم کو اخذ کرنے کے مقصد سے بات چیت ہوتی ہے۔مبادلہ تدریس ایک قسم کے مطالعے کی تکنیک ہے جو طلبا کے تفہیمی مطالعے کی صلاحیت کا فروغ کرتی ہے۔صحیح معنوں میں یہ تفہیمی عبارت خوانی اور مطالعہ کی ایک تکنیک ہے۔اس کی ابتدا امریکہ کے Michigan University کے Palincsar and Brown نے 1986 میں کی تھی۔ان کے مطابق مبادلہ تدریس کا مقصد متن کے مفہوم کو اخذ کرنے میں معلم اور طلبا کے مابین اور طلبا کی آپسی گروہی کوششوں کو سہولت فراہم کرنا ہے۔مبادلہ تدریس استاد کی نگرانی میں اور چھوٹے گروہوں کے اشتراکی اکتساب میں بہت موثر ہوتی ہے۔تدریس کی مبادلہ طرز رسائی طلبا کو مطالعے سے متعلق چار مخصوص لائحہ عمل کی تربیت فراہم کرتی ہے جو متحرک اور باشعور تفہیم کے لیے معاون اور مددگار ہوتی ہے۔یہ چار لائحہ عمل درج ذیل ہیں۔

1. **پیشن گوئی کرنا** (Predicting): مطالعے کے اس مرحلے میں طلبا مواد مضمون کا عنوان، مصنف کا نام، سرخی، تصاویر، جدول وغیرہ کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ دیے گئے متن کے آئندہ پیراگراف یا آئندہ صفحات میں کیا آنے والا ہے؟ متن کا مرکزی خیال، موضوع اور ذیلی موضوع کیا ہوسکتا ہے؟ مصنف کا مقصد معلومات فراہم کرنا، تفریح فراہم کرنا یا اپنی بات سے قائل کرنا ہے؟ اس مرحلے پر طلبا متن کے ضمن میں اپنی سابقہ معلومات کی بنیاد پر پیشن گوئی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔آخر میں حقیقی معنوں میں آئندہ مواد کا مطالعہ کرکے اپنے قائم کیے گئے مفروضات کی جانچ کرتے ہیں۔

2. **وضاحت کرنا** (Clarifying): انسان ایک توضیح طلب مخلوق ہے۔وہ ہر چیز کی وضاحت چاہتا ہے۔اس لائحہ عمل میں طلبا کی اسی خصلت کی نشو ونما کی جاتی ہے۔طلبا کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ مطالعہ کرنے کے بعد اس قابل ہوجائیں کہ متن کی وضاحت اپنے لفظوں میں کر سکیں۔اس کے لیے طلبا کو توجہ کے ساتھ متن پڑھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ضرورت پڑنے پر اسے دوبارہ متن پڑھنے کو کہا جاتا ہے اور نہ سمجھ میں آنے والے الفاظ کے معنی دریافت کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔طلبا کو مواد متن کی ذہنی تصویر بنانے کی تربیت فراہم کی جاتی ہے۔وہ مواد متن کو شروع سے آخر تک سلسلہ وار تصاویر میں سوچتا ہے اور اس کا ذہنی خاکہ اپنے دماغ میں بناتا ہے۔آخر میں پڑھے گئے متن کی وضاحت اپنے لفظوں میں بیان کرتا ہے۔

3. **سوالات کرنا** (Questioning): سوالات پوچھنا انسان کی جبلت میں شامل ہے۔اس لائحہ عمل میں طلبا کو مواد متن سے سوالات اخذ کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔جب طالب علم مواد متن سے کون؟، کیا؟، کیوں؟، کہاں؟، کب؟، کیسے؟، ایسا کیسے؟، ایسا کیوں؟ سوالات کو ذہن میں ملحوظ رکھتے ہوئے متن کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ کلیدی الفاظ اور معلومات پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔اس سے اس کی تفہیم میں اضافہ ہوتا ہے۔آسان لفظوں میں اس لائحہ عمل میں طلبا کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ دیے گئے متن سے کتنے سوالات نکال سکتا ہے۔

4. **خلاصہ کرنا** (Summarizing): اس لائحہ عمل میں طلبا متن کو پڑھتے وقت یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ متن کس بارے میں ہے؟ اس سے کیا سیکھ ملتی ہے؟ متن میں انھیں کون سی بات پسند آئی؟ متن کی شروعات، درمیان اور آخر میں کیا بات کہی گئی ہے؟ یہ متن کہاں سے ماخوذ ہے؟ اگر یہ متن کہانی ہے تو یہ کہاں کی کہانی ہے؟ اس کے اہم کردار کون کون سے ہیں؟ اس متن کا مرکزی خیال کیا ہے؟ وغیرہ۔ان سوالات کے جوابات تلاش کرکے طلبا پورے متن کا خلاصہ بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مبادلہ تدریس کے اقدامات:

i. طلبا کے گروپ تشکیل دینا: مبادلہ تدریس کا سب سے پہلا قدم چار چار طلبا پر مشتمل طلبا کے گروپ کی تشکیل دینا ہے۔اس کے لیے معلم کو چاہیے طلبا کے انفرادی تفاوت کا لحاظ کیے بغیر اتفاقی (Random) طور پر کمرہ جماعت سے چار چار طلبا کا گروپ بنائیں۔گروپ بنانے کا طریقہ ایسا ہونا چاہیے کہ ہر ایک طالب علم کو کسی بھی گروپ میں شامل ہونے کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔

ii. گروپ کے طلبا کا کردار متعین کرنا: چونکہ مبادلہ تدریس کا مقصد طلبا میں پیش گوئی، وضاحت، سوال کرنے اور خلاصہ کرنے کی صلاحیت کا فروغ کرنا ہے اس لیے گروپ کی تشکیل ہوجانے کے بعد معلم کے ذریعے گروپ کے ہر ایک طالب علم کو ایک نوٹ کارڈ دیا جاتا ہے جس پر ان کا کردار لکھا ہوتا ہے۔جیسے: پیش گوئی کرنے والا (Predictor)، وضاحت کرنے والا (Clarifier)، سوال کرنے والا (Questioner) اور خلاصہ کرنے والا (Summarizer)۔

iii. کردار ادا کرنے کے لیے ضروری ہدایات دینا: ہر ایک طالب علم کو اپنے کارڈ پر لکھے کردار کے مطابق کردار ادا کرنے کے لیے ہدایات دی جاتی ہیں۔اس کے لیے معلم کو چاہیے کہ وہ نمونے کے طور پر مواد متن کے ایک پیراگراف کو پڑھیں اور اس کی بنیاد پر پیش گوئی، وضاحت، سوال اور خلاصہ کرنے کا عملی مظاہرہ طلبا کے سامنے پیش کریں۔ایسا کرنے سے طلبا بڑی آسانی سے اپنے کردار کو سمجھ جائیں گے۔

iv. طلبا کو متعین مواد پڑھنے کے لیے دینا: جب طلبا اپنے کردار کو سمجھ جائیں تو انھیں مواد متن کا متعین حصہ پڑھنے کے لیے دیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر پورا سبق، سبق کا حصہ یا چند پیراگراف طلبا کو پڑھنے کے لیے دیا جاتا ہے۔

v. مواد کا مطالعہ کرنے کے لیے وقت متعین کرنا: جتنا مواد متن پڑھنے کے لیے دیا گیا ہے اسی کے مطابق معلم اپنی صوابدید سے مطالعہ کے لیے وقت متعین کرتے ہیں۔عام طور پر اس لیے 10 سے 15 منٹ کا وقت مناسب سمجھا جاتا ہے۔اگر مواد متن طویل اور مشکل ہے تو اس سے زیادہ وقت بھی دیا جاسکتا ہے۔

vi. طلبا کو ہدایت دینا کہ وہ اپنے کردار کو ملحوظ رکھتے ہوئے مطالعہ شروع کریں: سبھی گروپ علیحدہ علیحدہ بیٹھ کر اپنے گروپ کے ساتھیوں کے ساتھ مواد متن کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔چونکہ گروپ کے ہر ایک طالب علم کا کردار الگ الگ ہے اس لیے وہ اپنے اپنے کردار کو ملحوظ رکھتے ہوئے مطالعہ کرتے ہیں۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ طلبا اپنے گروپ کے ساتھیوں کے ساتھ آپسی تعامل اور ایک دوسرے کی معاونت کرسکتے ہیں۔

vii. دوران مطالعہ ہدایات دینا: جب طلبا مطالعہ میں مشغول ہوتے ہیں اس وقت معلم کمرہ جماعت میں گھوم گھوم کر طلبا کے ہر ایک گروپ کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اگر کسی گروپ یا طالب علم کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو معلم اسے انفرادی ہدایات اور مدد فراہم کرتے ہیں۔ جیسے: طلبا کو یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ مطالعہ کے دوران کلیدی الفاظ، مخصوص معلومات اور پیچیدہ الفاظ کو خط کشیدہ کر سکتے یا علامات اور نشانات بنا سکتے ہیں۔

viii. مطالعہ کا ماخوذ کمرہ جماعت میں پیش کرنا: مطالعہ کے لیے متعین وقت گزر جانے کے بعد ہر ایک گروپ کو باری باری یہ موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنا ماخوذ کمرہ جماعت کے دیگر طلبا کے سامنے پیش کریں۔ گروپ کے ہر ایک طالب علم اپنے اپنے کردار کے مطابق اپنا ماخوذ پیش کرتے ہیں۔ جیسے؛ پیش گوئی کرنے والا مواد مضمون میں آنے والی معلومات یا اس کے اگلے حصے میں کیا آنے والا ہے، اس سے متعلق پیش گوئی کرتا ہے۔ وضاحت کرنے والا دقیق الفاظ، پیچیدہ عبارت اور غیر واضح معلومات کی وضاحت پیش کرتا ہے۔ سوال پوچھنے والا تمہید، تفہیم اور تعین قدر پر مبنی سوالات پوچھتا ہے۔ خلاصہ کرنے والا مواد مضمون کا مرکزی خیال اور اس کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔ ایک گروپ کی پیش کش مکمل ہو جانے کے بعد دوسرے گروپ کو اپنا ماخوذ پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

ix. معلم کی وضاحت: استاد یا معلم صرف ایک سہل کار کے طور پر کام کرتا ہے اور طلبا میں مندرجہ بالا چاروں مہارتوں کا فروغ کرتا ہے۔ متعینہ مواد کا مطالعہ مکمل ہو جانے کے بعد کرداروں کو بتدریج بدل دیا جاتا ہے اور اگلے دن یا اگلی نشست میں اسی طرح مواد مضمون کے آئندہ حصے کا مطالعہ شروع کیا جاتا ہے۔

تدریسی ماحصل

اس طرح کی تدریس کا ماحصل یہ ہے کہ طلبا رفتہ رفتہ پیش گوئی کرنے، وضاحت کرنے، سوالات کی تعمیر کرنے اور مواد متن کا خلاصہ کرنے میں ماہر ہو جاتے ہیں اور آئندہ زندگی میں خود مختار طالب علم بن کر اپنی منزل کے شہسوار بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ مبادلہ تدریس سے طلبا میں درج ذیل تبدیلیاں رونماں ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔

* مقصد مطالعہ سے باخبر ہونا۔
* مواد مضمون کا تعارفی اور عمیق جائزہ لینا۔
* مواد مضمون کا مفہوم اخذ کرنا اور نئے الفاظ کے معنی کا قیاس لگانا۔
* جدید تصورات، نظریات اور اصولوں کی تفہیم کرنا۔
* خصوصی معلومات حاصل کرنا اور اپنے نظریات کو وسعت دینا۔
* مصنف کے نقطۂ نظر کو دریافت کرنا اور اپنے نقطۂ نظر کے لیے ثبوت تلاش کرنا۔
* ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنا اور نئے الفاظ کے معنی اور ان کا جملوں میں استعمال سیکھنا۔
* نئے الفاظ اور محاورات کا مفہوم ذہن نشین کرنا۔
* قوت متخیلہ کی نشو ونما کرنا اور جذبہ استحسان پیدا کرنا۔
* آئندہ عبارتوں میں کیا آنے والا ہے اس کا اندازہ لگانا اور یہ فیصلہ کرنا ہے کہ مزید پڑھنا ہے یا نہیں۔
* مصنف کی حقیقی منشاء کو دریافت کرنا۔ وغیرہ۔

خلاصہ کلام

ہمارے اکثر و بیشتر اسکولوں میں اردو زبان کی تدریس کے روایتی طریقے رائج ہیں۔ یہاں پر روایتی تدریس کا مطلب عام طور پر ہمارے کمرہ جماعتوں میں استعمال ہونے والے تدریس کے طریقوں سے ہے۔ یہ طریقہ تدریس عام طور پر سوال و جواب مع خطاب پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس طرح کی تدریس ہربرٹ کے ذریعے بتائے گئے پانچ مراحل (تیاری/ تمہید، پیش کش، موازنہ، تعمیم اور اطلاق) پر محیط ہوتی ہے۔ اس طرح کی تدریس میں معلم اپنی تدریس کی شروعات تمہیدی گفتگو سے کرتے ہیں تدریس کیے جانے والے سبق کا اعلان کرتے ہیں۔ سبق کے اعلان کے بعد رسمی طور پر تدریس کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس میں معلم کی مثالی بلند خوانی، طلبا کی بلند خوانی، اخذ معنی، تفہیمی سوالات، تختہ سیاہ پر الفاظ معنی اور تفہیمی سوالات کے مکمل جوابات لکھنا، کمرہ جماعت کا کام دینا، تشریح و وضاحت کرنا، اعادہ کرنا، تعین قدر کرنا اور گھر کا کام دینا شامل ہے۔ روایتی تدریس کا مقصد طلبا کو معلومات فراہم کرانا، سبق کے متن کی تفہیم کرانا اور سیکھے ہوئے علم کا اطلاق کرنا سکھانا ہے۔ اس طرح کی تدریس میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ کمرہ جماعت کے چند طلبا ہی تدریس و اکتساب کی سرگرمیوں میں متحرک ہو کر شامل ہوتے ہیں۔ کچھ گنے چنے طلبا ہی بار بار بلند خوانی کرتے ہیں، پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیتے ہیں اور نہ سمجھ میں نہ آنے والے عوامل پر معلم سے وضاحت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مجملہ طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ روایتی تدریس میں معلم زیادہ سرگرم ہوتے ہیں۔

چونکہ سیکھنا ایک سرگرم عمل ہے اور سیکھتا وہی ہے جو سیکھنے کے عمل میں سرگرم ہوتا ہے۔ اس لیے ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ تدریس و اکتساب کے عمل کو طلبا مرکوز کیا جائے اور طلبا کو ہی زیادہ سے زیادہ سرگرم رکھا جائے جس سے کہ وہ سیکھ سکیں۔ مبادلہ تدریس سیکھنے کے اسی اصول پر کام کرتی ہے۔ یہ تعمیریت پسند طریقہ تدریس کی ایک قسم ہے جو مکمل طور پر طلبا مرکوز ہے۔ تعمیریت پسند طریقہ تدریس اس بات پر یقین کرتا ہے کہ آموزش اس وقت زیادہ ہوتی ہے جب طالب علم آموزشی عمل میں سرگرم ہو کر شامل ہوتا ہے۔ جس کے ذریعے طلبا اپنے موجودہ ادراک سے نئے علم کا انہماک اور اشتراک کر کے اپنی تفہیم کا فروغ کرتے ہیں۔ موجودہ وقت میں تفہیم کے ساتھ مطالعہ نہ کر پانا اکثر طلبا کے لیے ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اور تفہیمی مطالعہ کا فروغ دینے کے لیے مبادلہ تدریس جو چار حکمت عملیوں (پیش گوئی کرنا، سوال کرنا، وضاحت کرنا۔ خلاصہ کرنا) پر مبنی ہے کی تربیت فراہم کر کے عبارت خوانی اور مطالعہ سے متعلق مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے طلبا کی تنقیدی فکر کو بالیدگی عطا کی جا سکتی ہے اور متحرک و خود مختار طلبا کی نشو ونما کی جا سکتی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد طلبا کو یہ سکھانا ہے کہ سیکھا کیسے جاتا ہے۔

اردو زبان میں مطالعے کی اہمیت کے پیش نظر اردو زبان کے معلم پر فرض ہے کہ وہ اپنے شاگردوں میں صحیح اور فکر انگیز مطالعے کی عادت پیدا کریں۔ معلم کو چاہیے کہ وہ مطالعہ کے مشینی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں کو مطالعہ میں رہنمائی کریں اور ان کے علم کو فروغ دینے میں معاون و مددگار بنیں۔ اس کے لیے مبادلہ تدریس صحیح معنوں ان کے لیے ایک بیش بہا نعمت ہے۔ اگر طلبا کو مبادلہ طریقہ تدریس کے ذریعے پڑھایا جائے تو رفتہ رفتہ وہ خلاصہ کرنے، سوال کرنے، وضاحت کرنے اور پیش گوئی کرنے کی مہارت سیکھ جاتے ہیں۔ چونکہ زبان ہی دیگر تمام علوم کو بنیاد فراہم کرتی ہے اس لیے یہ امید کی جاتی ہے کہ آئندہ ان کی تعلیمی حصولیابیوں میں بھی مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔

کتابیات:

1. نجم الحر، صابرہ سعید، تدریس اردو، پریمئر پبلشنگ ہاؤس، حیدر آباد، 2006
2. محی الدین قادری زور، تدریس اردو، یونیک بک میڈیا، سرینگر، 2006

■

Dr. Afaque Nadeem Khan
(Assistant Professor)
Maulana Azad National Urdu University
College of Teacher Education
Bhopal - 462001 (MP)

شریف حسین قاسمی

فارسی میں درباری شاعری

ایک مطالعہ

فارسی شاعری کا معتد بہ حصہ درباری شاعری پر مشتمل ہے۔ یہ درباری یا مدحیہ شاعری ہر صنف سخن البتہ بیشتر قصائد کی صنف وصورت میں فارسی ادب میں محفوظ ہے۔ مزید برآں فارسی شاعری کے قدیم ترین باقیات میں بھی اس نوعیت کے کلام کے نمونے شامل ہیں۔ الغرض فارسی ادب کی تاریخ میں اس کی شاندار، عظیم اور مسلسل روایت ہر لحاظ سے قابل قدر وتوجہ رہی ہے۔ اسی وجہ سے فارسی شاعری پر ہر کتاب میں یہ موضوع زیر بحث آیا ہے۔

پیش نظر تحریر کا مقصد اس نوعیت کی شاعری کی مکمل و مفصل تاریخ بیان کرنا اور اس کے محاسن و عیوب کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینا نہیں ہے۔ غرض صرف اتنی ہے کہ فارسی سماج میں اس قسم کی شاعری کے مقام ومرتبے اس کے اثرات، ممدوح و مادح کے تعلقات اور خود اس طور کی شاعری پر سماج کے ردعمل کو اجمالی طور پر بیان کر دیا جائے۔

فارسی شاعری کی تاریخ شاہد ہے کہ اس کا بادشاہوں اور ان کے درباروں سے وابستہ افراد کا اوائل ہی سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ فنون لطیفہ کے اس اہم پہلو کو دربار نے زندگی اور اعتبار بخشا ہے، اسے ایک نظم وضابطہ عطا کیا اور اس کی نشر واشاعت میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ فارسی دنیا کا شاید ہی کوئی فرمانروا خاندان ایسا ہوگا جس نے فارسی شاعری کی حتی المقدور اور کبھی مقدور سے بڑھ کر، سرپرستی نہ کی ہو۔ شعرا نے بھی اس شاہی سرپرستی سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور یک گونہ اطمینان اور یکسوئی سے شعر وشاعری کو چار چاند لگانے میں منہمک ہو گئے۔ دربار کی اس سرپرستی کا یہ نتیجہ نکلا کہ فارسی شاعری بڑی حد تک درباروں سے وابستہ ہوگئی اور شعرا درباروں کا ایک جزو لاینفک قرار پائے۔ نظامی عروضی سمرقندی نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف 'چہار مقالہ' میں شاہی دربار کے ان چار ارکان کا ذکر کیا ہے: دبیر، شاعر، طبیب اور منجم۔

یہ عرض کر دینا بے جا نہیں کہ سلاطین کی بارگاہ میں شاعر کو روشناس کرانے والا مخلص رودکی (م 329 / 940) ہے۔ فارسی میں قصیدہ نگاری جو شاہی دربار میں شاعر کی رسائی کا بدیہی نتیجہ رہی ہے، رودکی سے شروع ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے رودکی آدم الشعرا اور سلطان الشعرا مانا جاتا ہے۔

درباروں سے وابستہ شعرا خاص خاص موقعوں پر قصیدے لکھتے، ممدوح کی موجودگی میں پڑھتے یا کسی توسط سے اس کی خدمت میں پیش کرتے اور انعام واکرام سے نوازے جاتے تھے۔ یہ نوازشیں اور انعام واکرام کبھی کبھی اس حد تک وافر ہوتے تھے کہ آج اس پر یقین کرنے میں تذبذب اور تعجب ہوتا ہے۔ قصیدہ نگار شعرا کسی جشن جیسے عیدین، ملی، سماجی (نوروز) اور سرکاری اہمیت رکھنے والے مواقع پر، لشکرکشی اور فتح وکامیابی پر مبارکباد اور مدح میں قصائد کہتے تھے۔ اسی طرح کسی افسوسناک واقعے کے رونما ہونے پر مرثیے لکھتے، سقوط بغداد پر سعدی، شیرازی کا مرثیہ فارسی ادب میں ایک المیہ شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ عمارات کی تعمیر اور دیگر تاریخی اور سماجی نوعیت کے واقعات کی مناسبت سے تاریخی قطعے لکھتے۔ تاریخی نوعیت کے قصائد میں بیانات سب کے سب محض لفاظی نہیں ہوتی تھی۔ محمود غزنوی (حکومت: 998-1030) کے درباری شعرا عنصری اور فرخی کے تاریخی قصائد میں اکثر بیانات تاریخ سے حرف بہ حرف ملتے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر لحاظ سے قدرت مند فرمانرواؤں کے درباروں کی ظاہری شان وشوکت اور عظمت وشکوہ فارسی قصائد کے روپ سروپ میں جلوہ گر ہے۔

بڑی تعداد میں ایسے قصائد بھی نظر آتے ہیں جو مذہبی نوعیت کے ہیں۔ حمد باری تعالی، نعت پیغمبر صلعم اور منقبت میں سب شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ یہ خود قصائد کا ایک قابل لحاظ حصہ ہیں۔ اس نوعیت کے قصائد کسی کی فرمائش پر نہیں کہے جاتے تھے بلکہ یہ شاعر کے اپنے مذہبی وعقیدتی عقیدتی میلان طبع کا سرجوش ہیں۔

خود مرثیے کا منقبتی شاعری کے زیر عنوان مطالعہ کیا جانا مناسب ہے۔ پندونصائح سے لبریز قصیدے بھی موجود ہیں۔

قصائد میں استعمال ہونے والی تعبیرات، زبان و الفاظ کی دلکشی، باشکوہ الفاظ کا استعمال وغیرہ ایسی خصوصیات ہیں، جو مدحیہ شاعری کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ قصائد میں شعرا نے جو ایک خاص پرتکلف، مبالغہ آمیز اور تعبیری انداز اپنایا، اس کی وجہ سے قصیدے سے زیادہ کوئی دوسری صنف سخن اس رویے کی مشکل ہی سے متحمل ہوسکتی ہے۔ فی الحقیقت مبالغے کا اگر لطف لینا ہو تو قصیدوں میں اس کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھیے۔

بعض قصیدے خطابیہ کہلائے جاتے ہیں یعنی شاعر بغیر کسی تمہید کے سیدھے مدح وستائش سے قصیدہ شروع کرتا ہے، لیکن عام طور پر قصائد ایک تمہید، تشبیب یا نسیب سے شروع کیے جاتے ہیں اور ایسے قصائد کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اس تمہید میں مختلف قدرتی مناظر، بہار و خزاں، صبح وشام کے مناظر، ابرو باد کا ذکر، گوناگوں اشیا، معشوقوں کے سراپا، وصال وفراق اور اسی نوعیت کے دیگر موضوعات نظم کیے جاتے ہیں۔ قصیدے کے اس ابتدائی حصے میں غنائی پہلو نہایت مستحکم اور موثر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض ناقدین سخن نے اس حصے کو غزل کا ابتدائی نقش کہہ دیا ہے۔ یہاں شاعر کو موضوع کے انتخاب میں کافی آزادی ہوتی ہے، وہ اپنے ہنر کی خاطر خواہ داد دے سکتا ہے اور قصیدے کو فکر، خیال اور موضوع کی اس یکسانیت سے نجات حاصل ہوجاتی ہے جو محض مدح کی وجہ سے اس صنف میں در آجایا کرتی ہے۔

یہ امر بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ درباری شاعری (ممدوح کی تعریف وستائش) کے نمونے قصیدے کے سوا دیگر اصناف سخن میں بھی گاہ گاہے نظر آتے ہیں۔ ایسی مثنویاں جو درباروں یا کسی وزیر و امیر کی خواہش پر نظم کی گئی ہوں، ان کے آغاز میں ممدوح کی تعریف وتوصیف کی جاتی ہے۔ امیر خسرو دہلوی اور حافظ کی چند غزلیات میں بھی درباری شاعری کی فضا برقرار ہے۔ اس نوعیت کا کلام فارسی شاعری کی تقریباً ہر صنف سخن میں موجود ہے، لیکن بہرحال قصیدہ ہی مدحیہ شاعری کے لیے مخصوص رہا ہے۔

قصائد کے صلے میں شعرا کو جس داد و دہش سے نوازا گیا، اس کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں، لیکن یہ بھی ایک دردناک حقیقت ہے کہ صاحب قدرت ممدوح کے مزاج کے خلاف خیال وتصور پر شاعر کو وحشت ناک سزاؤں کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ اسے قتل کردیا جاتا تھا، بینائی چھین لی جاتی، قید کردیا جاتا اور پھر شہر یا ملک بدر کردیا جاتا تھا۔ اس سے زیادہ تکلیف دہ صورت یہ ہوتی تھی کہ ایسے سزایاب شاعر سے اراکین و وابستگان دربار بھی دوری اختیار کرلیتے تھے، اسے نظرانداز کرتے تھے۔ وہ اپنوں میں بیگانہ ہوجاتا تھا، یہ سماجی بائیکاٹ ظاہر ہے موت سے بدتر تھا۔ میرزا محمد امین مخاطب بہ میر جملہ روح الامین شہرستانی، جہانگیر سے وابستہ تھے۔ دربار میں معتبر و محترم تھے۔ بادشاہ ان سے کسی بات پر ناراض ہوگیا۔ ارکان حکومت نے ان سے ملنا جلنا اور ان کے گھر آنا جانا ترک کردیا۔ میر جملہ یہ خاموشی سے برداشت نہیں کرسکے۔ انھوں نے اس شعر میں اپنے شدید ردعمل کا اظہار کیا اور خوب کیا:

کنارہ جوی از ین مشت استخوان شدہ اند
سگان این سر کو ہم مزاج دان شدہ اند[1]

[اس مٹھی بھر ہڈیوں سے کنارہ کرنے لگے، اس کوچے (جہاں ان کی رہائش مرجع خاص و عام تھی) کے سگ (ان کے ہاں روز کے آنے والے) بھی مزاج داں ہوگئے ہیں]

یہ بھی دلچسپ صورت حال رہی ہے کہ ایک دربار سے وابستہ شاعر اگر کسی دوسرے دربار یا اس سے وابستہ افراد کی مدح کرتا، تو اسے عام طور پر پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات اس پالا بدلنے والے کو اس عمل پر سزا بھگتنی پڑتی تھی۔ اس ضمن میں حکیم عارف ایچی کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ شاہزادہ سلیم (بعد میں جہانگیر) کے دربار میں بڑے مرتبے کے حامل تھے۔ انھوں نے جہانگیر کے ایک دوسرے عظیم المرتبت منصب دار میرزا عبدالرحیم خانخاناں (م 1063 / 1626) کی مدح میں ایک قطع کہا۔ شاہزادے کو ان کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ انھیں قلعۂ گوالیار میں قید کردیا گیا۔ حکیم عارف نے معذرت نامہ سلیم کی خدمت میں کسی کے توسط سے گزرانا، جس کا ایک شعر یہ ہے:

شہا، شہریارا! بہ خاک در تو
بجز مدح تو نیست در دفتر من

[شہزادے! تمھارے آستانے کی قسم، میری بیاض میں آپ کی مدح کے سوا کچھ اور نہیں]

یعنی عارف نے اسے بے بنیاد قرار دیا کہ انھوں نے خانخاناں کی مدح کی ہے اور انھیں معاف اور آزاد کردیا گیا۔[2]

مجمع الشعرای جہانگیر شاہی کا مصنف یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد کہتا ہے کہ: الحق بادشاہوں کو شعر وشاعری اور اپنی مدح وستائش سے اس قدر تعلق خاطر ہونا ہی چاہیے کہ اگر ان کا کوئی شاعر دوسرے کی مدح کرے، اس پر برا مانیں، اسے بادشاہوں کے غایت ادراک اور کمال فہم پر محمول کرنا چاہیے۔

اس کے برخلاف ایسا بھی ہوا ہے کہ عرفی شیرازی نے ایک ہی قصیدے میں اپنے دو سرپرستوں حکیم ابوالفتح گیلانی (م: 997 / 1588) اور عبدالرحیم خانخاناں (م: 1063 / 1626) کی مدح کی ہے اور کسی بھی عاقبت بد کا شکار نہیں ہوا۔

یہ پہلو بھی بڑا دلچسپ اور انوکھا ہے کہ بعض واقعات سے پتا چلتا ہے کہ شعرا کا اپنے سرپرستوں اور ممدوحین سے محض واجبی تعلق نہیں تھا۔ وہ ان کی تکالیف سے رنجیدہ خاطر ہوتے تھے اور یہی حال سرپرستوں کا تھا، انھیں بھی اپنے سے وابستہ شعرا و ادبا سے ایک انس پیدا ہوجاتا تھا۔ وہ ان کی دلجوئی کرتے تھے۔ ان کے مرنے جینے میں، فاصلے ہی سے سہی، شریک ہوتے تھے۔ اسی باہمی اور دوطرفہ رابطے اور وابستگی کا نتیجہ تھا کہ درباری شاعری، جب تک دربار کا وجود برقرار رہا، رائج رہی اور اس میں مبالغہ آمیز مدح وستائش کے خلاف ذہنی لے کے باوجود، پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جاتی رہی۔

شعرا کے اپنے ممدوحین سے انتہائی تعلق خاطر سے متعلق یہ واقعات توجہ کے لائق ہیں:

دوسرے مغل بادشاہ ہمایوں (م: 1555) کے ایک بلند پایہ امیر، میرویسی تھے۔ یہ شاعر بھی تھے۔ ایک بار ہمایوں کے دانت میں درد ہوا۔ اس نے (اس مقولے کے مطابق کہ: علاج دندان اخراج دندان) وہ دانت نکلوادیا۔ میرویسی اپنی جاگیر میں تھے۔ جب انھوں نے یہ خبر سنی تو اویس قرنی کی تقلید میں اپنے ولی نعمت کی طرح اپنا ایک صحت مند دانت نکلوادیا۔ ان کا یہ عمل ظاہر ہے بادشاہ کی نگاہ میں ان کی قدر ومنزلت میں اضافے کا باعث ہوا۔[3]

ایک اور افراطی اقدام کا ذکر کیا گیا ہے۔ سہراب بیگ ایران کے شاہ عباس ثانی (حکومت: 1642-1666) سے وابستہ تھے۔ اس بادشاہ کی رحلت پر سہراب بیگ نے فرط افسوس میں زہر کھالیا اور فوت ہوگیا۔[4]

میرزا محمد رضا مشہور بہ بیار جوینی، شاہ عباس ماضی (حکومت: 1588-1629) سے بہت قریب کا تعلق رکھتے تھے۔ بادشاہ نے خود ان کی شادی کرائی۔ شکریے کے طور پر رضا نے یہ مستزاد رباعی خدمت شاہ میں پیش کی۔ یہ منظومہ خود بادشاہ کی زندگی کے اہم پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور یہ ایسا ہی شخص کہہ سکتا تھا جو بادشاہ سے قریب تو ہو، لیکن اس کی صمیمیت اسے بادشاہ کے غیظ وغضب

سے محفوظ رکھ سکے۔

ای شاہ جہان، جہان بہ کامت بادا　　تا ھست جہان

دایم می خوشدلی بہ جامت بادا　　با مغ بچگان

از وصل بتی کامروایم کردی　　در آخر عمر

عمر ابد و عیش دوامت بادا　　با لالہ رخان[5]

دنیا کے بادشاہ! یہ دنیا جب تک قائم ہے، آپ کی آرزوؤں کے مطابق رہے۔

مسرت کی شراب ہمیشہ آپ کے جام میں رہے اور مغ بچوں کے ساتھ آپ اس کا لطف اٹھائیں۔

مجھے آپ نے آخر عمر میں ایک بت (بیوی) عنایت کردیا، میری زندگی کامیاب ہوگئی۔

آپ بھی لالہ رخوں کے جھرمٹ میں ساری عمر عیش وعشرت سے بسر کریں۔

قصائد کے مطالب کا ممدوح پر کوئی اثر بھی ہوتا تھا کہ نہیں، اس ضمن میں یہ واقعہ تقریباً ہر اس تذکرے میں مرقوم ہے جس میں رودکی کے احوال لکھے گئے ہیں۔ ابوعبداللہ جعفر بن محمد رودکی (م: 329 / 940) جواں سال بادشاہ نصر بن احمد امیر سامانی (حکومت: 892-864) کے دربار سے وابستہ تھا۔ یہ سامانی بادشاہ ہرات میں خیمہ زن تھا۔ یہاں کی آب و ہوا اسے اس قدر پسند آئی کہ چار سال ہوگئے۔ وہ اپنے پایہ تخت بخارا لوٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ہمراہی تنگ آگئے۔ وہ رودکی کے پاس آئے اور درخواست کی کہ کچھ ایسا عمل کرے کہ بادشاہ اپنے وطن لوٹ جائے۔ رودکی نے موقع ومحل دیکھ کر ساز کے ساتھ اپنا یہ قصیدہ پردۂ عشاق میں بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

بوی جوی مولیان آید ھمی　　بوی یار مہربان آید ھمی

ریگ آموی و درشتی ھای آن　　زیر پایم پرنیان آید ھمی

اور جب وہ اس بیت پر پہنچا

میر سرو است و بخارا بوستان　　سرو سوی بوستان آید ھمی

امیر نصر پر ایسا اثر ہوا کہ وہ تخت سے کھڑا ہوگیا اور بغیر جوتے پہنے رکاب میں پیر رکھا اور بخارا کا رخ کیا۔

ابوطالب کلیم (م: 1061 / 1651) شاہجہان کے دربار کا ملک الشعرا ہے، اس نے شعر و شاعری کے موثر ہونے کے بارے میں کہا ہے۔

در سنگِ خارا نیز اثر می کند سخن

کوہ از صدا همین سخن اظہار می کند

[بات سنگ خارا پر بھی اثر کرتی ہے، پہاڑ کے نزدیک زور سے بولیے، آواز گونجتی اور لوٹتی ہے، یہ اسی حقیقت کا ثبوت ہے۔

یہ چند ابیات، درج بالا معروضات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

رودکی نے نصر بن احمد سامانی کی سخاوت و دلیری کی مدح میں کہا۔

حاتم طایی تویی اندر سخا

رستم دستان تویی اندر نبرد

نی کہ حاتم نیست باوجود توراد

نی کہ رستم نیست در جنگ تو مرد[6]

عنصری سلطان محمود غزنوی کی ستائش میں کہتا ہے۔

دھان گشاد و میان بست و ایستاد فلک

بہ مدح و خدمت شاہ سپہ کش صفدر

سخاوت و سخن و طبع و رای او گویی

ز خاک و آب و زباد آمدند واز آذر[7]

آذری اصفہانی نے احمد شاہ بہمنی کی تعمیر کردہ عمارت 'دارالامارۂ' کی ستائش میں یہ اشعار کہے اور ساٹھ ہزار روپے انعام میں پائے۔

حبّذا قصر مشید کہ ز فرط عظمت

آسمان پایہ ای از سدۂ این درگاہ است

آسمان ھم نتوان گفت کہ ترک ادب است

قصر سلطان جہاں احمد بہمن شاہ است[8]

میر محمد باقر اشراق نے نعت پیغمبر صلعم میں کہا ہے۔

ای ختم رسل! دو کون پیرایۂ تست

افلاک یکی منبر نہ پایۂ تست

گر شخص ترا سایہ نباشد، چہ عجب

تو نوری و آفتاب در سایۂ تست

جمال الدین محمد بن حسام متخلص بہ حسام سلطان محمد شاہ بن تغلق شاہ کے لیے ایک قصیدے میں درازی عمر کی دعا کررہے ہیں۔

الٰہی تا جہان باشد، نگہدار این جہانبان را

محمد شاہ تغلق شاہ سلطان ابن سلطان را[9]

امیر خسرو دہلوی اس دنیا کی ناپائیداری، شاہی حشمت اور فرمانروائی سے متعلق طام جہام کے عارضی ہونے کی حقیقت یاد دلا رہے ہیں اور اس پر بھروسہ نہ کرنے اور اس کو اہمیت نہ دینے کی نصیحت کررہے ہیں۔

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش درد سر است

ہر کہ قانع شد بہ خشک و تر، شہ بحر و بر است

بہر این مردار چندت گاہ زاری گاہ زور

چون غلیواجی کہ شش مہ مادہ وشش نر است[10]

میرزا خنجر چغتائی ہمایوں بادشاہ کے امرا میں شامل تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی اپنے احوال میں کہی ہے۔ یہ اکبر کو پیش کی اور بادشاہ کی تعریف و تحسین کرنے کے بعد اسے نصیحت کی۔

گر ھمای پرید زین گلشن　　بر سر ما تو باش سایہ فگن

سخن من کہ بی ریا باشد　　گر نصیحت کنم روا باشد

شاہ باید کہ او گہ و بیگاہ　　از خود و خلق خود بود آگاہ[11]

یہ بھی ہوتا تھا کہ دربار میں انعام کا اعلان ہوگیا، اب خزانچی وہ انعام ادا نہیں کررہا، شعرا قصیدے یا قطعے میں بادشاہ سے اس صورت حال کی شکایت کرتے تھے۔ حاجی حیدری شاگرد تھے ملا لسانی کے۔ اس کے ساتھ یہی صورت حال پیش آئی۔ انھوں نے بادشاہ کے حضور میں شکایت کی۔

مشکلی دارم شہا! خواھم کنم پیش تو عرض

زانکہ زین مشکل مرا صد داغ حسرت بر دل است

سیم و زر انعام کردی لیک از خازن مرا

ھم گرفتن مشکل و ھم ناگرفتن مشکل است[12]

[بادشاہ سلامت! ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں جو خدمت میں عرض کرنی چاہتا ہوں، اس لیے کہ اس مشکل سے میرا دل داغدار ہے۔ آپ نے مجھے سونے چاندی سے نوازا، لیکن خزانچی سے یہ رقم حاصل کرنی میرے لیے مشکل ہوگئی ہے اور اگر یہ رقم نہ ملی تو دوسری مشکل یہ ہے کہ یہ حکم عدولی ہوگی]

حواشی

1. سفینۂ خوشگو، دفتر دوم: بندرابن داس خوشگو، بہ تصحیح دکتر سید کلیم اصغر، کتابخانہ، موزہ و مرکز اسناد مجلس شورای اسلامی، تہران 1389، ص 263
2. مجمع الشعرای جہانگیر شاہی: ملا قاطعی ھروی، بہ تصحیح دکتر محمد سلیم اختر، موسسہ تحقیقات علوم آسیای میانہ وغربی، دانشگاہ کراچی، پاکستان، ص 326
3. ایضاً، ص 326
4. سفینۂ خوشگو، دفتر دوم، ص 314
5. ایضاً، ص 305
6. لباب الالباب: محمد عوفی، بہ تصحیح ادوارد، جی، براؤن، انتشارات ھرمس، تہران، 1389، ص 387
7. ایضاً، ص 411
8. شمع انجمن: نواب صدیق حسن خان، بہ تصحیح دکتر محمد کاظم کہدوئی، مرکز انتشارات دانشگاہ ونیرد، 1386، ص 30
9. سفینۂ خوشگو، دفتر دوم، ص 201
10. ایضاً، ص 214
11. ایضاً، ص 213
12. ایضاً، ص 209

■

Shareef Husain Qasmi
D-23, H. Nizamuddin East
New Delhi - 110013

نقد و نگاہ

قرۃ العین حیدر

صدیق محی الدین

قرۃ العین حیدر اپنی خودنوشت سوانح 'کارِ جہاں دراز ہے' میں رقم طراز ہیں:

''سید جلال الدین غازی سید کمال الدین ترمذی کے صاحب زادے اس تذکرہ نویس فقیر حقیر پر تقصیر عاجزہ فدویہ کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ موصوف اس علاقے میں جا کر بسے جو بعد میں روہیل کھنڈ کہلایا۔ سید جلال الدین کے اخلاف میں سید اشرف گنج بخش، سید احمد، سید محمد، سید محمود اور سید حسن عسکری کا زمانہ پندرھویں صدی ہے۔ سید حسن عسکری کے صاحب زادے سید ضیاء الدین سرکار سنبھل میں چہار ہزاری تھے۔ ٹھاٹھ کرتے ہوں گے۔ موصوف کٹھیر راجپوتوں کو قابو رکھنے کے لیے نہٹور ضلع بجنور میں تعینات تھے۔ سید ضیاء الدین ترمذی کو ایک بغاوت فرو کرنے لیے مع لشکر پورپ بھیجا گیا۔ معرکے میں کام آئے اور جیا شہید کہلائے۔''[1]

وہ مزید لکھتی ہیں:

''اگر کمال الدین ترمذی کے جی میں یہ نہ سمائی ہوتی کہ ہندوستان چلیں تو ہم آج یہاں کاہے کو وکٹوریہ کی غلامی کر رہے ہوتے ترمذ میں اگر چنگیز کی تباہ کاری سے بچ گئے ہوتے تو اس وقت بیٹھے زار روس کی غلامی کر رہے ہوتے آج اپنے پوتوں کو لندن بھیج کر بیرسٹری پڑھانے کے خواب نہ دیکھتے۔ ترمذ یا بخارا سے سینٹ پیٹرز برگ روسی پڑھنے کے لیے بھیجنے کے منصوبے بناتے .... والد مرحوم کو کیا معلوم تھا کہ اُن کی اولاد پر کیا گزرے گی۔ نہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے پوتے کس قسم کی دنیا کا مقابلہ کریں گے۔ والد مرحوم نے نہٹور میں جھیل کے کنارے ایک پلکھن بوئی تھی جو اب چھتنار ہے۔ دوسری پلکھن کا پودا ہم نے لگایا تھا۔ دونوں چھوٹی بڑی پلکھن کہلاتی ہیں جب یہ چھوٹی پلکھن چھتنار ہوتی تب ہم نہ ہوں گے۔''[2]

قرۃ العین حیدر کی ولادت 20 جنوری 1927 کو علی گڑھ میں ہوئی۔ ان کے والد سید سجاد حیدر یلدرم علی گڑھ کالج کے ہی تعلیم یافتہ تھے۔ اس وقت برطانوی ہندوستان میں ان کی ملازمت انڈمان اور پھر دہرادون میں رہی اور آخر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں رجسٹرار کی خدمات انجام دیں۔ قرۃ العین حیدر بچپن میں انھیں کے ہمراہ رہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم دہرادون میں ہوئی۔ بعد ازاں اندر پرست کالج دہلی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے انھوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ چونکہ ان کے والدین اس عہد کے ادبی رجحان کے لحاظ سے اُردو کے افسانوی ادب میں اپنی مخصوص شناخت رکھتے تھے اس لیے ادبی ذوق اور تخلیقی رجحان گویا انھیں ورثے میں ملا ہے۔ لیکن اپنے وسیع مطالعے اور تخلیقی جدت و انفرادیت کے ساتھ انھوں نے اُردو کے افسانوی ادب میں بہت جلد اپنی شناخت قائم کرلی۔ ابتدا میں وہ بچوں کی کہانیاں لکھا کرتی تھیں۔ یہ زمانہ برصغیر ہند میں بے حد تغیر پذیر تھا۔ ملک تقسیم ہو چکا تھا۔ تقسیم ہند کو وہ ایک زبردست انسانی المیہ قرار دیتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کی ہلاکتوں اور مجبور و بے بس لوگوں کی ہجرت بے شک بیسویں صدی میں ہندوستان کی تاریخ کا المناک حادثہ تھا۔ تقسیم وطن کا واقعہ ان کی تخلیقی فکر کا اہم محرک بن گیا۔ انھوں نے بھی 1947 میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ پاکستان ہجرت کی۔ پاکستان ہجرت کے واقعے کو انھوں نے کارِ جہاں دراز ہے۔ میں اس طرح بیان کیا ہے:

''ہفتہ بھر بعد بھائی نے ٹرین میں ایک پورا سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ ریزرو کروایا۔ اور ہم کراچی روانہ ہوئے۔ ابھی برطانوی زمانے کو گزرے فقط تین مہینے گزرے تھے اور پرانی ریلیں چل رہی تھیں۔ جنوبی پنجاب اور سندھ کے ریگزاروں سے گزرتے ہوئے وسیع

وعریض ڈبہ گرد وغبار سے اٹ گیا۔ اماں، بھائی، بھابی اور میں کھڑکیاں بند کرکے باہر دیکھنے لگے۔ دور دور تک جلے ہوئے ٹھنٹھ، تھوہڑ، ناگ پھنی اور کیکر اور ببول۔''

پاکستان آنے کے بعد تصنیف وتالیف اور ملازمت کے سلسلے شروع ہوئے۔ انھوں نے پاکستان میں انفارمیشن آفیسر وزارت اطلاعات نشریات پاکستان، پاکستانی ہائی کمیشن لندن، انفارمیشن آفیسر پی آئی اے کراچی اور ایکٹنگ ایڈیٹر پاکستان کواٹرلی، کراچی جیسے اداروں میں 1951 تا 1956 تک خدمات انجام دیں۔

قیام پاکستان کے دوران اُن کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں انھوں نے اردو افسانے اور ناول کو نئے جہات اور آفاق سے روشناس کروایا۔ تقسیم ہند کا کرب، ہجرت، لاکھوں افراد کی ہلاکت، بے بس اور مجبور و مایوس انسانیت، انسانی درد والم کی لا متناہی داستانیں بیان کررہی تھیں۔ یہ حسیت اور کرب ان کے مختلف افسانوں میں بھی ظاہر ہوا ہے۔ 'ستاروں سے آگے'، 'شیشے کے گھر' اور 'پت جھڑ کی آواز'، جیسے افسانوی مجموعے انسانی کرب والم کی روح فرسا کہانیاں سناتے ہیں۔ یہ قرۃ العین حیدر کی شدید انسان دوستی کا احساس کرواتے ہیں۔ افسانے 'جلاوطن' اور 'پت جھڑ کی آواز'، اسی ہجرت اور کرب تنہائی کے شدید احساس سے دوچار کراتے ہیں۔ یہی ہجرت اور انسانی رشتوں کی شکست وریخت افسانہ 'یاد کی اک دھنک جلے' میں ظاہر ہوئی ہے۔ پت جھڑ کی آواز کی تنویر فاطمہ اسی کرب سے دوچار ہے۔ ملاحظہ کیجیے افسانے کا یہ اقتباس:

''اسی زمانے میں دلی میں گڑبڑ شروع ہوئی اور فسادات کا بھونچال آ گیا۔ فاروق نے مجھے میرٹھ خط لکھا کہ تم فوراً پاکستان چلی جاؤ۔ میں تم سے وہیں ملوں گا۔ میرا پہلے ہی سے یہ ارادہ تھا۔ ابا بھی بے حد پریشان تھے۔ اور یہی چاہتے تھے کہ ان حالات میں اب انڈیا میں نہ رہوں جہاں شریف مسلمان لڑکیوں کی عزتیں مستقل خطرے میں ہیں۔ پاکستان اپنا اسلامی ملک تھا۔ اس کی بات ہی کیا تھی ابا جائیداد وغیرہ کی وجہ سے فی الحال ترک وطن نہ کرسکتے تھے۔ میرے بھائی دونوں بہت چھوٹے چھوٹے تھے اور اماں جان کے انتقال کے بعد ابا نے ان کو بڑی خالہ کے پاس حیدرآباد دکن بھیج دیا تھا۔ میرا رزلٹ نکل چکا تھا۔ اور میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئی تھی۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ جب بلوؤں کا زور ذرا کم ہوا تو میں ہوائی جہاز سے لاہور آ گئی۔[3]

صدیوں سے قائم ہندوستان کی مشترکہ تہذیب تقسیم ہند اور ہجرت کے نتیجے میں بالکل ختم ہوگئی۔ یہ اس وقت کی نسل کے لیے ایک عظیم سانحہ تھا۔ لاکھوں لوگوں کی نفسیات بالکل بدل چکی تھی۔ آپسی یگانگت اور رواداری کی جگہ منافرت اور مخاصمت نے لے لی اس سے نوجوان نسل بے حد متاثر ہوئی قرۃ العین حیدر کے مختلف افسانوں میں اس موضوع کی ترجمانی ہوئی ہے۔ شیشے کے گھر میں شامل افسانے بھی اسی مرکزی موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ بطور خاص 'یہ داغ داغ اجالا' اور 'دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم'، افسانوں میں شدت سے اس کا اظہار ہوا ہے۔ اس افسانے کا یہ اقتباس اسی انسانی کرب اور ناگہانی صورت حال کا عکاس ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''لیکن جب وہ لوٹا ہم لوگوں میں سے کوئی بھی وہاں نہ تھا۔ ہماری پرانی کوٹھی بند پڑی تھی۔ سرخ قالین والے کمرے اور لکڑی کے گھوڑوں پر گرد جم گئی تھی۔ دنیا کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ تقسیم کی خونی آندھی آ کر نکل چکی تھی۔ سب خزاں زدہ پتوں کی طرح دور دور سارے عالم میں تتر بتر ہوگئے تھے اور جیمی کو تعجب ہوا کہ اتنا سب کچھ دیکھنے محسوس کرنے اور جھیل لینے کے باوجود اب تک کس طرح جی رہا ہے۔ سب کس طرح جیے جا رہے ہیں۔ لیکن ہم یقیناً زندہ تھے اور اس وقت کھانے کے بعد اپنے اس نئے ملک میں بیٹھے قہوہ پی رہے تھے اور اسٹیشن سے واپسی پر نادر بچوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے کلب اور اچھن یار جنگ اور جانے کہاں کہاں کے قصے سنا رہا تھا اور پولی کہہ رہی تھی بھی واہ جیمی کی نئی جائے تقرر کا نام کس قدر دلچسپ ہے۔ گویا کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ گویا ہم سب ہمیشہ سے اسی جگہ اسی طرح رہتے آئے ہیں۔ انسان کتنی جلدی اپنی ساری تکلیفیں ساری پریشانیاں بھول کر نئے حالات اور نئے ماحول سے مانوس ہوجاتا ہے۔''

قرۃ العین حیدر کو افسانہ نگاری کی روایت یوں تو اپنے والدین سے ہی ملی تھی جو اپنے وقت کے اہم افسانہ نگار تھے ان کے ابتدائی افسانے یقیناً والدین کی ادبی نگارشات کے زیر اثر وجود میں آئے ہیں۔ لیکن جب انھوں نے اپنے گھر کے علاوہ خارجی ادبی منظرنامے کو دیکھا تو ان کی شناسائی ادب کے وسیع وعریض منظرنامے سے ہوئی۔ اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے تحت افسانوی ادب کے مختلف النوع اسالیب وجود میں آ چکے تھے۔ اُردو افسانے کے سرخیل پریم چند کے بعد منٹو، بیدی، عصمت، کرشن چندر اور حیات اللہ انصاری جیسے افسانہ نگاروں نے اُردو کے افسانوی ادب میں بیش بہا اضافے کیے قرۃ العین حیدر کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت کے درمیانی عرصہ میں اُردو افسانہ نگاری کو نئے اسالیب اور اظہار و بیان کے نئے پیرائے عطا کیے۔ 1960 کے بعد جب ادب میں جدیدیت کا رجحان شروع ہوا تو نئے لکھنے والوں کو قرۃ العین حیدر کی افسانوی روایت نے متاثر کیا۔ اس طرح انھوں نے جدیدیت کے رجحان کو فروغ دینے میں اہم کردار کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوی رویے کا تجزیہ کرتے ہوئے وحید اختر لکھتے ہیں:

''قرۃ العین حیدر کا رویہ کہیں کہیں رومانی ہے لیکن موضوعات کو برتنے کا انداز کئی مقامات پر حقیقت پسندانہ بلکہ صحیح طور پر مخالف رومانی ہوجاتا ہے۔ ان کے اسلوب کو توانائی، زبان پر ان کی قدرت، موضوع سے ان کی واقفیت مسائل سے اُن کی ذاتی تعلق Involvement اور تاریخ وتہذیب کے اُن کے وسیع مطالعے نے دی ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ تخلیق میں بنیادی اہمیت کے حامل سہی، لیکن ریاضت اور مطالعہ اسے جو گہرائی اور تکمیل عطا کرتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ افسانے ہیں۔ اُن پر کوئی لیبل چسپاں کرنے کی ضرورت نہیں، یہ جدید بھی ہیں، ان میں کہانی پن بھی ہے، سماجی آگہی بھی، تاریخ وبصیرت بھی ان میں سے بہترین ہماری زبان کے افسانوی ادب کے شہکار ہیں۔''

قرۃ العین حیدر کے تخلیقی اظہار کی دوسری اہم صنف ناول ہے۔ ناول کی صنف وسیع کینوس گہری فکر اور زندگی کے معاملات میں اتنی ہی شمولیت کا مطالبہ کرتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے تجربات مشاہدات یقیناً ہمہ گیر ہیں۔ ان کا مشرقی اور مغربی ادب کا مطالعہ بھی گہرا اور ہمہ گیر ہے۔ اس وجہ سے بھی اُن کی فکر میں گہرائی اور آفاقیت نظر آتی ہے۔ انھوں نے اب، ناول نگاری کی دنیا میں قدم رکھا۔ ان کی ادبی تخلیقی فکر کا ایک اہم پہلو ان کی تاریخ اور دیگر سماجی علوم کے ساتھ اپنے عصری، سماجی اور معاشرتی حالات وواقعات سے گہری وابستگی بھی ہے جو اُن کے افسانوں اور ناولوں میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

دراصل قرۃ العین حیدر کی تعلیم وتربیت اور شخصیت کی تعمیر وتشکیل برطانوی ہندوستان میں ہوئی تھی۔ شمالی ہند کا زمینداری اور جاگیرداری نظام برسوں سے قائم ودائم تھا۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب، مشترکہ تہذیب وتمدن، مختلف فرقوں اور قوموں کے مابین رواداری اور قومی یکجہتی جیسی اقدار نے قرۃ العین حیدر کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ملک کی تحریک آزادی اور اس کے ساتھ ہی دو قومی نظریے کی تحریک بھی فروغ پا رہی تھی۔ آزادی ہند کے ساتھ ہی تقسیم کا ناگہانی اور المناک سانحہ وقوع پذیر ہوا، جو لاکھوں افراد کی ہلاکت اور غارت گری کا سبب بنا، ہندوستان میں مشترکہ تہذیب وتمدن اور قومی رواداری کے جو بت صدیوں سے قائم تھے یکلخت منہدم

ہوگئے۔ ہر چہار سوانسانیت آہ و بکا کررہی تھی۔ فرقہ پرستی کا عفریت انسانی لاشوں کو روند رہا تھا، مجبور و بے بس انسانوں کی آہ و بکا اور چیخ و پکار سننے کے لیے سماعت پتھرا چکی تھی، ہر طرف خون آگ، دہشت کی سیاہ آندھی نے بصارت کو اندھا کردیا تھا۔ یہ حالات قرۃ العین حیدر کے لیے بے حد روح فرسا ثابت ہوئے لہٰذا انھوں نے وسیع تناظر میں ان مسائل کا تخلیقی اظہار اپنے ناولوں کے ذریعے کیا ہے۔ ان ناولوں کے مطالعے سے اُن کی ژرف نگاہی اور عمیق فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا ناول 'میرے بھی صنم خانے' ہے جسے انھوں نے 1947 میں ہندوستان میں ہی لکھنا شروع کیا تھا اور جب وہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہوئیں تو وہاں پر یہ ناول 1949 میں شائع ہوا۔ اس ناول کا بنیادی موضوع ہی تقسیم ہند اور اس کے المناک حادثات ہیں۔ ناول میں بنیادی طور پر دو نسلوں کے کردار نظر آتے ہیں۔ غفران منزل کے مالک کنور عرفان علی جن کو ملک کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے وہ اپنی ریاست کے زمینداری کے معاملات میں مصروف رہتے ہیں۔ دوسری طرف نوجوان نسل میں ناول کا مرکزی کردار رخشندہ اس کے دو بھائی اور اس کی سہیلیاں کرن اوماڈ ائمنڈ کر، اور شہلا رحمان وغیرہ ملک کے حالات پر مباحثے کرتے ہیں۔ رخشندہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر 'نیوایرا' نامی پرچہ نکالتی ہے۔ یہ سب نوجوان تصور پرست اور مثالیت پسند ہیں۔ رخشندہ کے بھائی پی چو کا لکھنؤ کی ملٹری پولس میں تقرر ہو چکا ہے۔ دوسری طرف کنور عرفان علی کی بیوی بیگم نواب سلطنت آرا تمام انتظامی معاملات پر نظر رکھتی ہے۔ ادھر رخشندہ کی والدہ کو اپنی بیٹی کی شادی کی فکر لاحق ہوتی ہے۔

ادھر امبر پور ہاؤس کے سید مرتضیٰ رخشندہ کے بھائی پی چو سے ان کی بیٹی کے ساتھ طے شدہ رشتہ کی بات یاد دلاتے ہیں لیکن یہاں اُن کو کوئی مثبت جواب نہیں ملتا وہ مایوس لوٹ جاتے ہیں پی چو بھی گھر سے فرار ہوجاتا ہے۔ وہ رخشندہ کی سہیلی کرسٹابل سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ کنور عرفان علی حسب سابق سردیوں کے موسم میں اپنے آبائی قصبے مانا تھیر چلے جاتے ہیں۔ اس دوران ملک تقسیم ہوجاتا ہے۔ ملک کے حالات بہت تیزی سے بدلنے لگتے ہیں۔ کنور عرفان علی کی زمینداری اور جاگیرداری کی اب کوئی حیثیت نہیں رہی اور پھر ایک دن اچانک کنور عرفان علی کا انتقال ہوجاتا ہے۔ امبر پور ہاؤس کے لوگ بھی پاکستان منتقل ہونے کی سوچ رہے تھے۔ سندیلے کے چودھری شمیم جو کنور رانی کے دور کے رشتے دار ہیں، رخشندہ سے اپنے رشتے کی بات کرتے ہیں۔ لیکن اُن کا یہ منصوبہ ناکام ہوتا ہے۔ ملک کی تقسیم سے لوگوں کی زندگیاں درہم برہم ہوجاتی ہیں۔ سارے منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے 'میرے بھی صنم خانے' سے یہ اقتباس:

"دنیا بدل رہی تھی، پرانی دنیا ختم ہوچکی تھی۔ یہ معرکے مشاعرے منعقد کرنے والی یہ تہذیب وثقافت پر جان دینے والی یہ زبان کو نکھارنے سنوارنے والے لوگ یہ روایتیں یہ پرانی انجمنیں دم توڑ چکی تھیں جو کچھ باقی بچا تھا وہ اس قدر بے کس اتنا حماقت زدہ ایسا مجبور تھا کہ دنیا اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ تہذیب کے مرکزوں اور گہواروں میں پلنے والے در بہ در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے صحراؤں کی طرف نکل گئے۔ امام باڑے ویران اور مسجدیں شکستہ ہوگئیں۔ پرانے خاندان مٹ گئے۔ زندگی کی پرانی قدریں خون اور نفرت کی آندھیوں کی بھینٹ ہوگئیں۔ ایک عالم تہ و بالا ہوگیا۔ وہ تہذیب ہندوؤں اور مسلمانوں کا وہ معاشرتی اور تمدنی اتحاد وہ روایات وہ زمانے سب کچھ ختم ہوگیا۔"

لکھنؤ کی زمینداری اور جاگیرداری معاشرت کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول انسانی جذبات اور رشتوں کی شکست وریخت کے عجیب واقعات اپنے اندر رکھتا ہے۔ امبر پور ہاؤس کے سید مرتضیٰ، جن کی بیٹی جمیلہ کا رشتہ پی چو سے طے ہوا تھا۔ اس رشتے کے ٹوٹنے کے صدمے سے انتقال کرجاتے ہیں۔ پی چو خود گھر سے فرار تھا۔ وہ دلی میں تعینات تھا اور پاکستان جانے والی ٹرینوں اور لوگوں کی حفاظت کے لیے مقرر کیا گیا تھا لیکن فسادات میں وہ خود بھی مارا جاتا ہے۔ ادھر کنور عرفان علی کی موت کے بعد کنور رانی چودھری شمیم سے نکاح کرکے سندیلے چلی جاتی ہے۔ رخشندہ کے ساتھی دوست جو مثالیت پسندی اور متحدہ قومیت کی باتیں کرتے تھے حیران و پریشان سب بکھر جاتے ہیں۔ سب سے اہم یہ کہ کنور عرفان علی کی وفات کے بعد کنور رانی کا چودھری شمیم سے نکاح کرنا نام نہاد زمینداری اور جاگیرداری کے اخلاقی نظام پر زبردست طنز ہے۔ رخشندہ دہلی سے لکھنؤ آجاتی ہے لیکن اسے یہ دیکھ کر اب حیرت ہوتی ہے کہ لکھنؤ اب بالکل بدل چکا ہے۔ غفران منزل پر اب حکومت کا قبضہ ہوچکا ہے۔ لکھنؤ میں اب اس کا کوئی ساتھی دوست نہیں ہے وہ ایک دو منزلہ پرانی کوٹھی پر پہنچتی ہے جہاں اسے حکومت کے کچھ کارندے نظر آتے ہیں۔ ناول سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"جب پھاٹک کے سامنے آکر رکی تو وہاں کھڑے ہوئے ایک سنتری نے جو غالباً مقامی ہوم گارڈ کا ایک فرد تھا اور صبح دفتر آنے کی جلدی میں دھوتی کے اوپر ہی اپنے یونیفارم کا کوٹ پہن آیا اپنی کھدر کی گاندھی ٹوپی تیڑھی کرکے کان کھجاتے ہوئے ذرا آگے بڑھ کر اس سے کہا "اجی شریمتی مہیلاؤں کے لیے ری سٹلمنٹ کا دفتر امین آباد میں کھولا گیا ہے۔ یہاں صرف پرشوں کا کام دلایا جاتا ہے۔ ترلوکی نندن بابو آپ کو دس بجے وہیں ملیں گے۔"

اودھ کی جاگیرداری اور زمینداری اور متحدہ تہذیبی پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول ایک بے حد دلچسپ ادبی تخلیق ہے لیکن تقسیم ہند کے بعد اس مشترکہ تہذیب کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ شاید مصنفہ اس بدلی ہوئی صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی وہ بالکل ششدر رہ جاتی ہے۔ وہ خلا میں گھورتی رہ جاتی ہے۔ یہ منظر نامہ فرقہ پرستی کی ہیبت ناک صورت اختیار کرلیتا ہے اب مشترکہ تہذیب کے کوئی معنی نہیں تھے۔

قرۃ العین حیدر کا دوسرا ناول 'سفینۂ غم دل' ہے جو 1952 میں شائع ہوا۔ یہ ناول بھی ایک لحاظ سے 'میرے بھی صنم خانے' کی ہی تکرار ہے۔ لیکن اس میں وہ فنی پختگی نہیں جو میرے بھی صنم خانے میں نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا شاہکار ناول 'آگ کا دریا' ہے یہ ناول 1959 میں پاکستان میں شائع ہوا۔ میرے بھی صنم خانے کو اس ناول کا دیباچہ سمجھنا چاہیے۔ 'میرے بھی صنم خانے' میں مصنفہ نے ہندوستان کی جس مشترکہ تہذیب کی پردہ کشائی کی تھی۔ 'آگ کا دریا' میں اس کی توسیع کرتے ہوئے وہ ہندوستان کے عہد قدیم سے اپنا سفر شروع کرتی ہیں۔ اس ناول کا مرکزی موضوع اور کردار وقت ہے۔ گوتم بدھ اور ویدک عہد سے شروع ہوکر پاٹلی پتر مگدھ اور دور وسطیٰ میں مسلمانوں کی آمد، مغلوں کا زوال، برطانوی ہندوستان، آزادی کی تحریک اور پھر تقسیم ہند کا المیہ اور پھر ہند و پاک میں مہاجروں اور شرنارتھیوں کی باز آبادکاری کے مسائل، غرض یہ ناول برصغیر ہند و پاک کی تاریخی سماجی تہذیبی سیاسی اور تمدنی زندگی کا منظر نامہ ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں رزم و بزم دونوں طرح کے عناصر کارفرما رہے ہیں۔

اس ناول کے اہم کرداروں میں گوتم ہری شنکر، چمپا کمال اور طلعت شامل ہیں۔ یوں ضمنی کردار بے شمار ہیں۔ ناول کے مرکزی کردار مختلف زمانوں میں اپنی شناخت اپنے سماجی منظر ناموں کے حوالے سے قائم کرتے ہیں۔ وقت ایک متلاطم دریا ہے۔ جوان کی شناخت ہیئت اور شکل وصورت بدل کر انھیں متعارف کرواتا ہے یہی اس ناول کا تخلیقی اسلوب ہے۔ تقسیم اور ہجرت کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر ناول کے آخری

حصے میں لکھتی ہیں:

''پاکستان میں جو نفسا نفسی کا عالم اور حبِ وطن کی کمی نظر آتی ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو اس سرزمین سے کوئی بے اختیار جذباتی اور روحانی لگاؤ نہیں۔ وہ موقع اور سیکوریٹی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں جس طرح یورپین اقوام امریکہ پہنچی تھیں۔ نیویارک میں رہنے والا پولش بوڑھا وارسا کو یاد کرکے آہیں بھرتا ہے مگر پولینڈ کے اس دھندلے تصور سے اس کی اولاد کو کوئی غرض نہیں جو نئے ملک میں امریکن کی حیثیت سے پروان چڑھتی ہے۔ اسی طرح یہاں پر جو لوگ گومتی کے خربوزوں اور پریاگ کے میلے اور ساون کی گھٹاؤں کو یاد کرکے روتے ہیں ان کی اولاد جو یہاں بڑی ہو رہی ہے اس کے لیے یہ سارے تصورات بے معنی اور مضحکہ خیز ہیں۔

غرض 'آگ کا دریا' قرۃ العین حیدر کے تخلیقی سفر کا شاہکار اور اُردو ناول کی تاریخ کا سنگِ میل کہنا چاہیے۔ پاکستان میں 'آگ کا دریا' کی اشاعت کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے لندن چلی گئیں وہاں پر انھوں نے ڈیلی ٹیلیگراف میں صحافتی خدمات انجام دیں۔ 1960 میں لندن سے ہندوستان لوٹ آئیں۔ ہندوستان آکر ممبئی میں صحافتی خدمات انجام دیں۔ 'امپرنٹ' میگزین میں (1964 تا 1968) تک خدمات انجام دیتی رہیں، بعدازاں السٹریٹ ویکلی کے ایڈیٹوریل بورڈ میں (1968-1975) تک خدمات انجام دیتی رہیں۔

اس دوران اُن کا ایک اہم ناول 'آخر شب کے ہم سفر' 1971 میں شائع ہوا۔ اس ناول میں 1942 کی بنگال کی دہشت پسند انقلابی تحریک کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مزید یہ کہ یہ ناول ملک کی آزادی قیام پاکستان اور پھر قیام بنگلہ دیش جیسے اہم واقعات کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول کے اہم کردار ریحان الدین احمد دیپالی سرکار، اومارائے اور جہاں آرا وغیرہ ہیں۔ اس دوران اُن کا ایک سوانحی ناول 'کارِ جہاں دراز ہے' دو جلدوں میں شائع ہوا۔ اس ناول کی ایک تیسری جلد 'شاہراہِ حریر' کے عنوان سے شائع ہوئی یہ ناول مصنفہ کی نہ صرف سوانح ہے بلکہ اس میں برصغیر ہند و پاک کی تاریخی تہذیبی سیاسی سماجی معاشرتی مذہبی زندگی کی مختلف تحریکات کے علاوہ علمی و ادبی رجحانات کا بیان بھی بہت ہی عالمانہ انداز میں کیا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے آخری دو ناول 'گردشِ رنگِ چمن' اور 'چاندنی بیگم' میں برصغیر ہند کی تاریخی تہذیبی و مذہبی اور سماجی زندگی کی مرقع کشی ہے۔ گردش، رنگ چمن میں تصوف اور اس کے مختلف عقائد بھی زیرِ بحث

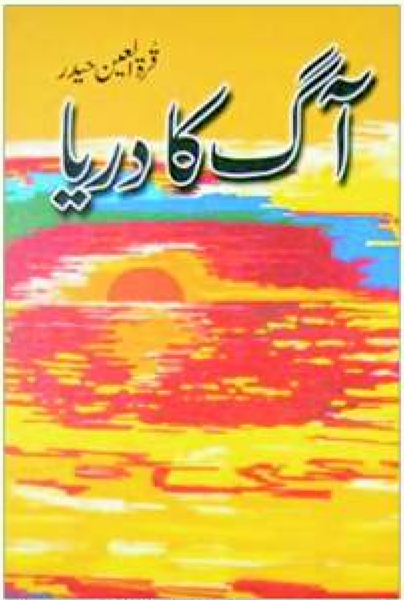

آتے ہیں۔ جبکہ چاندنی بیگم میں لکھنؤ کی جاگیرداری تہذیب کے اعلیٰ طبقات کو ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے افسانے اور ناول کے علاوہ ناولٹ بھی لکھے ہیں۔ ان کے چار ناولٹ 'دلربا'، 'چائے کے باغ'، 'سیتاہرن' اور 'اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو' مقبول ہو چکے ہیں۔ 'دلربا' ممبئی کی پارسی تھیٹریکل کمپنی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ جبکہ 'چائے کے باغ' میں سلہٹ میں اونچے طبقے کے لوگوں کی کھوکھلی زندگی کے علاوہ چائے کے باغات میں کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ناولٹ 'سیتاہرن' سندھ کراچی کے شرنارتھی خاندان سے متعلق ہے۔ سیتا تقسیم کے بعد کراچی سے دہلی آکر بس جاتی ہے۔ 'اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو' عرس اور میلے ٹھیلے کی فضا میں تخلیق کیا گیا یہ ناولٹ بنیادی طور پر رشک قمر اور جمیلن ان دو لڑکیوں کی دردبھری زندگی کو پیش کرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا آخری افسانوی مجموعہ 'روشنی کی رفتار' ہے جو 1982 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل 18 افسانے ہیں جو مختلف النوع موضوعات اور اسالیب بیان کے لحاظ سے بھی جدت آمیز ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے نثری اظہار کی ایک اہم صنف رپورتاژ نگاری بھی ہے۔ ان کے تحریر کردہ رپورتاژ کی تعداد 12 ہے ان رپورتاژوں میں کوہ دماوند'، 'چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا'، 'گل گشت'، 'خضر سوچتا ہے'، 'وولر کے کنارے'، 'دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں'، 'قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے'، 'ستمبر کا چاند'، 'در چمن ہر ورقی حال دگر ست' اور جہان دیگر شامل ہیں۔ ان رپورتاژوں میں مختلف مقامات پر ان کی سیاحت اور وہاں کی مجالس کی روداد عمدگی سے بیان کی گئی ہے۔ ان کی ادبی خدمات میں مغربی ادب سے کیے گئے تراجم بھی بے حد اہم ہیں۔ انھوں نے ہنری جیمس کے ناول (پورٹریٹ آف اے لیڈی) کا ترجمہ 'ہمیں چراغ ہمیں پروانے' کے عنوان سے کیا۔ انھوں نے ٹی ایس ایلیٹ کے ڈرامے 'مرڈر ان کیتھڈرل' کا ترجمہ کلیسا میں قتل کے عنوان سے کیا اس کے علاوہ کچھ روسی ادب سے بھی ترجمے کیے ہیں۔ مزید اپنے افسانوں اور ناولوں کے ترجمے بھی انگریزی میں کیے ہیں۔

اُن کی ادبی خدمات کے عوض انھیں مختلف انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ان کے افسانوی مجموعے 'پت جھڑ کی آواز' پر 1967، ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا۔ 1969 میں اُن ادبی ترجمہ نگاری کے لیے انھیں سوویت لینڈ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1984 میں پدم شری ایوارڈ اور 1985 میں غالب ایوارڈ عطا کیا گیا۔

ناول 'آگ کا دریا' کے لیے ہندوستانی ادبیات کا سب سے بڑا ایوارڈ گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا۔ سنہ 2000 میں بہادر شاہ ظفر ایوارڈ 2005 میں پدم بھوشن ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اس کے علاوہ انھیں اقبال سمان سے بھی نوازا گیا۔

قرۃ العین حیدر ہندوستانی ادبیات کا وہ روشن ستارہ ہے جس کی روشنی میں تشنگان ادب ہمیشہ اپنی نئی راہیں دریافت کرتے رہیں گے۔ انھوں نے اُردو کے افسانوی ادب کو جدت آمیز اسالیب اور طرز اظہار عطا کیا۔ ناول اور افسانہ دونوں اصناف میں انھوں نے منفرد شناخت قائم کرلی۔ اُردو اور انگریزی ادبیات کے گہرے مطالعے کے علاوہ تاریخ اور دیگر علوم سے ان کی دلچسپی نے بھی ان کی فکر کو ہمہ گیری عطا کی۔ انسانی دردمندی اور شدید انسان دوستی نے انھیں اُردو ادب کی عظیم شخصیت کا مرتبہ عطا کیا۔ اُردو ادب ان کی تخلیقات سے ہمیشہ گراں بار رہے گا۔

ماخذات

(1) قرۃ العین حیدر: کارِ جہاں دراز ہے، ص21-22

(2) قرۃ العین حیدر: کارِ جہاں دراز ہے، ص225

(3) قرۃ العین حیدر: پت جھڑ کی آواز، صفحہ

(4) قرۃ العین حیدر: شیشے کے گھر، ص225

(5) وحید اختر: قرۃ العین حیدر کے افسانے فکر و فن ایک مطالعہ، ص460

(6) قرۃ العین حیدر: آگ کا دریا

■

Professor Shaikh Siddiq Mohiuddin
H.O.D Department Of Urdu
Dr.Baba Saheb Ahmedkar Marathwada University, Aurangabad. M.S.
Mob:9096157937

داغ کے ایک شاگرد

مولانا حسن رضا خاں بریلوی

اعلم شمس

مولانا حسن رضا خاں بریلی کے مشہور علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے آبا و اجداد مغلیہ عہد میں قندھار سے وارد ہندستان ہوئے تھے۔ محمد سعادت یار خاں، محمد شاہ کے وزیر تھے جن کے نام سے دہلی میں بازار سعادت گنج اور سعادت خاں کی نہر منسوب تھی۔ آپ کے جدِ اعلیٰ محمد کاظم علی خاں کو بدایوں کی تحصیلداری کا منصب عطا ہوا تھا جس کے تحت آٹھ گاؤں معافی کے عطا ہوئے تھے۔ آپ کے دادا بریلی کے مشہور صوفی بزرگ رضا علی خاں تھے جنھوں نے حافظ رحمت خاں والیِ روہیل کھنڈ کے پوتے خان بہادر خاں کے ساتھ انگریزوں سے جنگ کی۔ آپ کے والد مولانا نقی علی خاں جید عالم تھے، انھی نقی علی خاں کے یہاں آپ 4 ربیع الاوّل 1276ھ مطابق 19 اکتوبر 1859 میں پیدا ہوئے۔ مشہور عالم دین، متقی و پرہیزگار، عاشقِ رسول، بلند پایہ نعت گو شاعر مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی آپ کے بڑے بھائی تھے۔ حسن رضا نے مروجہ علوم وفنون اپنے خاندانی بزرگوں سے حاصل کیے اور معقولات و منقولات میں مہارت حاصل کرنے کے بعد خدمت دین متین انجام دینے لگے۔ تشنگانِ علوم کو اپنے چشمۂ علم سے سیراب کرنے لگے۔

خدا نے طبیعت موزوں عطا کی تھی لہٰذا شعرگوئی کی وادی میں بھی قدم رکھا۔ اس وقت دنیا جہاں میں فصیح الملک داغ دہلوی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ داغ کی شہرت پورے ملک کیا بیرونِ ملک بھی پہنچ چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ شہرت مولانا حسن رضا خاں کے کانوں تک بھی پہنچی ہوگی اور کیوں نہ پہنچتی، آپ کی پھوپھی کی شادی رام پور میں جناب فضل حسن خاں سے ہوئی تھی۔ مولانا حسن رام پور اپنی پھوپھی کے یہاں جایا کرتے تھے۔ اُس وقت حضرت داغ کا قیام رام پور ہی میں تھا کیونکہ دہلی کی بساط اجڑنے کے بعد داغ رام پور آچکے تھے اور گھر گھر ان کا چرچا ہونے لگا تھا، ان کے رنگ کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ روزمرہ اور محاوروں کے دلکش اسلوب کی سحرکاری نے ہر کسی کو گرویدہ بنا رکھا تھا۔ غزل اپنے شباب پر تھی اس پر جب داغ کا رنگ چڑھا تو یہ اور بھی حسین ہوگئی۔ داغ کے اس رنگ کا یہ اثر ہوا کہ رام پور دربار سے جڑے دیگر شاعروں نے بھی انھیں کے رنگ کی اتباع کرنے میں بھلائی سمجھی۔

داغ نے اپنے چراغ سے بہت سے چراغ روشن کردیے۔ ہندوستان کی تاریخ میں داغ اکیلے ایسے استاد ہیں جنھوں نے بقول نوراللہ محمد نوری پانچ ہزار سے زائد شاگردوں کی ایک کثیر تعداد چھوڑی جو غالباً ایک تاریخ ہے جن میں علامہ اقبال، سیماب اکبرآبادی، نوح ناروی، احسن مارہروی، سائل دہلوی، بیخود دہلوی، بیخود بدایونی، ناطق گلاؤٹھی، اختر نگینوی، اشک دہلوی، محمود رام پوری، نسیم بھرت پوری، آغا شاعر دہلوی، جوش ملسیانی، رسا بلند شہری، مہر گوالیاری، طپش مارہروی، متین مچھلی شہری، نظام الملک میر محبوب علی خاں آصف اور حسن رضا خاں بریلوی وغیرہ خاصے مشہور ہیں۔ یوں تو ان شاگردوں میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے لیکن حسن بریلوی کا کچھ الگ مقام تھا، وہ پوری طرح داغ کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔

حسن بریلوی کو شعر و سخن کا شوق لڑکپن سے تھا لیکن جوانی آتے آتے یہ شوق بھی جواں ہوگیا۔ رام پور آتے آتے مشقِ سخن چلتی رہی اور آخرکار اپنے پھوپھا فضل حسن خاں کی وساطت سے داغی ہوگئے۔ بریلی سے رامپور صرف 60 کلومیٹر ہے لہٰذا رام پور آنا جانا کوئی زیادہ مشکل نہ تھا۔ حسن بریلوی نے داغ سے اصلاح لینا شروع کردیا اور ایک مدت تک رام پور میں رہ کر استاد کے گلشن سے پھول چنتے رہے۔ یہاں تک کہ بجائے خود استاد مستند قرار پائے۔ حسن بریلوی کا داغ کے شاگرد ہونے کا سب سے بڑا ثبوت تو خود ان کا کلام ہے۔ اس کے علاوہ تذکروں میں لالہ سری رام کے تذکرے 'خمخانۂ جاوید' یعنی تذکرۂ ہزار داستان میں لالہ سری رام، حسن بریلوی کے خاندانی حالات بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں:

''علم و فضل آپ کا خاندانی ہے نعت گوئی میں اپنے برادر بزرگ مولوی احمد رضا خاں صاحب سے مستفیض ہیں اور عاشقانہ رنگ میں بلبلِ ہندوستان سے تلمذ تھا۔ جس زمانے میں حضرت داغ رام پور میں تھے آپ ان کے شاگرد ہوئے اور ہر سال ایک دو مہینے ان کی خدمت میں رہ کر فیضِ صحبت سے مستفیض ہوتے رہے۔ داغ صاحب کو ان سے خاص اُنس تھا اور اکثر پیارے شاگرد

انھیں کہا کرتے تھے۔'' (ص 450)

خود حسن رضا کہتے ہیں:

پیارے شاگرد تھا لقب اپنا
کس سے اس پیار کا مزہ کہیے

رسالہ 'نگار' کے داغ نمبر 1953 کے ایک مضمون میں نوح ناروی نے داغ کے 58 خاص شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔جس میں حسن بریلوی کو انھوں نے 22 ویں نمبر پر رکھا ہے۔ اسی رسالے میں ڈاکٹر نفیس سندیلوی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''حاجی مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی حضرت شاہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کے چھوٹے بھائی، شعرو سخن کا طبعی وفطری ذوق تھا، غیر معمولی ذہانت و فطانت کے مالک تھے، مزاج میں شوخی و شگفتگی اور زندہ دلی تھی۔ حضرت داغ کے ارشد تلامذہ میں شمار تھا۔ نعتیہ کلام میں ان کا دیوان ذوق نعت اور عاشقانہ میں ثمر فصاحت یادگار ہے۔'' (ص 133)

'انتخاب سخن' میں حسرت موہانی لکھتے ہیں:

''شاگردانِ مرزا داغ دہلوی میں حسن مرحوم بریلوی کا پایۂ شاعری بہت بلند تھا وہ بجائے خود استاد مستند تھے۔'' (ص 91)

مولانا عبدالسلام ندوی 'شعر الہند' میں لکھتے ہیں:

''نواب مرزا داغ کے تلامذہ میں بیخود بدایونی، بیخود دہلوی، نسیم بھرت پوری، نوح ناروی، سائل دہلوی، حسن بریلوی اور اشک وغیرہ مشہور ہیں۔''

'چند شعرائے بریلی' میں سید لطیف حسین ادیب بریلی کے ایک اور اہم شاعر نواب نیاز احمد خاں ہوش کی وفات 1892 کے بعد کی حالت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی وفات کے وقت داغ کا آفتاب شہرت نصف النہار پر تھا اور بریلی میں ان کے شاگرد حسن رضا خاں حسن کے ذریعے زبان دانی، فصیح البیانی اور معاملہ بندی کی ترویج و اشاعت ہو رہی تھی، یہ ایسا سیلاب تھا جس میں بریلی کے شعرا بہہ گئے۔ مشاعروں میں وہی کلام پسند کیا جاتا تھا جو داغ کے اثرات کا حامل تھا۔ چونکہ داغ کے طرز میں شعر کہنا آسان تھا، شاعروں کی تعداد اور مشاعروں کی محافل میں اتنی کثرت سے اضافہ ہوا کہ بریلی کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔'' (ص 140)

لطیف حسین ادیب کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دنوں واقعی بریلی شہر مشاعروں کی رزم گاہ بنا ہوا تھا اور ہر کوئی داغ کے رنگ میں رنگ جانا چاہتا تھا بلکہ ایک مرتبہ بریلی کے ایک مشاعرے کی صدارت بھی جناب داغ دہلوی نے کی تھی، اس سلسلے میں لطیف لکھتے ہیں:

''محلہ معماران بریلی میں وہ عمارت جو امام باڑہ کہلاتی ہے اور جس میں ہر سال سات محرم کو بڑی دھوم دھام ہوتی ہے، نئے شہر میں مشاعروں کا بڑا مرکز تھی۔ اسی عمارت میں استاد داغ کی زیرِ صدارت بھی مشاعرہ ہوا تھا۔'' (ص 143)

اس میں کوئی شک نہیں حسن بریلوی داغ کے چہیتے شاگرد تھے اور وہ اپنے کلام پر شاگرد داغ ہونے پر ناز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کیوں نہ ہو میرے سخن میں لذت سوز و گداز
اے حسن شاگرد ہوں میں داغ سے استاد کا

غزلوں پر مشتمل حسن بریلوی کا دیوان 'ثمر فصاحت' 1910 میں مطبع اہل سنت بریلی سے آپ کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ جس زمانے میں آپ نے شاعری میں قدم رکھا اس زمانے میں مقبول صنفِ شاعری غزل بامِ عروج پر تھی۔ حسن بریلوی نے بھی مروجہ روش کے مطابق اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی، بعد میں نعت گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔

حسن بریلوی کے کلام میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو کلامِ داغ کا طرۂ امتیاز ہیں جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ داغ کے کلام میں شوخی اور تیکھا پن ہے، زبان میں چٹخارہ ہے، سہل ممتنع کی بھرمار ہے، محاوروں کی کثرت ہے، روزمرہ ہے۔ جرأت کی معاملہ بندی، محبوب سے آزادانہ چھیڑ چھاڑ ہے۔ حسن کی طلب تو عشق کی رفاقت وحمایت ہے۔ عشق محسوس کا جلوہ ہے۔ طنزِ لطیف، حاضر جوابی اور محبوب سے شکوہ و شکایت۔ مترنم بحروں وغیرہ کی تمام خوبیاں حسن کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں۔

داغ کی طرح حسن رضا کے کلام کی جاذبیت اور دل کشی میں روزمرہ کا عمل دخل سب سے زیادہ ہے۔ روزمرہ کے استعمال نے ان کے کلام کو سادگی، سلاست، روانی عطا کی۔ روزمرہ کی چاشنی کے باعث ان کی شاعری میں بے ساختگی اور بے تکلفی کی وہ فضا قائم ہوتی ہے جس سے مسلسل گفتگو کا مزہ آتا ہے۔ اشعار دیکھیے۔

کیوں دلِ زار محبت کا نتیجہ دیکھا
درد فرقت کا کوئی پوچھنے والا دیکھا
بس رخ یار سے اٹھتے ہوئے پردہ دیکھا
پھر خبر ہی نہ رہی کیا کہیں پھر کیا دیکھا

داغ کا شعر ہے۔

یوں تو دنیا نے زمانے کا تماشا دیکھا
منصفی شرط ہے ہم نے تمھیں کیسا دیکھا

داغ کے چند اشعار اور دیکھیے اور اسی زمین میں حسن کے بھی اشعار ملاحظہ کیجیے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفائی زبان، چٹخارہ، روزمرہ اور سہل ممتنع کو دونوں نے کیسے برتا ہے۔

داغ:

غضب کیا تیرے وعدہ کا اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا
کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا
مری وفا نے مجھے خوب شرمسار کیا
نہ اس کے دل سے مٹایا کہ صاف ہو جاتا
صبا نے خاک پریشاں مرا غبار کیا

(ص 10، م د)

حسن بریلوی:

عدو نے حالِ محبت جو آشکار کیا
تمھیں خدا کی قسم تم نے اعتبار کیا
تمھیں تو شرم سے منہ کھولنا بھی مشکل ہے
عدو کو رات مگر ہم نے ہمکنار کیا
ستم گروں کے ستم کی ترقیاں دیکھو
کہ مجھ کو خاک کیا خاک کو غبار کیا

(ص 9، ث ف)

داغ:

روئے انور نہیں دیکھا جاتا
دیکھیں کیونکر نہیں دیکھا جاتا

کیا رہیں ہم کہ ترا چال چلن
پاس رہ کر نہیں دیکھا جاتا

حسن:

ان کا جلوہ نہیں دیکھا جاتا
دیکھ دیکھا نہیں دیکھا جاتا
کیسے عیسیٰ ہو تمھارا بیمار
کبھی اچھا نہیں دیکھا جاتا
قابل دید ہے ترا جلوہ
پر کریں کیا نہیں دیکھا جاتا

حسن بریلوی کے یہاں روزمرہ کی چند مثالیں اور دیکھیے:

نوچ لیتے ہیں کلیجہ نالہائے بیکسی
منہ نہ کھلوائے کوئی میرے لب فریاد کا
اس ستم پر بھی تری محفل سے
کوئی آتا نہیں دیکھا جاتا
چھٹ گیا دامن کلیجہ تھام کر ہم رہ گئے
لے چلا دل چھین کر وہ دشمن جاں لے چلا
میرے گھر تک پاؤں پڑ کر ان کو لایا تھا نیاز
ناز دامن کھینچتا سوئے رقیباں لے چلا
موسم گل ہے چمن ہے گل رخان دہر میں
ہم کو دیوانہ جنوں سوئے بیاباں لے چلا

الفاظ کی الٹ پھیر اور تکرار الفاظ سے بھی حسن بریلوی نے اپنے کلام میں تاثیر پیدا کی ہے، چند مثالیں دیکھیے:

یاد کرنا اتو بھلا یا بھول جانا یاد ہے
بھول جانے والے قائل ہوں میں تری یاد کا
بے خبر ہو بے خبر کو کیا خبر اس درد کی
سنگ دل ہو سنگ دل پر کیا اثر فریاد کا
کس نے سنایا اور سنایا تو کیا سنا
سنتا ہوں آج تم نے مرا ماجرا سنا

فارسی عطف و اضافت کے بغیر بھی حسن بریلوی نے سیکڑوں اشعار کہے ہیں اور اس سے تاثیر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ احسن مارہروی نے 'منتخب داغ' میں لکھا ہے کہ داغ کے چاروں دیوانوں میں صرف غزل کے اشعار کی تعداد سولہ ہزار ایک سو باسٹھ (16,162) ہے اور ایسے اشعار جن میں فارسی اضافت اور عطف نہیں چھ ہزار دو سو چوالیس (6,244) ہیں۔ دراصل 'منتخب داغ' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں بغیر فارسی عطف و اضافت والے اشعار ہیں اور دوسرے حصے میں باقی کلام کے بہترین اشعار ہیں۔ حسن بریلوی کے بغیر عطف و اضافت کے چند اشعار دیکھیے۔

جب انھیں ملنا نہ ہو منظور تو کیا اثر
کیا بھروسہ آہ کا کیا آسرا فریاد کا
سب صورتوں میں جلوہ گری ایک ہی کی ہے
نقشہ جما ہوا ہے کسی کے جمال کا
جلوہ کسی حسین کا ہے دل کی آرزو
تصویر ڈھونڈتا ہے مرقع خیال کا
یہ مانا دکھ ہمارا لادوا ہے
جو وہ پوچھیں تو اے دل پوچھنا کیا
ستاؤ دل دکھاؤ مار ڈالو
نہ آئے گا کبھی روز جزا کیا

مومن نے رقیب کے لیے لفظ 'غیر' کا استعمال سب سے زیادہ کیا ہے بلکہ یہ ان کی خصوصیت ہے۔ داغ نے تو کہیں کہیں رقیب کا لفظ استعمال کیا ہے، جیسے اس شعر میں۔

وہ اس ادا سے وہاں جا کے شرمسار آیا
رقیب پر مجھے بے اختیار پیار آیا

لیکن حسن بریلوی نے کہیں رقیب کا لفظ استعمال نہیں کیا اور ہر جگہ مومن کا رنگ ہے، مثال دیکھیے اس میں محاورہ بھی ہے۔

غیر کی باتوں کو سن کر پی گئے
چپ رہے کیا جانیے کس ڈر سے ہم
سو کی سو اچھی اگر سو خواہشیں ہوں غیر کی
میری لاکھوں حسرتوں میں ایک بھی اچھی نہیں
الفت غیر کا مذکور ہے میرے آگے
وہ بھی اس ڈھب سے کہ ہیں چاہنے والا ہی نہیں

زبان بامحاورہ، الفاظ مناسب اور بندش چست ہو تو شعر میں جان پڑ جاتی ہے۔ سامع کا ذہن فوراً اثر قبول کر لیتا ہے۔ فصیح و بلیغ کلام کی یہی نشانی ہے۔ حسن رضا نے شاعری کی ان خصوصیات کو اپنے استاد سے سیکھا۔ فصاحت اور بلاغت جو شعر میں معنوی خوبیاں، موزوں اور مناسب الفاظ سے ظاہری حسن پیدا کرتی ہے ان کے یہاں دونوں پہلو دلکش اور لطف انگیز ہیں۔

داغ اور شاگردان داغ کی ہمیں ایک خصوصیت ایسی ملتی ہے جس نے ان کو فصیح اللسان بنا دیا اور وہ ہے صنائع و بدائع کا بالقصد استعمال نہ کرنا جس سے کلام میں تصنع پیدا نہ ہو جیسا کہ سابقین کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ جب شاعر کسی بدائع یعنی تشبیہ، استعارہ، تلمیح، مبالغہ، حسن تعلیل وغیرہ کو بالقصد استعمال کرتا ہے تو کلام سے فطری پن رخصت ہو جاتا ہے لیکن اگر کلام میں فطری پن کے ساتھ بداعت کا استعمال ہو تو وہ کلام فصیح کہلاتا ہے۔

خاص طور سے جب اس میں غیر مانوس ترکیب ثقیل الفاظ، اشعار میں ایک جیسے دو حرف کا اجماع جیسا کہ غالب کے یہاں نقش پا پایا ہے۔ اسی طرح غیر مانوس الفاظ اور مشکل لغات الفاظ نہ ہوں۔ حسن بریلوی کے دیوان کا شعر بہ شعر مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے استاد کی مکمل تقلید کی۔ ان کے الفاظ، تراکیب لغات، روزمرہ، محاورہ، جان فصاحت ہیں ان کو زبان میں غضب کی کشادگی اور خوش گوئی ملتی ہے۔

مجموعی طور پر حسن بریلوی کے غزلیہ دیوان 'ثمر فصاحت' کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد تنقیدی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری اپنے عہد کے غزل کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ انھوں نے صرف رسمی طور پر شاعری نہیں کی ہے بلکہ اسے ایک فن کے طور پر برتا ہے اور اس کے تمام تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک بلند اور معیاری شاعری کے لیے ضروری ہیں۔ ان کی غزلوں میں بلند خیالی اور رفعت تخیل پائے جاتے ہیں، ندرت اور افکار نو کی فضا بندی بھی ملتی ہے۔ زبان و بیان کی لطافت و نزاکت، حسن و رعنائی، دلکشی اور بانکپن، شدت احساس، عام بول چال، روزمرہ کی زبان، مانوس اور شگفتہ الفاظ اور حسب ضرورت محاورات و کنایات و استعارات اور پیکروں کا استعمال ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ داخلیت کا رنگ ان کی شاعری میں بہت گہرا ہے۔ احساسات و جذبات کی فراوانی نے خارجیت کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ احساس کی شدت نے فطرت کی رنگینیوں کو ان کے دامن میں بھر دیا ہے۔ بہار و شباب، فصل گل، باد بہاری، شادابی و رعنائی وہ کیا ہے جو ان کی شاعری میں نہیں پایا جاتا۔ ان کے اشعار و بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں داغ کا رنگ گہرا اور بہت گہرا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دبستان داغ سے متعلق تھے اور اپنی غزلوں اور نعتیہ شاعری سے تادم حیات اس رنگ سے دنیا کو رنگتے رہے۔ بقول لالہ سری رام، نواب فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے تلامذہ میں آپ ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے اور کچھ عجب نہیں کہ زندگی مستعار وفا کرتی اور یہ مشغلہ قائم رہتا تو ان کے نام کو جلا دیتے۔ حسن بریلوی کا قریب 50 سال کی مختصر عمر میں 1908 میں انتقال ہو گیا اور بریلی کے سٹی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

■

Dr. Alam Shams
Dept of Urdu, Zakir Husain College
New Delhi - 110002
Mob.:9312365749

شخصی مرثیہ معنی و مفہوم

نصرت نبی

اردو شاعری کے عظیم ذخیرے میں مرثیے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس کا تعلق مذہب یا عقیدے سے ہے بلکہ اس لیے کہ یہ وہ صنفِ سخن ہے جس نے اردو شاعری کو وسعت دی اور اسے ایک ایسا بیش قیمت شعری ذخیرہ فراہم کردیا جو دنیا کی کئی دیگر بڑی زبانوں کے لیے بھی باعث رشک ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں شاعری میں جو صنف سب سے پہلے وجود میں آئی وہ مرثیہ ہے۔ کیونکہ جب دل کو ٹھیس لگتی ہے تو زبان سے پُردرد موزوں کلمات ادا ہوتے ہیں۔ موت پر کیے جانے والے ماتم کے اظہار کو اس کی مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ اپنے عزیزوں کی موت پر جو پُر درد اور پُر اثر کلمات بے اختیار ادا ہوتے ہیں یہ رثائی شاعری کی خصوصیت ہے۔ مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے اور رثا سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی کی موت پر رونا۔ یعنی مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کے مرنے پر رنج و غم کا اظہار کیا جائے۔ الطاف حسین حالی نے مرثیہ کی تعریف اس طرح سے کی ہے۔

”مرثیہ کے معنی ہیں کسی کی موت پر جی کڑھانا اور اس کے محامد اور محاسن بیان کرکے اس کا نام دنیا میں زندہ کرنا۔“

(الطاف حسین حالی، مقدمۂ شعرو شاعری، مرتبہ: وحید قریشی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1993، ص)

فارسی کے مشہور ادیب زین العابدین نے ’رثا‘ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

”رثا ان اشعار کو کہتے ہیں جن میں مرنے والوں کا ماتم کیا جائے، دوستوں اور اقارب کی تعزیت کا ذکر ہو، قوم کے قائدین یا فرماں روا کے مرنے پر الم کا اظہار ہو یا پیشوایان دین اور ائمہ اطہار خاص طور پر حضرت سید الشہدا اور شہدائے کربلا کے مصائب کا ذکر ہو اور ان کے مناقب و فضائل کا بیان ہو“

(عابد علی عابد، اصول، انتقادیات و ادبیات اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو 1992)

مرثیہ گوئی انسان کے جذبات کا مظہر ہے۔ کسی مرنے والے کی خوبیوں کا بیان، اس سے اپنی محبت اور وابستگی کا اظہار، اپنے غم و اندوہ و الم کا بیان، اس کی موت پر اپنے تاثراتِ قلب کا اظہار، رحم، ہمدردی محبت اور سچی انسانیت کا ایک بڑا ثبوت ہے۔ مرثیہ گوئی صرف ایک فطری صنف ادب ہی نہیں ہے بلکہ اخلاق حسنہ کا ایک جزو اور اچھا نمونہ بھی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مرثیوں کی بدولت اردو شاعری کا دامن اخلاقیات سے مالا مال ہوا ہے۔ اس کا اعتراف حالی نے بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق لوگوں نے مرثیہ میں بیان کیے ہیں ان کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی ذرا مشکل سے ملے گی۔“

(الطاف حسین حالی، مقدمہ شعرو شاعری، مرتبہ: وحید قریشی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1993)

اس اعتبار سے مرثیہ گوئی برائے شاعری نہیں بلکہ ایک شائستہ، مہذب اور بلند کردار قوم کے اخلاق کی نشانی ہے اور اسی وجہ سے یہ صنف سخن دوسرے اصناف کے مقابلے میں زیادہ قابل قدر ہے۔

دنیا کی تقریباً ہر زبان میں رثائی ادب کی روایت رہی ہے۔ یورپ میں ایلجی (Elegy)، تھرنوڈی (Threnody) وغیرہ رثائی اسالیب ہیں اور ان کی گونج یونان، فرانس اور انگلستان تک سنائی دیتی رہی ہے۔ اٹھارہویں صدی میں انگریزی کے گورستانی اسکول کے شاعروں نے موت اور لافانیت پر افسردہ کرنے والے عمومیت زدہ تاثرات اور بعض اوقات انسان کے عدم استقلال کی مکروہ امیجری کو فلسفیانہ خیال آرائی کے ساتھ ملا کر پیش کیا ہے۔ لیکن عربی ادب میں مرثیہ ایک صنف ہے۔ ادب الجاہلیہ میں بھی مرثیوں کا خاص مقام ہے۔ شدید محبت اور نفرت عرب کے مزاج کی خاصیت رہی ہے اس لیے عربی کے متغزلانہ قصائد کی طرح عربی مرثیے بھی شدت جذبات و احساسات کے لیے ممتاز ہیں۔

عربی ادب کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں کوئی شاعر ایسا نہیں ملتا جس نے مرثیہ نہ کہا ہو۔ کسی نے بھائی کا مرثیہ کہا تو کسی نے بیٹے کا، کسی نے باپ کا مرثیہ کہا تو کسی نے دوست کا۔ عدی بن ربیعۃ العامری، جابر بن سفیان، یتمی ابن مالک، خنساء، متمم بن نویرہ، دعبل، فرزدق، کمیت اسدی، خالد بن معدان، امام شافعی علی، محمد بن منصور، محمود بن حسین الشہیدی، ابومنصور بغدادی، سید رضی، سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، علامہ شہاب الدین القادر، عبدالباقی العمری اور محی الدین بن طریح النجفی اپنے اپنے دور کے مشہور و ممتاز مرثیہ نگار ہوئے ہیں۔ عہد رسولؐ میں شہدائے بدر و احد کے بھی مرثیہ لکھے گئے۔ بعد میں آنحضرتؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ نے متعدد مرثیے لکھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حسان بن ثابت انصاریؓ نے بھی مرثیے لکھے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے:

''اگرچہ جاہلیت ہی کے زمانے میں مرثیہ گوئی کی بہت ترقی ہوچکی تھی اور بہت سے شعرا نے بڑے بڑے پُر اثر مرثیے لکھے تھے لیکن دو شخص اس زمانے میں بہت نامور ہوئے۔ خنساؔ اور متمم بن نویرہ''

(شبلی نعمانی، موازنہ انیس و دبیر، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1992)

اسی طرح فارسی ادب میں بھی مرثیے کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ فردوسی نے سہراب کا مرثیہ اس کی ماں کی زبانی لکھا۔ فرخی نے سلطان محمود کا مرثیہ لکھا۔ یہ دونوں مرثیے مثنوی کی شکل میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ابو المفاخر رازی، نورالائمہ خوارزمی، حکیم سنائی غزنوی، خواجہ عطار نیشاپوری، آزری اسفرائنی، ابن حسام، حاجی محمد جان قدسی، مقبل، غالب اور مفتی محمد عباس نے بھی کافی مرثیے لکھے ہیں۔ شیخ سعدی شیرازی اور امیر خسرو کا بھی ایک ایک مشہور مرثیہ ہے۔ محتشم کاشی نے زیادہ تر اہل بیت رسولؐ کے مرثیے لکھے۔

غرض کہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے ادب میں مرثیے کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ اردو شاعری کی بیشتر کلاسیکی اصناف فارسی روایت کی دین ہیں۔ صنف مرثیہ بھی فارسی کی وساطت سے اردو میں داخل ہوئی اور عربی اور فارسی مراثی کا اثر اردو مرثیہ پر ضرور رہا تاہم اردو مرثیہ کا بنیادی مزاج مقامی ہے۔

مجموعی آہنگ تسلسل کے باوجود مرثیوں کا لہجہ طویل قصیدوں اور مثنویوں کے لہجے سے مختلف ہے۔ اس میں قدم قدم پر قصیدے کی طرح شوکت و جزالتِ الفاظ کا مطالبہ نہیں، مثنویوں کی طرح بیانیہ انداز کا تقاضا بھی نہیں۔ قوافی و ردیف کے اعتبار سے شاعر قصیدے کی طرح خود کو پابند بھی نہیں پاتا اور مثنویوں کی طرح آزاد بھی نہیں۔ اس مقید عروضی آزادی نے مسدس کو وہ آہنگ دیا جو مرثیے کی شکل میں ہمارے سامنے آیا اور یہی ہیئت انیس، چکبست اور اقبال کے یہاں بے حد جاندار اور توانا ہو کر سامنے آئی اور اسی ہیئت کی صلاحیتوں کو سمجھنے کے لیے نظیر اکبرآبادی سے اقبال و جوش تک اس کے ارتقائی سفر کو جانچنے پرکھنے کی ضرورت ہے۔ نظیر کی قلندری، ضمیر و خلیق کی بیانیہ خوش سلیقگی، دبیر و دلگیر کی رثائی جذباتیت اور انیس کا رزمیہ آہنگ، بزم آرائی، عینیت، اعلیٰ اخلاقی اقدار سے وابستگی اور وحدت تصور و تنظیم خیال کے ساتھ ان سب کے فنکارانہ اظہار کا سلیقہ، اقبال کی فکری گہرائی اور چکبست کی فطرت پرستی، وطن پروری اور آفاق دوستی، ان سب نے مل جل کر اردو مسدس کے آہنگ کو دوسری ہیئتوں کے آہنگ سے مختلف کر دیا ہے اور طویل نظموں کے لیے بے حد گوارا بنا دیا ہے۔ مسدس کو صنفِ مرثیہ میں بڑے پیمانے پر سب سے پہلے ضمیر اور ان کے ہم عصر خلیق، فصیح اور دلگیر نے برتا۔ اس کے بعد انیس و دبیر اور ان کے متبعین نے اس کو عروج پر پہنچایا۔

اردو میں مرثیہ عموماً کربلائی مرثیہ کے معنوں میں ہی لیا جاتا رہا ہے جب کہ شخصی مرثیہ کی روایت بھی بڑی پرانی اور توانا ہے۔ شخصی مرثیوں کی یہ روایت برہان الدین جانم اور جعفر زٹلی سے شروع ہو کر حالی اور چکبست سے گزرتی ہوئی دور حاضر تک پہنچ جاتی ہے۔ عموماً مرثیے کی گفتگو کرتے وقت ذہن براہِ راست واقعات کربلا سے متعلق مراثی کی طرف جاتا ہے اور ان شخصی مرثیوں کی طرف خیال بھی نہیں جاتا۔

حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اردو شاعری کربلائی مرثیے کی بدولت اخلاقیات کے موتیوں سے مالا مال ہوئی ہے۔ آج بھی ہندو پاک کے مرثیہ نگار واقعۂ کربلا کی معنویت کا عرفان حاصل کر کے نئی نئی جدتیں پیدا کر رہے ہیں۔ تاہم حالی شخصی مرثیے کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مرثیہ کے معنی ہیں کسی کی موت پر جی کڑھانا اور اسکے محامد و محاسن بیان کر کے اس کا نام دنیا میں زندہ کرنا۔ پس شاعر جو کہ قوم کی زبان ہوتا ہے جس کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ جب کسی کی موت سے اس کی قوم یا خاندان یا اس کے دل کو فی الواقع صدمہ پہنچے۔ اس کیفیت یا حالت کو جہاں تک ممکن ہو درد اور سوز کے ساتھ شعر کے لباس میں جلوہ گر کرے۔''

(الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ: وحید قریشی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1993)

حالی قومی یا شخصی مرثیہ لکھے جانے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے مزید کہتے ہیں:

''قوم میں قومیت کی روح اس طرح پھونکی جاسکتی ہے کہ قوم کے افراد مثل ایک خاندان کے ممبروں کے ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کریں۔ جو زندگی میں ان کی نیکیوں کو چمکائیں، کمالات کو شہرت دیں اور مرنے کے بعد ان کی ایسی یادگاریں قائم کریں جو صفحۂ ہستی سے کبھی نہ مٹنے والی ہوں''

(الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ: وحید قریشی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1993)

اس طرح حالی نے نئی طرز کے مرثیوں سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا اور اس امر پر زور دیا کہ مرثیوں کو شہدائے کربلا کے ذکر تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس میں مشاہیر قوم اور ارباب کمال کی موت پر بھی ان کے اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا جائے اور قوم کو ان کی پیروی میں اُبھارا جائے۔ حالی نے اپنے ان مشوروں پر خود عمل کیا۔ انھوں نے بذات خود واقعۂ کربلا یا حضرت امام حسینؑ پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میر انیس کے بعد وہ خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ انھوں نے مرثیہ نگاری میں وسعت و افادیت پیدا کی۔ حالی نے مرثیہ کو سیاسی، سماجی، ملکی و ملی، شخصی و قومی خیالات کا بھی حامل بنایا۔ اسے مسدس کی قید سے آزاد کیا اور ترکیب بند، مثنوی، قطعہ اور غزل کی ہیئت میں بھی لکھنے کو رواج دیا۔

مرثیے کے بارے میں ایک غلط فہمی عام یہ ہے کہ مرثیہ محض رونے رُلانے کی چیز ہے۔ حالانکہ رونا مرثیے کی بنیاد ضرور ہے لیکن یہ مرثیے کا مقصد نہیں ہے۔ دیکھا جائے تو انیس و دبیر کا مقصد بھی رونا رلانا نہیں تھا اور اگر ان کا یہی مقصد ہوتا تو پھر مرثیے میں رزم و بزم اور اخلاق کا اس قدر پھیلاؤ اور سیرت و کردار کے بیان میں شاعرانہ کمالات دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ اردو ادب میں چونکہ واقعات کربلا پر لکھے گئے مراثی کا اتنا وافر ذخیرہ موجود ہے اس لیے ہمارے یہاں عرف عام میں مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جو واقعۂ کربلا پر لکھی گئی ہو۔ لیکن اردو میں بڑی تعداد ان مرثیوں کی بھی موجود ہے جن کا موضوع واقعہ کربلا نہیں ہے۔ ان دونوں اقسام کے مرثیوں میں صرف تفریق اور شناخت کی غرض سے ہم دوسرے قسم کے مرثیوں کو شخصی مرثیہ کہتے ہیں۔

اردو میں شخصی مرثیے کی روایت بہت پرانی ہے حالانکہ شخصی مرثیہ کی ابتدا کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ اس کا آغاز غالب نے کیا لیکن اردو ادب کی تاریخ کا اگر بغور

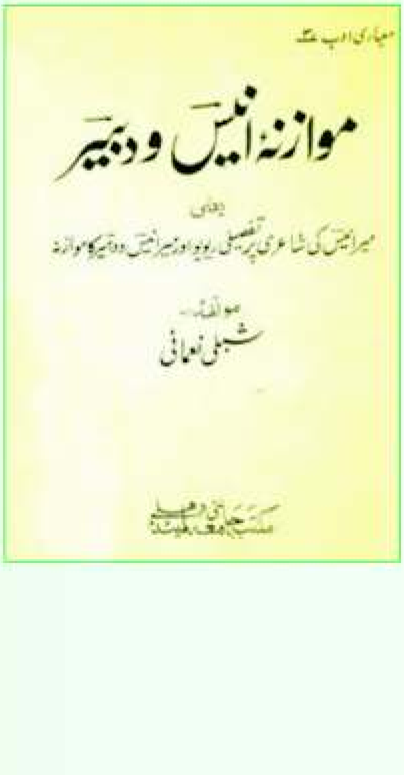

مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اس کے نمونے قدیم ادب میں ملتے ہیں۔اردو بیشتر ادبی اصناف کی طرح شخصی مرثیے کا ابتدائی نمونہ ہمیں دکنی ادب میں ملتا ہے۔مقبول فاروقی کے مطابق یہ مرثیہ برہان الدین جانم نے اپنے والد میراں جی کے نام لکھا تھا۔وہ لکھتے ہیں:

''اردو کا پہلا شخصی مرثیہ ہمیں برہان الدین جانم کے یہاں ملتا ہے جو انھوں نے اپنے والد شیخ میران العشاق کی وفات پر کہا تھا۔''

اردو شاعری میں تاریخ ہائے وفات کا جو رواج رہا ہے اس کے لیے قطعہ کی ہیئت مخصوص رہی ہے۔اموات پر لکھے گئے قطعات تاریخ اپنی کیفیت کے اعتبار سے شخصی مرثیے سے بہت قریب ہیں۔عبد الحی تاباں اور نظام الدین ممنون نے کافی تعداد میں قطعات لکھے لیکن ابتدائی دور سے ہی ہمارے شعرا حضرات کو قطعات تاریخ اور مرثیے میں تفریق کا شعور تھا۔اس لیے اس میں کسی غلط بحث کی گنجائش نہیں تھی۔تاباں اور ممنون سے پہلے جعفر زٹلی نے اورنگ زیب کی وفات پر مثنوی کی ہیت میں مرثیہ لکھا۔اس کا عنوان' مرثیہ اورنگ زیب عالمگیر' رکھا۔یہ تفریق کے شعور کا پہلا اور واضح ثبوت ہے۔اس طرح اردو ادب میں قطعات تاریخ اور شخصی مرثیے کی الگ الگ روایت موجود ہے۔بشیر النسا بیگم تبسم نے کربلائی اور شخصی مرثیے کے بنیادی فرق کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے اجزائے ترکیبی کا بھی تعین کچھ اس طرح کیا ہے:

* شخصی مرثیے میں چہرہ یا تمہید کا بیان کیا جانا چاہیے۔
* شخصی مرثیے میں متوفی کی سیرت و کردار کا بیان کیا جانا چاہیے۔
* کردار کے بیان میں متوفی کی عظمت کا بہ حیثیت انسان اور بحیثیت فنکار بیان ہونا چاہیے۔
* کردار ہی کے ضمن میں معاصرانہ تہذیب کا بیان کیا جانا چاہیے۔
* متوفی کی وفات کا بیان۔
* شاعر اپنی محرومیوں کا بیان کرتے ہوئے بین کا مضمون بیان کرتا ہے۔
* مرثیے کے آخر میں دعا کا مضمون بیان کیا جا سکتا ہے۔

اگر مندرجہ بالا نتائج کو مختصراً تحریر کریں تو شخصی مرثیے کے اجزائے ترکیبی کی ہیئت اس طرح بنے گی:

(1) چہرہ (2) سیرت و کردار کا بیان (3) وفات کا ذکر (4) بین (5) دعا

کربلائی مرثیے کے برخلاف شخصی مرثیہ میں بین کے عناصر کو داخل کرنا ذرا مشکل ہے لیکن شخصی مرثیہ نگار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ متوفی کے کردار کے ذریعہ بین کے عنصر کا جواز پیدا کرے۔شخصی مرثیہ میں کردار نگاری کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور مرثیہ نگار کردار ہی کے ذریعے سوگوار فضا کی تعمیر کرتا ہے۔

شخصی مرثیے کے تمام سرمائے کو ایک ہی حصے میں نہیں رکھا جا سکتا ہے کیونکہ شخصیات، کیفیات اور ذیلی موضوعات کے پیش نظر یہ مراثی مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔کسی شخص کی موت سے پیدا ہو جانے والے مرثیوں میں دو قسم کے عناصر کی بنیادی کارفرمائی نظر آتی ہے۔اول، شخصیت کی نوعیت کیا ہے؟ دوم، اس کے پیش نظر اپنے جذبات واحساسات اور رنج وغم ہیں یا کوئی مخصوص حلقہ یا پھر پورا ملک اور قوم۔مثال کے طور پر اگر کوئی شخصیت ایسی ہے جس کی حیثیت ملک گیر ہے اس کی موت پر مرثیے لکھتے وقت شاعر کے پیش نظر تمام ملک کے عوام کا رنج وغم ہوگا۔چاہے ذاتی طور پر مرنے والے سے شاعر کے تعلقات کچھ بھی رہے ہوں ان کی حیثیت ذیلی ہے لیکن جب شاعر اپنے کسی عزیز، بھائی یا دوست کا مرثیہ لکھتا ہے تو وہ اس کے تئیں اپنے ذاتی جذبات، پیار و محبت اور رنج وغم کے گہرے جذبات کو بنیادی اہمیت دے گا۔چاہے اس کے بھائی یا عزیز کی قومی یا ملکی سطح پر کوئی بھی حیثیت رہی ہو۔اس مختصر سی بحث کے بعد شخصی مرثیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(الف) ذاتی یا انفرادی

(ب) اجتماعی

(الف) ذاتی یا انفرادی مرثیے:ذاتی یا انفرادی مراثی وہ مراثی ہیں جن میں شاعر اپنے ذاتی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔شاعر مرنے والے سے ذاتی طور پر وابستہ ہوتا ہے اور ان کے مرنے سے اس کی زندگی متاثر ہوئی ہوتی ہے۔ایسے مرثیوں میں شعرا اپنی ذاتی زندگی کی ویرانی، شدت غم، محبت اور خلوص کے گہرے جذبات کو پیش کرتا ہے۔اس قسم کے مرثیہ میں کسی اور کے لیے بجز انسانی رشتے کے شدت احساس کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ہمارے ہاں اس طرح کا پہلا مرثیہ غالب کے یہاں ملتا ہے۔یہ مرثیہ غالب نے اپنی معشوقہ کی موت پر لکھا ہے۔اس میں غالب نے متوفی کی موت اور اس کے ساتھ اپنے تعلق کے ذاتی تجربات پوری شدت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

حالی سے قبل انیس، دبیر، مشیر، میر نفیس اور واجد علی شاہ اختر کے یہاں بھی ذاتی نوعیت کے مراثی ملتے ہیں۔

ذاتی مرثیوں میں ایک قسم ان مراثی کی ہے جن میں شاعر اپنی رفیقۂ حیات کی موت کے بعد اس سے اپنی

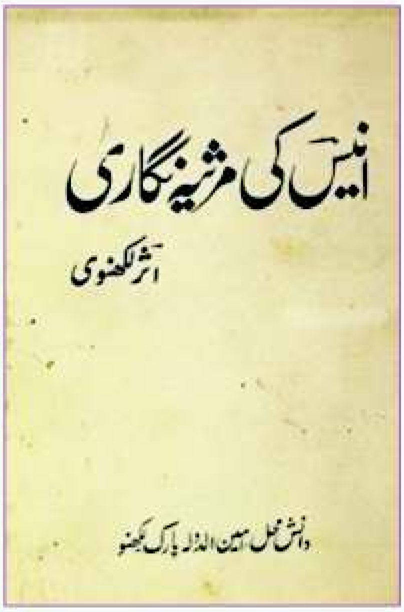

محبت اور جذبات کا والہانہ اظہار کرتا ہے۔ازدواجی زندگی میں رونما ہونے والے عشقیہ اور والہانہ محبت کے جلوے شخصی مراثی میں اپنی پوری لطافت، گہرائی اور شدت کے ساتھ موجود ہیں۔تلوک چند محروم نے غالباً اسے سب سے پہلے باقاعدہ موضوع سخن بنایا۔اس سے قبل صرف حسرت موہانی کے یہاں اس موضوع پر مرثیہ ملتا ہے۔

(ب)اجتماعی مرثیے : شخصی مرثیہ کی دوسری قسم اجتماعی مرثیوں کی ہے۔اجتماعی مراثی وہ مراثی ہیں جن میں کسی اجتماعی غم کو مرثیہ کا موضوع بنایا گیا ہو یعنی جس شخص پر مرثیہ لکھا گیا ہو اس کا کردار ملکی، قومی، اصلاحی یا علمی حیثیت سے اہمیت کا حامل رہا ہو اور جس طبقہ سے وہ شخص منسلک تھا وہ مخصوص طبقہ حد درجہ متاثر ہوا ہو۔حقیقت حال یہ ہے کہ شخصی مرثیہ کا بیشتر سرمایہ اجتماعی مرثیوں کے ذیل میں آتا ہے ان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن کی تفصیل یوں ہے:

(1) **مشاہیر قوم کے مرثیے**:اجتماعی مرثیوں میں سب سے پہلی قسم ان مرثیوں کی ہے جو مشاہیر قوم کی اموات پر لکھے گئے ہیں۔جن مشاہیر نے قوم کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے کام کیے ان مراثی میں مرنے والوں کی تعریف و تحسین کے علاوہ ان کے کارناموں کو سراہا جاتا ہے۔مشاہیر قوم کے غم کو شعراء نے اپنی ذات تک محدود نہ رکھا بلکہ انھیں اجتماعی حیثیت سے پیش کیا جو پوری قوم کا غم بن کر سامنے آیا۔

(2) **سیاست دانوں کے مرثیے**:اجتماعی مرثیوں میں دوسری قسم ان مراثی کی ہے جو اہل سیاست یا مجاہدین آزادی کی موت پر لکھے گئے ہوں۔ان میں ٹیپو سلطان

شہید، بہادر شاہ ظفر، مولانا محمد باقر مجتہد، مولانا امام بخش صہبائی جیسی شخصیات سے متعلق مرثیے اہمیت کے حامل ہیں۔

(3) **شعرا و ادبا کے مرثیے**: اجتماعی مرثیوں کی تیسری قسم وہ ہے جو شعرا اور ادبا کے انتقال پر لکھے گئے ہیں یا لکھے جاتے ہیں۔ شعرا ہماری تہذیب اور تمدن کا ایسا حصہ ہوتے ہیں جو ادب ثقافت اور فنون لطیفہ کی تاریخ مرتب کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں اس لیے ان کی اموات پر لکھے گئے مراثی اجتماعی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

(4) **سلاطین و امرا کے مرثیے**: اجتماعی مرثیوں میں چوتھی قسم ان مراثی کی ہے جو سلاطین و امرا کے انتقال پر لکھے گئے ہیں۔ اگر چہ ان مراثی کی تعداد بہت کم ہے لیکن اپنی معنویت کے سبب ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان قسم کے مراثی کی ابتدا کا سہرا جعفر زٹلی کے سر جاتا ہے۔

(5) **صوفیائے کرام، بزرگان دین اور علماء کے مرثیے**: اجتماعی مرثیوں کی آخری قسم ان مرثیوں کی ہے جو صوفیائے کرام، بزرگان دین اور علما کی اموات پر لکھے گئے ہیں۔ ان مراثی میں ان علما کے فیوض، برکات عملی اور مذہبی خدمات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جس کا پُر ہونا ناممکن ہے۔ اس سلسلے کا پہلا شخصی مرثیہ 996ھ میں لکھا گیا۔ یہ مرثیہ حضرت برہان الدین جانم نے اپنے والد حضرت میران جی شمس العشاق کے انتقال پر لکھا ہے۔

جب ہم جنوبی ہند کی شاعری کا باقاعدہ جائزہ لیتے ہیں تو شخصی مرثیے کے کسی بھی طرح کے آثار کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ قدیم دکنی ادب کی تاریخ (تین سو سالہ تاریخ) میں صرف ایک ہی شخصی مرثیہ تا حال دستیاب ہے۔ یہ مرثیہ برہان الدین جانم نے اپنے والد میران جی کے انتقال پر لکھا ہے۔ اس مرثیہ کے متعلق تفصیلات کلمۃ الحقائق مرتبہ اکبرالدین صدیقی کے مقدمے سے حاصل ہوتی ہیں۔

دکنی شاعری کے مطالعے کے بعد اس قسم کا کوئی اور مرثیہ نظر نہیں آتا ہے البتہ وہاں کربلائی مرثیہ کی ایک شاندار روایت موجود ہے۔ بعد کے شعرا میں جعفر زٹلی ایک ایسا شاعر ہے جس کو شمال کا پہلا شخصی مرثیہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ باغی ذہن کا مالک تھا اس نے اپنی شاعری میں مروجہ معیار اور اقدار سے بغاوت کی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کا رنگ اپنے معاصر شعرا سے مختلف تھا۔ ڈاکٹر عابد حسین حیدری اپنی کتاب 'اردو میں شخصی مرثیے کی روایت' میں یوں رقم طراز ہیں:

''جعفر نے پہلا مرثیہ 'اورنگ زیب عالمگیر' کے عنوان سے لکھا جو مثنوی کی ہیئت میں 36 اشعار پر مشتمل ہے۔ اگر چہ جعفر ایک ایسا شاعر ہے جس کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ وہ زٹل اور عریاں اشعار کہتا ہے لیکن اگر ہم اس کے مرثیوں کا جائزہ لیں تو ان تمام چیزوں سے انحراف نظر آتا ہے۔ مرثیوں میں مہذب اور شائستہ الفاظ کا استعمال ہے اور بیان میں تاثیر اور حسن انگیزی بھی ہے۔''

(عابد حسین حیدری، اردو میں شخصی مرثیے کی روایت، نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرس، دہلی 2008)

ایک بیجاپوری شاعر شاہ عبدالرحمان قادری کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور (ڈاکٹر محی الدین قادری زور) نے لکھا ہے کہ انھوں نے ایک مثنوی 'باغ حسینی' لکھی جو سولہ ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں رحمان قادری نے شہر بیجاپور کا بڑا دردناک مرثیہ لکھا ہے۔ 'پنجاب میں اردو' میں محمود شیرانی نے اس عہد کے دو شخصی مرثیوں کا ذکر کیا ہے جو نامدار خاں دت اور محمد غوث بٹالوی کی یادگار ہیں۔ نامدار خاں دت کا مرثیہ چڑت سنگھ نامی ایک سالار کی موت پر لکھا گیا ہے جو جنگ میں دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ محمود شیرانی نے اس مرثیے کے آٹھ بند نقل کیے ہیں۔

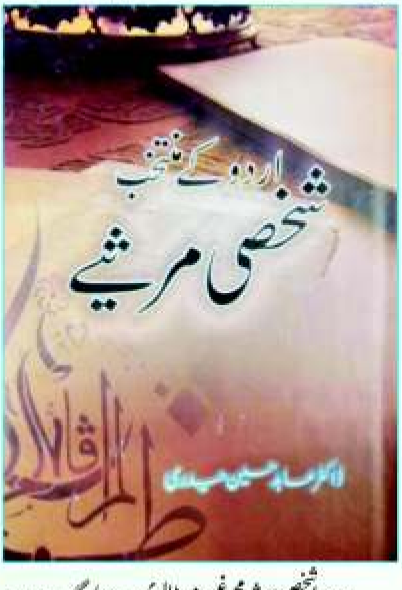

دوسرا شخصی مرثیہ محمد غوث بٹالوی سے یادگار ہے۔ یہ مرثیہ 1783 میں راجہ جے سنگھ کے فرزند گوربخش سنگھ کے میدان جنگ میں کام آنے پر کہا گیا ہے۔ یہ مرثیہ مسدس کی فارم میں ہے۔ بارہ بندوں پہ مشتمل یہ مرثیہ شخصی مرثیہ کے تمام لوازمات سے بھر پور ہے اور بیت کی تکرار نے اس کے بین کے تاثر میں مزید اضافہ کیا ہے۔

میر حسین علی کرمانی جو ٹیپو سلطان کا درباری شاعر تھا کے شخصی مرثیے کو انفرادیت حاصل ہے۔ ٹیپو سلطان نے اسے ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ جب ٹیپو سلطان انگریزوں کی سازشی چال کی وجہ سے مارا گیا تو اس کی شہادت پر میر حسین علی کرمانی نے سلطان ٹیپو کا مرثیہ لکھا ہے۔

جعفر زٹلی کے بعد جہاں روحی، شاہ عبدالرحمن قادری، نامدار خاں دت، محمد غوث بٹالوی اور میر حسین علی کرمانی کے مراثی ملتے ہیں وہیں دہلی میں میر عبدالحی تاباں ایک ایسا شاعر ہے۔ جس نے اپنے معاصر شعرا اور رفقا کی وفات پر قطعات لکھے ہیں۔

میر نے باقاعدہ طور پر کسی کا شخصی مرثیہ نہیں لکھا ہے البتہ انھوں نے اپنی اس بیٹی کا تذکرہ غزل کے ایک مطلع میں کیا ہے جو شادی کے کچھ دنوں بعد انتقال کر گئی تھی۔ یہ مطلع ایک پورے مرثیے کی حیثیت رکھتا ہے۔

کھلا ہم پر یہ اے آرام جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تجھے بھولے تھے ہم اسباب شادی میں

ان مراثی کے علاوہ انشاء اللہ خان انشا نے بھی شاہ عالم ثانی کی وفات پر قطعہ نظم کیا تھا۔ قلندر بخش جرأت نے فیض آباد کے نواب مرزا حیدر بیگ کا مرثیہ لکھا۔

انیس نے ایک شخصی مرثیہ 'یا خدا دل کو کسی کے غم اولاد نہ ہو' 1858 میں پٹنہ کے مشہور رئیس نواب سید قاسم علی خاں کے جوان سال بیٹے کی ناگہانی موت پر کہا ہے۔ جسے 'وقار انیس' جلد دوم میں مہذب لکھنوی نے شائع کیا۔ مہذب لکھنوی اس مرثیے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''باپ (نواب قاسم علی) نے جو ان فرزند کے مرنے پر جہاں انتہائی غم کیا، وہاں انتہائی شان سے رسوم غم بھی ادا کیے۔ حضرت انیس کو لکھنؤ سے بلا کر مجلس چہلم پڑھوائی۔ حضرت انیس نے نیا مرثیہ نظم فرمایا۔ جس کے چہرے میں مرحوم کی علالت کا ذکر کیا ہے۔ انتقال کے بعد زوجہ اور ماں باپ کی حالت کی صحیح مصوری فرمائی۔''

(مہذب لکھنوی، (مقدمہ) وقار انیس (جلد دوم) (انجمن محافظ اردو، لکھنؤ 1954)

مسدس میں کہے ہوئے اس مرثیہ میں 51 بند ہیں۔ انیس نے اولاد کی موت کے غم کا چہرہ ترتیب دے کر اس مرثیے کے لیے انتہائی دردانگیز فضا تیار کی ہے۔

اسی دوران غالب کے ذریعہ دو شاہکار ادب پارے وجود میں آئے جو آگے چل کر شخصی مرثیہ نگاری کے محرک بنے۔ انھیں مراثی کی وجہ سے غالب کا نام شخصی مرثیہ نگاری کی راہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب کی دو غزلیں شخصی مرثیہ کے ضمن میں آتی ہیں۔ اول ''درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے''۔ دوم ''لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور'' کا شمار شخصی مرثیہ کے ذیل میں ہوتا ہے۔

اس مرثیہ میں شروع سے آخر تک غم کی فضا طاری ہے۔ غالب کا یہ غم ان کا ذاتی غم ہے جس کو صرف انھوں

نے ہی محسوس کیا ہے۔ غم انگیزی اور درد کے جو تجربات ہیں ان میں انفرادی شان ہے۔ تڑپ اور غم کی کیفیت اس مرثیہ کو عظمت اور بلندیوں سے ہمکنار کرتی ہے۔

کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تاز برشگال
بے نظر خود کردۂ اختر شماری ہائے ہائے
شرم و رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموس پیمان محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

غالب نے دوسرا مرثیہ عارف کی وفات پر لکھا۔ یہ مرثیہ غزل کی ہئیت میں ہے۔ یہ مرثیہ اردو کے شخصی مرثیوں میں انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ مرثیہ غالب کے مخصوص انداز کے ساتھ شروع ہوتا ہے جس میں شوخی کے ساتھ ساتھ ان کا طنزیہ لب ولہجہ غم کی مجموعی فضا کو متاثر کرتا ہے۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم کون سے ایسے تھے کھرے داد وستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

غالب کے ہمعصر مومن خان مومن نے بھی اپنی معشوقہ کے انتقال پر مرثیہ 'معشوقہ حور طلعت' کے عنوان سے لکھا۔ یہ مرثیہ ترکیب بند کی ہئیت میں ہے۔ یہ مرثیہ بارہ بند اور 132 اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مرثیہ سوز و گداز سے پُر ہے اور اس کا ایک ایک شعر اثر و خلوص میں ڈوبا ہوا ہے۔ مرثیہ میں واردات قلب کے ساتھ ساتھ پردہ نشیں معشوق کی وفاؤں اور ذاتی غم اور تڑپ کا بیان ہے۔ اس مرثیہ میں جو خوبی قاری کو سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے وہ متوفی سے شاعر کی محبت، والہانہ پن اور اس کا غم انگیز بیان ہے۔

جب 1291ھ میں انیس کا انتقال ہوا تو اردو شعر و ادب خاص طور پر مرثیہ کے میدان میں جو خلا واقع ہوا اس کا ماتم تمام بڑے شاعروں نے کیا۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعرا نے اس عظیم شاعر کو خراج تحسین پیش کیا۔ فارسی مراثی میں انیس کے فرزند میر نفیس اور مفتی محمد عباس کے علاوہ میر عشق، شاد لکھنوی پیرو میر فصیح اللہ وفا فرنگی محلی، جلال لکھنوی، مرزا محمد مرتضیٰ عرف مچھو بیگ عاشق، میر نواب مونس سید محمد ذکی عرف سید محمد الم شاگرد میر مونس، سید ہاشم، مسعود حسن، سید آل محمد بلگرامی، سید محمد جعفر محمد، خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی کے مراثی قابل ذکر ہیں۔ باقر علی خان تشفی نے قطعے کی صورت میں انیس کا مرثیہ کہا جس میں ذاتی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اس عظیم شاعر کا ماتم کیا گیا ہے۔

ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود شخصی مرثیہ کے ارتقا کی رفتار اتنی سست ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس پورے دور میں کربلائی مرثیہ نگاری کا زور تھا اور شعراء زیادہ تر اپنے عزیزوں اور دوستوں کے انتقال پر حصول ثواب کی خاطر سید الشہدا امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کا مرثیہ ہی بڑھتے تھے لیکن اسی دوران نواب مرزا محمد زکی، علی خان زکی لکھنوی کے دو مرثیے ملتے ہیں۔ پہلا مثنوی کی شکل میں ہے جو 'اختر جناں' کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرا مرثیہ قطع کی شکل میں ہے جس کا ذکر استاد ذی نواب مرزا کاظم علی خاں نے اپنی تصنیف 'تلاش و تحقیق' میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ امان علی سحر لکھنوی نے 'جان عالم جان لکھنؤ' اور فدا علی عیش لکھنوی نے 'اشک مسلسل' کے عنوان سے مرثیہ کہا۔

تاریخ ادب میں حالی کی ذات دوسرے اساتذہ کے مقابلے میں اس لیے منفرد ہے کہ ادب کے بہت سے سلسلوں کا آغاز ان کی ذات سے ہوا ہے اور ہر ایک میں انھوں نے اپنا نقش چھوڑا ہے۔ حالی سے شخصی مرثیہ نگاری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شخصی مرثیہ کو ایک علاحدہ صنف کے طور پر اپنایا اور دوسرے شعرا کو بھی اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ حالی شخصی مرثیہ نگاری کو سماج کی اہم ضرورت سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ مرثیے کو صرف شہدائے کربلا کے ذکر تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ دیگر مشاہیر قوم کی اموات پر بھی مرثیے لکھے جائیں۔ ان کی صفات بیان کی جائیں اور ان کی وفات سے ہونے والے ملی اور سماجی نقصانات کی نشاندہی کی جائے تاکہ قوم اس سے سبق و عبرت حاصل کرے۔ اردو میں حالی کے لکھے سات مراثی ملتے ہیں جو سارے کے سارے شخصی نوعیت کے ہیں۔ مرثیۂ غالب، خواجہ امداد حسین کا مرثیہ، حکیم محمود خاں کا مرثیہ، برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ کے دو مراثی اور محسن الملک کا مرثیہ نہ صرف حالی کے شخصی مراثی میں اہمیت کے حامل ہیں بلکہ یہ مراثی اردو میں شخصی مراثی کے جدید دور کے سنگ میل بھی ہیں۔

حالی کی اقتدا میں اردو کے تقریباً تمام Geniuine شعرا نے شخصی مراثی لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل شعرا اور ان کے لکھے شخصی مراثی قابل ذکر ہیں:

علامہ شبلی نعمانی کا اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق کی وفات پر لکھا گیا مرثیہ۔ اسماعیل میرٹھی کے سالار جنگ اوّل اور لارڈ میو کے قتل پر لکھے گئے مرثیے۔ مولانا محمد علی جوہر کے سر سید احمد خان اور غلام حسین خان کے مرثیے۔ اکبر الہ آبادی کے ریاست دھرم پور کے نوجوان کنور عبدالعزیز، مہاراجہ کشن پرشاد شاد اور اپنے بیٹے ہاشم کی موت پر لکھے گئے مراثی۔ مولانا طباطبائی کے انتقال پر مہاراجہ سر کشن پرشاد کا مسدس کی ہیت میں لکھا گیا 14 بندوں پر لکھا گیا مرثیہ۔ خوشی محمد ناظر کے لکھے مراثی مثلاً پیام سرسید، مرثیہ نواب محسن الملک، مرثیہ خان بہادر سر فضل حسین، مرثیہ نواب مسعود جنگ سر راس مسعود اور مرثیہ حالی۔ سرور جہاں آبادی کے مشاہیر قوم مثلاً سوامی رام تیرتھ، داغ دہلوی، محسن الملک اور مولانا محمد حسین آزاد کی موت پر لکھے گئے مراثی۔ مولانا احسن مارہروی کے داغ اور حالی و شبلی کی موت پر لکھے گئے مراثی۔ چکبست کے لکھے مراثی مثلاً مہادیو گوند رانا ڈے، پنڈت پرتاب کشن، اجودھیا ناتھ آغا، گنگا پرشاد ورما، تیج نرائن، گوپال کرشن گوکھلے، پنڈت بشن نرائن در، اقبال نرائن مسلہ دان، بال گنگا دھر تلک پر لکھے گئے مراثی۔ صفی لکھنوی کے حالی، چکبست، مرزا بہادر محمد عباس علی خاں جگر، مولانا کرامت حسین اور مولانا محمد علی جوہر کی موت پر لکھے گئے مراثی۔ علامہ اقبال کے مرزا غالب، داغ، سوامی رام تیرتھ، فاطمہ بنت عبداللہ، شبلی و حالی، والدۂ ماجدہ، ہمایوں اور سر راس مسعود کی موت پر لکھے گئے مراثی۔ حسرت موہانی کے اپنی رفیقۂ حیات اور بال گنگا دھر تلک کی موت پر لکھے گئے مراثی۔ فیض احمد فیض کے اقبال اور اپنے بھائی کی موت پر لکھے گئے مراثی۔ جوش ملیح آبادی کے گاندھی جی، مولانا محمد علی جوہر، حکیم صاحب عالم، پنڈت نہرو، اپنی بہن، ایک شہید وطن، شرر اور سردار روپ سنگھ کی موت پر لکھے گئے مراثی۔ شمیم کرہانی کے گاندھی جی، بہادر شاہ ظفر اور احتشام حسین کی موت پر لکھے گئے مراثی۔ جگن ناتھ آزاد کے اپنی رفیقۂ حیات، پنڈت نہرو، رفیع احمد قدوائی، حاتم سالک اور ابوالکلام آزاد کی موت پر لکھے گئے مراثی۔

الغرض شخصی مرثیہ نے اردو ادب میں اگرچہ سست رفتاری کے ساتھ ارتقا پایا لیکن اکیسویں صدی کے آتے آتے اس صنف نے ایک ایسے تناور درخت کی شکل اختیار کی جو سرسبز برگ و بار سے سرشار ہے۔

■

Nusrat Nabi
Asst Prof. Govt Women College
M A Road, Srinagar (J&K)

اردو میں انگریزی منظوم تراجم کی روایت

اسد عمران

ویسے تو منظوم ترجموں کا آغاز اردو ادب کے آغاز کے ساتھ ہی ہو چکا تھا۔ابتدأ فارسی، سنسکرت اور دیگر علاقائی زبانوں سے منظوم ترجمے کیے گئے لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں انگریزی ادب سے متعدد منظوم ترجمے کیے گئے اور بیسویں صدی کے ابتدائی تیس برسوں میں بے شمار منظوم ترجمے منظر عام پر آئے۔اردو میں انگریزی سے منظوم ترجموں کی اولین کوشش آزاد اور حالی نے کی۔ انھوں نے انجمن پنجاب کی سرکردگی میں اردو شاعری کی اصلاحی تحریک چلائی اور اردو شاعری سے منظوم ترجموں کا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ خود بھی منظوم ترجموں کی بہترین کوششیں کیں۔آزاد اور حالی انگریزی بہت کم جانتے تھے لیکن انگریز پروفیسروں سے برابر ملتے رہتے تھے اور تبادلۂ خیالات کرتے رہتے تھے۔آزاد نے 'معرفت الٰہی'، 'بڈھا باپ' اور 'اولوالعزمی کے لیے کوئی سد راہ نہیں' جیسی نظمیں انگریزی نظموں کے انداز پر لکھیں۔یہ بالکل انگریزی نظموں کا ترجمہ نہیں بلکہ انگریزی مطالب کو اردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔مولانا حالی نے 'زمزمۂ قیصری'، 'تنہائی کا خیال' اور 'جواں مردی کا کام' وغیرہ نظمیں انگریزی شاعری کے خیالات و مطالبات سے متاثر ہو کر لکھیں۔گویا آزاد اور حالی کی ان نظموں کو مثالی اور معیاری ترجمے قرار نہیں دیا جا سکتا۔البتہ ان کوششوں اور کاوشوں کو انگریزی منظوم کے ترجموں کی روایت میں خصوصی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ اردو شاعری کو انھوں نے ایک نیا راستہ اور نئی سوچ عطا کی۔یہ بات قابل غور ہے کہ ان قدما کے سامنے نمونے نہ تھے اور ایک ایسی زبان کی شاعری سے منظوم ترجمے کیے جس سے وہ خود بھی اچھی طرح واقف نہ تھے، یقیناً ایک مشکل کام تھا۔اس طرح ترجموں میں خامیوں کا پایا جانا ایک فطری عمل ہے۔ان کی کوششوں کو بنیادی اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ انھوں نے بالکل ایک نیا تجربہ کیا تھا۔

اردو میں انگریزی سے منظوم ترجموں کی باضابطہ کوشش کے طور پر غلام مولیٰ عرف قلق میرٹھی کا مجموعہ 'جواہر منظوم' 1864 میں منظر عام آیا۔جواہر منظوم کو انگریزی شاعری کے اردو منظوم ترجموں کا پہلا مجموعہ قرار دیا گیا ہے۔یہ مجموعہ ایسی انگریزی نظموں کے ترجمے پر مشتمل ہے جو سرکاری مدارس کے تعلیمی نصاب میں شامل تھیں۔اس طرح منتخب انگریزی نظموں کے حصہ اول کو قلق میرٹھی نے ترجمے کے ذریعے اردو میں منتقل کیا۔منتخب انگریزی نظموں کے حصہ دوم کا منظوم ترجمہ بانکے لال بہاری نے 'گوہر شب تاب' کے نام سے کیا جو مطبع نول کشور، لکھنؤ سے 1869 میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل بیس نظموں کے ترجمے شامل ہیں۔ان ترجموں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے تاہم بعض مقامات پر فارسی آمیز اردو بھی استعمال کی گئی ہے۔

1872 میں عربی و فارسی ہائی اسکول کے مدرس رحیم اللہ نے انگریزی کتاب ''منتخب انگریزی نظموں کا مجموعہ حصہ دوم کا' منظوم ترجمہ' کے عنوان سے ترجمہ کیا جو مطبع الٰہی، آگرہ سے شائع ہوا۔قلق میرٹھی، بانکے لال بہاری اور رحیم اللہ کے ترجموں میں لطافت اور حسن ذوق مفقود ہے۔ادب اور شاعری کے بلند معیاروں پر یہ تراجم کھرے نہیں اترتے اور ان میں بہت خامیاں نظر آتی ہیں۔تاہم ان کے تراجم کا مطالعہ انگریزی منظوم ترجمہ کے ارتقا میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

انیسویں صدی کے آخر تک انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں میں خاصی دل چسپی لی جانے لگی اور ان کے معیار اور فنی خصوصیات کی طرف خاص توجہ دی جانے لگی۔اس طرح شاعر اس فن کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں دل چسپی لینے لگے۔ اب یہ کام انگریزی نصاب کی کتابوں میں شامل نظموں کے منظوم ترجموں تک ہی محدود نہ رہا بلکہ انگریزی شہ پاروں کو بھی اردو میں منتقل کرنے کی رسم بھی چل پڑی۔

مولانا اسماعیل میرٹھی کی نظموں کا مجموعہ 'ریزۂ جواہر' 1880 میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں چھ انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے ہیں۔'کیڑا'، 'ایک قانع مفلس'، 'موت کی گھڑی'، 'فادر ولیم'، ''حب وطن' اور 'انسان کی خام خیالی' انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے اور بھی انگریزی نظموں کے ترجمے کیے ہیں جن میں بیش تر بچوں کے لیے کیے گئے ہیں۔اسماعیل میرٹھی کے منظوم ترجموں کو معیاری اور کامیاب قرار دیا گیا ہے کیوں کہ منظوم ترجمے میں جن باتوں کا لحاظ ضروری ہے، اکثر و بیش تر ان کے ترجموں میں پائی جاتی ہیں۔ان کے ترجموں کی کامیابی کا راز ان کی حسن کاری اور صنعت گری ہے نیز انھوں نے انگریزی خیالات کو بڑے دل کش اور سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔الغرض ان تمام خوبیوں اور خامیوں کے باوجود اسماعیل میرٹھی کے ترجمے منظوم ترجموں کی عمدہ مثال ہیں اور منظوم ترجموں کی روایت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر تک انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں میں خاصی دل چسپی لی جانے لگی اور ان کے معیار اور فنی خصوصیات کی طرف خاص توجہ دی جانے لگی۔اس طرح شاعر اس فن کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں دل چسپی لینے لگے۔اب یہ کام انگریزی نصاب کی کتابوں میں شامل نظموں کے منظوم ترجموں تک ہی محدود نہ رہا بلکہ انگریزی شہ پاروں کو بھی اردو میں منتقل کرنے کی

رسم بھی چل پڑی۔

نظم طباطبائی کو انگریزی منظوم ترجموں کی روایت میں ایک ممتاز اہمیت حاصل ہے۔ان کے آزاد منظوم ترجمے 'گورغریباں' کو منظوم ترجمے کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔نظم طبا طبائی اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔نظم طباطبائی نے انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کی طرف خاص توجہ دی اور انگریزی سے منظوم ترجموں کی ایک مستحکم روایت قائم کی۔گرے کی نظم elegy written in the courtyard کا نثری ترجمہ مولوی غلام الثقلین نے انجمن ترقی اردو،علی گڑھ کی فرمائش پر کیا اور اسے نظم کی شکل نظم طباطبائی نے مولوی عزیز مرزا (رکن انجمن ترقی اردو،علی گڑھ) کی فرمائش پر عطا کی۔یہ منظوم ترجمہ پہلی مرتبہ رسالہ 'دل گداز' میں جولائی 1897 میں شائع کیا اور عبدالحلیم شرر نے اس پر تعارفی نوٹ لکھا۔نظم طباطبائی نے بڑی ریاضت اور محنت سے یہ ترجمہ کیا اور اپنی خوبیوں اور جدت طرازی کی وجہ سے یہ ترجمہ بے حد مقبول ہوا۔'گورغریباں' انگریزی صنف شاعری اسٹنزا (stanza) کی ہیئت میں لکھی گئی۔اس نظم کی بہ دولت اردو شاعری کو نئی صنف،صنف شاعری (یعنی اسٹنزا) ہاتھ آئی۔گویا نظم طباطبائی کی بہ دولت اردو شاعری کو ایک نئی صنف عطا ہوئی اور اس جدت کے بانی ہونے کا شرف بھی انھیں حاصل ہوا۔'گورغریباں' کے علاوہ نظم طباطبائی کے منظوم ترجمے بے حد مقبول ہوئے اور ان سے منظوم ترجموں کی روایت کو زبردست تقویت ملی۔اس دور میں پروفیسر سید محمد عبدالغفور شہباز نے بھی کامیاب اور معیاری منظوم ترجمے کیے ہیں۔شہباز اردو،انگریزی،بنگلہ،عربی اور فارسی سے بہ خوبی واقف تھے اور انگریزی ادب سے دل چسپی رکھتے تھے۔شہباز شاعر اور نثر نگار دونوں تھے اور انھوں نے انگریزی کی بعض مشہور ومعروف نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔مترجم کی حیثیت سے شہباز کو اردو شاعری میں اہم مقام حاصل ہے۔'جوگی'، 'آبشار'، 'لوڈور' اور ابراہم بن ادہم' ان کے مشہور منظوم ترجمے ہیں۔

انگریزی منظوم ترجموں کی روایت میں عبدالحلیم شرر کو ممتاز مقام حاصل ہے۔انھوں نے انگریزی سے نہ صرف منظوم ترجمے کیے بلکہ منظوم ترجموں کی روایت کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔شرر نے اردو شاعری میں ہیئتی سطح پر ایک نئی صنف متعارف کرائی جس کے لیے مولوی عبدالحق نے نظم معریٰ (Blank verse) کا نام تجویز کیا۔اس طرح شرر نے جدت اسلوب اور جدت ہیئت کے ذریعے اردو نظم کے دامن کو وسعت دی۔الغرض شرر نے اپنی کوششوں اور کاوشوں سے نظم معریٰ کو نہ صرف اردو میں متعارف کیا بلکہ اسے شاعری کی ایک اہم صنف کا درجہ عطا کیا۔اس کے علاوہ شرر نے رسالہ دل گداز میں انگریزی منظوم تراجم کو شائع کر کے اس روایت کو تقویت دی۔شرر کے ہم عصر مترجمین میں نادر علی خاں عباسی کاکوروی، منشی نوبت رائے نظر،منشی ارتضٰی علی شرر،مولانا ظفر علی خاں،درگا سہائے سرور،بدرالزماں بدر،طالب بنارسی،سید محمد ضامن،حافظ محمد یعقوب اوج گیاوی،غلام بھیک نیرنگ اور مولوی فخرالدین احمد سفیر کاکوروی نے دل کش

اور عمدہ منظوم ترجمے کیے اور بلند پایہ مقام حاصل کیا۔ان کے منظوم ترجموں میں 'گرمیٔ عشق' (ارتضٰی علی شرر) 'گھنٹہ نہیں بجے گا'، 'گزرے زمانے کی یاد'، 'حسن کامل'، 'شاعر کا دل' (نادر علی خاں عباسی کاکوروی) 'ندی کا راگ'، 'دھوپ اور چاندنی'، 'اخبار کا چندہ'، 'تاج دار دکن' (مولانا ظفر علی خاں) 'سال گزشتہ'، 'اندھی پھول والی کا گیت'، 'کوئل' (سرور جہاں آبادی) زندگی'، 'خوشی'، 'چھوٹے تارے' (حافظ محمد یعقوب اوج گیاوی) 'پہلا سفید بال' (طالب بنارسی) 'غریب الوطن'، 'طوطا'، 'کیسا بلا نکا'، 'عندلیب اور کرمک شب تاب' (بدرالزماں بدر) 'جان شیریں'، 'مقصود الفت' (غلام بھیک نیرنگ) 'وقت'، 'زندہ دلی'، 'راہب صحرانشیں' (سید محمد ضامن کنتوروی) 'نغمہ صحرائی'، 'حسین ساگر'، 'نوائے آوارگی' (مولوی فخرالدین احمد سفیر کاکوروی) وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔عبدالحلیم شرر اور سید عبدالقادر نے 'دل گداز' اور 'مخزن' کے نام سے رسالے نکالے اور ان ارسالوں میں اکثر و بیش تر انگریزی منظوم تراجم کو شائع کیا۔

اردو کے عظیم شاعر علامہ اقبال نے بیسویں صدی کے آغاز سے اچھے اور عمدہ منظوم ترجمے کیے۔انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں منظوم ترجموں کی طرف توجہ دی۔علامہ اقبال نے انگریزی زبان اور ادب کا بغائر مطالعہ کیا تھا۔انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں مغربی شاعروں اور فلسفیوں جیسے ٹینی سن، گوئٹے، ایمرسن، ہیگل اور ورڈز ورتھ سے بھر پور استفادہ کیا۔علامہ اقبال نے اس بات کا خود اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے ہیگل، گوئٹے، غالب، بیدل اور ورڈزورتھ سے بہت استفادہ کیا ہے۔علامہ اقبال نے انگریزی شاعری کے منظوم ترجمے بھی کیے اور ماخوذ نظمیں بھی لکھیں۔علامہ اقبال نے اپنے ترجموں میں آزادی سے کام لیا اور عموماً آزاد ترجمے کیے۔

اقبال کی نظم 'ماں کا خواب'، ولیم بارنس کی نظم 'the Mother's dream' کا پابند ترجمہ ہے۔یہ نہ صرف اقبال کا مکمل اور کامیاب ترجمہ ہے بلکہ انگریزی سے اردو میں جو کامیاب منظوم ترجمے ہوئے ہیں،اس فہرست میں یہ بھی عمدہ اور معیاری ترجمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔اقبال نے لانگ فیلو کی نظم Day break کا آزاد منظوم ترجمہ 'پیام صبح' کے نام سے کیا اور ایمرسن کی نظم 'Good bay' کا ترجمہ 'رخصت اے بزم جہاں' کے نام سے کیا ہے۔ان کی نظم 'ایک پرندہ اور جگنو' ولیم کوپر کی انگریزی نظم ''The nightingle and the golw-warm'' کا آزاد ترجمہ ہے اور ان کی نظم 'ہمدردی' بھی اسی نظم سے ماخوذ ہے۔'ایک پہاڑ اور گلہری'، 'ایک مکڑا اور مکھی'، 'بچے کی دعا'، 'عشق اور موت'، 'پرندے کی فریاد'، 'ابر کوہسار'، 'گورستان شاہی' وغیرہ علامہ اقبال کے بہترین منظوم ترجمے اور ماخوذ نظمیں ہیں۔علامہ اقبال نے انگریزی

شاعری سے جو اثرات قبول کیے اور منظوم ترجموں کی صورت میں جو نیا رنگ و آہنگ اردو شاعری کو عطا کیا اس سے دوسرے شاعر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

حسرت موہانی کا شمار اردو غزل کے بہترین شعرا میں ہوتا ہے۔انھوں نے کامیاب منظوم ترجمے کیے۔ 'موسم بہار کا آخری پھول' اور 'ترانہ محبت' ان کے نہایت کامیاب اور عمدہ منظوم ترجمے ہیں۔محمد سیف الدین شباب نے سروجنی نائیڈو کی انگریزی نظموں کو اردو قالب عطا کیا۔شباب کے منظوم ترجمے اردو کے معیاری رسالوں میں شائع ہوئے۔ 'سوز بیوگی'، 'موت اور زندگی'، 'نغمۂ محبت'، 'ستی'، 'شرح آرزو'، 'مرغ بسمل' اور 'حسین ساگر' ان کے بہترین منظوم ترجمے ہیں۔مرزا ہادی عزیز لکھنوی نے منظوم ترجمے کے وقار کو بلند کیا او راپنی تخلیقی اور شعری صلاحیتوں سے اردو شاعری کے دامن کو مالا مال کیا۔ 'ممّی۔جون کا چاند' ان کا عمدہ منظوم ترجمہ ہے۔اس طرح ابتدائی دور کے مترجمین نے اردو شاعری میں موضوعات او رہیئتی دونوں سطحوں پر تبدیلیاں کیں اور نئے نئے خیالات و افکار سے روشناس کرایا۔گویا اردو شاعری کے فروغ اور ترقی میں اس جماعت نے اہم اور ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔

1900 سے تقریباً 1935 تک کے دور کو ترجمہ کی تاریخ کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔یہ دور انگریزی ترجموں، گیتوں اور ہندی آمیز نظموں کا دور تھا۔اس دور میں تلوک چند محروم، عظمت اللہ خاں، حامد اللہ افسر، عیسیٰ چرن صدا، مہاراج بہادر برق دہلوی، سید ابوالحسن ناطق، جعفر علی خاں اثر، محمد حسین آزاد حیدرآبادی اور دوسرے شاعروں نے منظوم ترجمے بھی کیے اور مختلف موضوعات پر نئے شعور اور نئے طرز کی نظمیں لکھیں۔عیسیٰ چرن صدا نے انگریزی شاعر جان ملٹن کی شہرۂ آفاق نظم 'Paradise lost' کا منظوم ترجمہ 'فردوس گم شدہ' کے نام سے مثنوی کی ہیئت میں کیا جو دل گداز پریس سے 1914 میں شائع ہوا۔ملٹن کی دوسری نظم 'Paradise regained' کا ترجمہ بھی صدا نے 'فردوس بازیافتہ' کے نام سے کیا جو 1922 میں منظر عام پر آیا۔صدا نے جان ملٹن کی تیسری نظم 'Samson agnostic' کا ترجمہ 'شمعون محزون' کے نام سے کیا۔اسی دور میں منشی مہاراج بہادر برق نے انگریزی نظموں کے کامیاب اردو منظوم ترجمے کیے۔برق نے انگریزی شاعر William barner کی نظم 'The mother's dream' کا منظوم ترجمہ 'مادر ناشاد کا خواب' کے عنوان سے کیا۔یہ اقبال کی نظم 'ماں کا خواب' کا ہم ترجمہ ہے۔اس کے علاوہ 'پیمان وفا'، 'پھول'، 'شہید وفا'، 'قوس قزح' اور 'ساعت مرگ' ان کے بہترین ترجمے ہیں۔

میر جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے انگریزی اور دوسری زبانوں سے متعدد ترجمے اردو زبان میں کیے۔ان کے منظوم ترجموں کا مجموعہ 'رنگ بست' کے نام سے اردو اکیڈمی لاہور سے شائع ہوا۔انھوں نے منظوم ترجموں کے ذریعے جدید نظم کو فروغ دیا۔ان کے منظوم ترجموں میں 'باغی انسان'، 'نغمۂ جسم'، 'خدائے نامعلوم'، 'کسان اور آخری وصیت' بے مقبول و مشہور ہیں۔سید ابوالحسن ناطق نے ایک انگریزی نظم کا منظوم اردو ترجمہ 'راز الفت' کے نام سے کیا جو نومبر 1908 میں رسالہ 'مخزن' میں شائع ہوا۔

تلوک چند محروم خود بھی اچھے شاعر تھے اور انھوں نے انگریزی سے اردو میں معیاری اور کامیاب منظوم ترجمے کیے۔محروم نے جو منظوم ترجمے کیے وہ تعداد کے لحاظ سے بھی زیادہ ہیں اور ان کا معیار بھی بلند ہے۔گویا ان کے منظوم ترجموں کو انگریزی منظوم ترجمہ کی روایت میں کامیاب کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔ 'بچے کا پہلا احساس'، 'غم'، 'رحم'، 'موت کا موسم'، 'زوال حسن'، 'حسرت پرواز'، 'ایام غم'، 'کیا ہے کیا'، 'بقائے محبت'، 'سپاہی کا خواب'، 'حب وطن'، 'زرم گفتاری'، 'نغمۂ آسمانی' اور 'محبت' ان کے مشہور منظوم ترجمے ہیں جو 'نکات شیکسپیئر' کے نام سے شائع ہوئے۔محروم کے بعض ترجمے اس قدر رواں اور دل کش ہیں کہ ان پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

اس عہد میں عظمت اللہ خاں نے اردو میں روایتی شاعری اور غزل کے خلاف آواز بلند کی اور انھوں نے اردو شاعری میں موضوعاتی اور ہیئتی سطح پر نئے تجربے کیے۔عظمت اللہ خاں کا مخصوص شعری رجحان انگریزی ادب کے مطالعے سے مرتب ہوا۔انگریزی شاعری میں انھوں نے لارڈ بائرن، رابرٹ براؤننگ، شیکسپیئر، ورڈز ورتھ اور تھامس ہارڈی کی مشہور نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔انھوں نے اردو میں نظم معریٰ (Blank verse) کے ترجمے بھی کیے۔عظمت اللہ خاں کے انگریزی منظوم ترجموں میں 'یونان کے جزیرے'، 'ہم سات ہیں'، 'کوئل'، 'ایک گیت کا ترجمہ' اور 'ننھا غاصب'' قابل ذکر ہیں۔باسط بسوانی نے بھی نے بھی اچھے اور عمدہ ترجمے انگریزی سے اردو میں کیے۔انھوں نے ذاتی محنت اور ریاضت سے انگریزی اور فارسی میں اچھی خاصی مہارت پیدا کرلی تھی۔شعروشاعری سے بھی دل چسپی رکھتے تھے۔ 'اسکاٹ لینڈ کی بدنصیب ملکہ'، 'حب وطن' اور 'نپولین کی موت' ان کے بہترین منظوم ترجمے ہیں۔

سید محمد حسین آزاد حیدرآبادی نے انگریزی شاعروں کی مشہور نظموں کو اردو لباس عطا کیا۔انگریزی شاعری میں انھوں نے جان شیر لے، رابرٹ برنس، لارڈ لٹن، جان لوگن، پی۔بی۔شیلی اور والٹر اسکاٹ کی نظموں سے استفادہ بھی کیا اور منظوم ترجمے اردو میں کیے۔ 'اندھی پھول بیچنے والی کا گیت'، 'فردوس بریں'، 'تیر و نغمہ'، 'ستارہ'، 'چھوٹا پودا'، 'موسم گرماں کا آخری گلاب' اور 'سویرے سونا' ان کے قابل ذکر منظوم ترجمے ہیں۔اس دور میں منور لکھنوی، مولوی شفیق، احمد عباس، حامد اللہ افسر، اندرجیت شرما اور مولانا امتیاز علی عرشی نے بھی انگریزی سے اردو منظوم ترجمے کیے۔مولانا امتیاز علی عرشی عالم دین، محقق اور شاعر تھے۔ابتدا میں تاج تخلص اور اس کے بعد عرشی اختیار کیا۔انھوں نے تقریباً تیس کتابیں مرتب کیں۔مولانا عرشی کا شمار ممتاز علما اور مشائخ میں کیا جاتا تھا۔انھوں نے کچھ انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے بھی کیے۔

اندرجیت شرما نے منظوم ترجموں کے میدان میں اہم مقام حاصل کیا۔ان کی نظمیں اور منظوم ترجمے ادبی رسالوں، زمانہ، ہمایوں، ادبی دنیا اور رہنمائے تعلیم وغیرہ میں شامل ہوتا تھا۔ ان کا مجموعۂ کلام 'نیرنگ فطرت' 1931 میں شائع ہوا جس میں ایک حصہ منظوم ترجموں پر مشتمل ہے۔ان کے منظوم ترجموں میں 'زندگی کا راگ'، 'لارڈ الین کی دختر'، 'اندھا لڑکا'، 'موسم بہار کا آخری پھول' اور 'گھنٹہ نہیں بجے گا' لائق ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے بعد امیر چند بہار، محمد فضل الرحمان، بشیر احمد طاہر، ارشد صدیقی، سید شاکر علی جعفری، سعید الدین خاں سعید، سید عبدالولی قادری، دھرم سروپ، سید احمد کبیر، امیر احمد انصاری، رسا ہمدانی، اختر

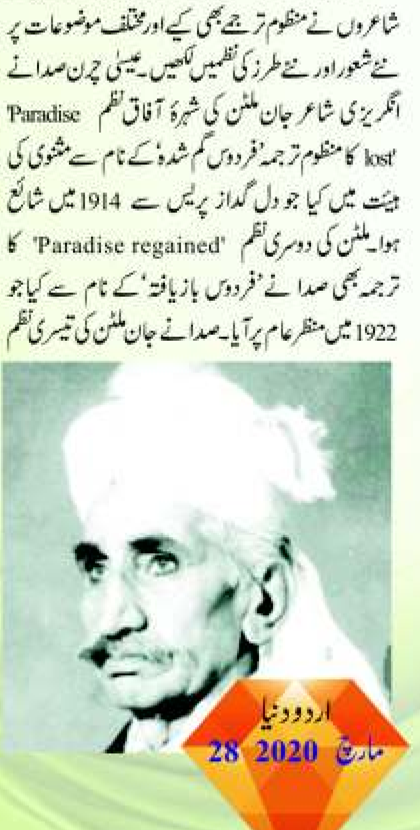

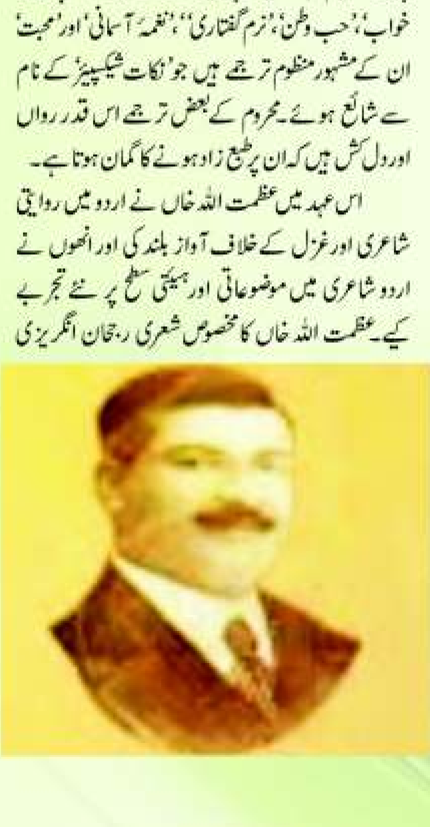

عظیم آبادی، فراق گورکھپوری، سید راحت حسین، دھرم سروپ اور دیگر شعرا نے ورڈز ورتھ، شیلی، کیٹس، کالرج، لارڈ بائرن، سروجنی نائیڈو، شیکسپیئر اور دوسرے انگریزی شاعروں کی مشہور نظموں کے متعدد ترجمے کیے۔

سعید الدین خاں سعید نے اردو نظموں کا منظوم انگریزی میں ترجمہ کیا اور انگریزی نظموں کو اردو پیرہن عطا کیا۔ انھوں نے لگ بھگ بیس انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا جو'ساز مغرب'میں شامل ہیں۔ ان کی ایک نظم بہ عنوان کیسا بلا تھا کیا۔ Fellicia hemans کی مشہور نظم Casablanca کا کامیاب ترجمہ ہے۔ جس میں بلا کا زور بیان ہے۔

محمد فضل الرحمان نے نثری اور منظوم ترجمے کیے۔ انھوں نے چارلس ڈکنس کے شہرۂ آفاق ناول 'Tale of two cities' کا اردو ترجمہ'دوشہروں کی کہانی' کے عنوان سے کیا گوئٹے کے منظوم ڈرامے کا منظوم ترجمہ'ہیلینا' کے عنوان سے کیا۔ فضل الرحمان کے منظوم ترجمے اردو شعری تراجم میں اہمیت کے حامل ہیں۔ الگزنڈر پوپ کی مشہور نظم 'Ode on Solitude' کے اردو میں لگ بھگ چھے منظوم ترجمے ہوئے۔ ان تمام تراجم میں محمد فضل الرحمان کے ترجمہ'خانہ نشیں'کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ انگریزی منظوم ترجموں کی روایت میں محمد فضل الرحمان کا شمار صف اول کے مترجمین میں ہوتا ہے۔

عزیز احمد جلیلی خود بھی شاعر تھے اور انھوں نے انگریزی ناولوں، افسانوں اور نظموں کے ترجمے بھی کیے لیکن انھیں انگریزی نظموں کے منظوم ترجموں میں اچھا ملکہ حاصل ہے۔ عزیز احمد نے عموماً آزاد تخلیقی ترجمے کیے یعنی اصل نظم کے مواد و مفہوم اور مرکزی خیال کو ایسا پیکر دیا جو خوب صورت بھی ہو اور دل فریب بھی۔ انھوں نے تھامس مورے، رابرٹ برنس، ورڈز ورتھ، شیلی اور سروجنی نائیڈو کی نظموں کے عمدہ منظوم ترجمے کیے۔'قوس قزح' اور'زندگی'ان کے بہترین منظوم ترجمے ہیں۔

بشیر احمد طاہر نے اردو میں مختصر افسانے لکھے اور انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے۔ بشیر احمد طاہر کے منظوم ترجموں میں لفظی ترجمے کے بجائے اصل نظم کی روح کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔'بلبل'،'سمندر'،'پیغام حیات'اور'میرے بعد'ان کے مشہور ترجمے ہیں۔

دھرم سروپ کا نام انگریزی منظوم ترجموں کی فہرست میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ انھوں نے اردو میں غزلیں اور نظمیں لکھیں اور معیاری منظوم ترجمے بھی کیے۔ سوامی وویکانند کی مشہور نظم 'Songs of sanyasi' کا منظوم ترجمہ'نعرۂ سنیاسی'کے عنوان سے کیا۔ انھوں نے ورڈز ورتھ، کیٹس، شیلی، جان ڈن، بائرن، جارج ہربرٹ، ولیم بلیک، بین جانسن اور شیکسپیئر کی لگ بھگ سو نظموں کے منظوم ترجمے اردو میں کیے۔ یکے بعد دیگرے ان کے منظوم ترجموں کے دو مجموعے'ایک مالی دو گیت'اور'صدائے بازگشت'شائع ہوئے۔'بت رعنائی'،'جوانی اور بڑھاپا'،'نشاط نشست'،'جمال فطرت''،'میری نئی دنیا'،'واپسی'،'فقیر کی صدا'،'خلد ارضی'،'لوہے سے خطاب'،'گل حیات'،'ظہور جمال'،'راز ہست'،'ان کے کامیاب اور معیاری ترجمے ہیں۔ انھوں نے اپنے ترجموں میں اصل اسپرٹ کو بڑے جان دار اور دل کش انداز سے ترجموں میں سمودیا ہے۔ اردو میں انگریزی منظوم ترجموں کی تاریخ میں دھرم سروپ کا نام صف اول کے مترجمین میں آتا ہے۔

منظوم ترجموں کی روایت میں شاکر علی جعفری کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ انھوں نے اپنے منظوم ترجموں میں الفاظ کے بجائے الفاظ میں مضمر معنی کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کے چند ترجمے'پھول ہی پھول'،'ساز مقدس'،'میری برات اور پپیہا'، عمدہ اور معیاری ہیں۔

سید عبدالولی قادری اردو اور انگریزی زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے ورڈز ورتھ اور شیکسپیئر کی نظموں کے منظوم ترجمے بھی کیے۔'پھول'،'اکیلی'اور'قوس قزح'ان کے مشہور ترجمے ہیں۔

اس دور میں ارشد صدیقی اور امیر چند بہار نے بھی کافی اچھے منظوم ترجمے کیے۔ ارشد صدیقی کے منظوم ترجموں کا مجموعہ'پس عکس خیال'کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں انگریزی کے مشہور شعرا کی پندرہ نظموں کے ترجمے اردو میں کیے گئے ہیں۔ ارشد صدیقی نے زیادہ تر لفظی ترجمے کیے اور کچھ ایسے بہترین ترجمے ہیں جن میں اصل نظم کی اسپرٹ کو پورے طور پر برقرار رکھا ہے۔ یہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور فنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔'خوابوں کا بازار'،'تشویش'،'تیر و نغمہ'،'دھنک'،'فطرت'،'معصوم'،'سنہری پھول'اور'موجودہ لمحہ'ان کے عمدہ ترجمے ہیں۔

امیر چند بہار نے تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی مگر منظوم ترجمہ میں اپنی صلاحیتوں کا اچھا ثبوت دیا۔'نسیم مغرب' (انجمن ترقی اردو [ہند] علی گڑھ 1963) میں جان ملٹن، شیکسپیئر، شیلی، کیٹس، ورڈز ورتھ، پوپ تھامس گرے، لارڈ ٹینی سن، میتھو آرنلڈ اور سروجنی نائیڈو وغیرہ کی چھبیس انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ شامل ہے۔ بہار نے انگریزی نظموں کی اصل روح کو اپنے اندر جذب کیا انھیں اردو کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے ان کے ترجموں میں تخلیقی شان پیدا ہوگئی ہے۔ ان کے ترجمے'اندھا ہو جانے پر'،'کسی کی یاد'،'گور غریباں'،'دنیا'،'حسن کامل'،'جوانی اور بڑھاپا'،'احساس اور باد مغرب سے خطاب' قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر حسن الدین خاں صاحب نے انگریزی شاعری کے تقریباً ایک ہزار منظوم اردو ترجموں کا مجموعہ'ساز مغرب'دس جلدوں میں ولا اکیڈمی، حیدرآباد سے شائع کروایا۔

جدید اردو شاعری کے ارتقا میں انگریزی شاعروں کے منظوم ترجموں نے اہم کردار ادا کیا۔ منظوم ترجموں کی بہ دولت اردو شاعری میں نئے تجربات اور نئے خیالات سے مالا مال ہوئی اور نئے انداز کی نظمیں لکھی جانے لگیں۔ موضوعات کے محدود دائرے سے نکل کر تمام زندگی کا احاطہ کرنا، تخیل کی بلند پروازی، قومی شعور کی بیداری، وطن پرستی، انسان دوستی، مناظر قدرت کی عکاسی، آفاقیت وغیرہ، یہ سب انگریزی سے منظوم ترجموں کی دین ہے۔ چنانچہ انگریزی سے منظوم ترجموں کی بہ دولت اردو شاعری میں موضوعاتی اور فنی دونوں سطحوں پر غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ نئی شعری اصناف وجود میں آئیں۔ خصوصاً اردو شاعری میں نظم کو جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی وہ انگریزی سے کیے گئے منظوم ترجموں کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ البتہ جدید اردو شاعری پر انگریزی منظوم ترجموں کے دوررس اور اَن مِٹ اثرات مرتب ہوئے اور انگریزی منظوم ترجموں نے جدید اردو شاعری کے فروغ میں غیر معمولی اور نمایاں کردار ادا کیا۔ شعر و ادب کا نیا رنگ و آہنگ ایک لحاظ سے ہم دیکھیں تو انگریزی سے ہی لیا۔ اس میں بہت کچھ نو آبادیاتی استعماری حکومت کے نظام تعلیم اور غالب قوم کی حیثیت سے ان کے فنی و تمدنی مزاج کے اثرات بھی کارفرما ہے۔ بہر کیف اردو میں منظوم و منثور ترجمہ نگاری کی یہ شان دار روایت ہمارے علمی ذوق اور وسعت نظری و کشادہ قلبی کا اہم اشاریہ اور علامت بھی ہے۔

منابع

حسن الدین احمد: انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ولا اکیڈمی، حیدرآباد 1984

قمر رئیس [مرتب] ترجمہ کا فن اور روایت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ 2004

ثاقب صدیقی: ترجمہ نگاری ضرورت، روایت اور مسائل] سید بک ڈپو، جامعہ اردو، علی گڑھ 2006

Asad Imran
Assistant Professor :
Department of Urdu
GDC Poonch - 185111 (J&K)
Mobile: 9906223668
Email: asadimran207@gmail.com

ترجمہ سے ترجمانی تک

امیر حمزہ

’وعلم آدم الاسماء کلھا‘ دنیا کے وجود میں آنے سے دنیاوی زبان وجود میں آئی جس کی دلیل نظریۂ اسلام میں مذکورہ بالا آیت ہے۔ کیونکہ اس آیت سے یہی مقصود ہے کہ جب آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجا جارہا تھا تب خدا نے آدم کو دنیاوی زبان سکھائی تھی۔ دنیا میں موجود اشیا کے نام بتائے تھے جیسے سورج، دھوپ، آگ، پانی، ہوا کے نام۔ کیا انھوں نے خود سے رکھ لیے؟ یا ہمارے دیے ہوئے ہیں؟ یا خدا نے انھیں ان سب عناصر کے لیے یہی الفاظ سکھائے تھے؟ یا وہ کچھ اور الفاظ تھے اور اب ہم انھیں ان الفاظ سے جانتے ہیں۔ گویا الفاظ ترجمان ہیں اشکال کو ہمارے اذہان میں منتقل کرنے کے لیے۔ الغرض زندگی بسر کرنے کے لیے جن اشیا کی اس وقت ضرورت تھی وہی اشیا اب بھی ہیں، ساتھ ہی انسان اپنی فکروتدبر سے وسائل کی ایک وسیع دنیا ایجاد کرتا چلا گیا جن کے نام خدا نے ہمیں نہیں سکھلائے بلکہ انسانوں نے اپنی خداداد صلاحیت سے ایجاد کیے اور ان کی شناخت کے الفاظ بدلتے بھی رہے۔ یعنی اشیا اپنی اصل جگہ پر قائم و دائم رہتی ہیں اور وہ اپنی شناخت لفظوں سے کراتی رہتی ہیں، جو یقیناً اُس شے کا ترجمہ ہوتا ہے جس پر ہم مرکوز ہورہے ہیں۔ اس کے زیر اثر ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ تراجم سے حقیقت بدل نہیں جاتی بلکہ حقیقت و مادہ ایک ہی ہوتا ہے اور اس مادہ کی شناخت کے الفاظ بدلتے رہتے ہیں۔ دنیا میں لاکھوں بولیاں پیدا ہوئیں اور اپنا وجود کھوتی رہیں لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ زبان کے معدوم ہوجانے سے اشیا، افعال وحرکات اور صفات بھی معدوم ہوگئیں بلکہ وہ اپنی شناخت کا دائرہ مزید سے مزید تر بڑھاتی چلی گئیں اور تمام پرانے الفاظ کے ساتھ ایک نئے لفظ کا چہرہ اپنے لیے سامنے لے آئیں جو اپنے معنوی وجود کے ساتھ لغت میں رقم ہوتے چلے گئے۔

کچھ اجناس ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے چند زبانیں بہت ہی مالدار ہوتی ہیں اور کچھ ایسی، جن کے لیے فقر کی بو آتی ہے جیسے ہوا، تلوار اور گھوڑے کے لیے عربی میں درجنوں الفاظ ہیں جبکہ موجودہ وقت میں انگلش جیسی بڑی زبان اس سے عاری نظر آتی ہے۔ اس تعلق سے ایک دلچسپ بات احمد دین نے اپنی کتاب ’سرگزشت الفاظ‘ میں لکھی ہے کہ ”نیوزی لینڈ کی ایک قوم کی بابت ہم نے کہیں پڑھا ہے کہ ان کی زبان میں خدا کے لیے کوئی لفظ نہیں، لیکن ماں کے پیٹ میں بچّے کو مار ڈالنے کے لیے ایک طریق کے لیے ایک لفظ ہے اور ہمیں ایک واقف کار انگریزی ادیب کی زبانی جو ’وان ڈیمنز لینڈ‘ میں دیر تک سکونت پذیر رہا اس سے معلوم ہوا کہ اس جزیرہ کی زبان میں قتل انسان کے لیے چار الفاظ ہیں۔ ایک تو باپ کے بیٹے کو مار ڈالنے کے لیے دوسرا بیٹے کے باپ کو مار ڈالنے کے لیے اور علیٰ ہذا القیاس قتل کی دیگر قسمیں ہیں ان میں سے ایک میں بھی اخلاقی ملامت یا قتل مستلزم سزا اور قتل عمد میں جو گہرا فرق ہے ان کا نشان تک نہیں۔ لطف یہ ہے کہ اس زبان میں جو اظہار بغض کے غایت درجہ کو بیان کرنے میں ایسی مالا مال ہے محبت کے لیے کوئی لفظ مطلقاً نہیں ہے۔“ (سرگذشت الفاظ، احمد دین، ص 84)

اس کے برعکس ہماری اردو شاعری میں محبت کے لیے الفاظ کی کمی نظر نہیں آئے گی، اس لیے کوئی ضروری نہیں کہ عالمی طور پر پھیلی ہوئی زبان اپنے اندر الفاظ میں بھی وسعت رکھتی ہو۔ کسی بھی زبان کا کوئی بھی لفظ اچانک معنویاتی محل لے کر نمودار نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے علاقۂ استعمال میں ثقافتی وتہذیبی اثرات وتشخص اور لسانیاتی خصوصیات کے ساتھ بہت ہی عام لفظ ہوتا ہے جو دوسری زبانوں میں بھی مستعمل ہونے لگتا ہے جیسے کتاب۔ یا پھر کوئی لفظ بہت ہی خاص ہوتا ہے جو اپنی ہی زبان میں استعمال کو ترس جاتا ہے۔ ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو ہماری اردو زبان میں ہی متروک ہوتے جارہے ہیں۔

کسی بھی زبان میں دو قسم کے الفاظ موجود ہوتے ہیں۔ اگر ان کا تعلق صفات سے ہو تو پھر ترجمہ میں ایک گونہ پریشانی آتی ہے جیسے فصلیں لہلہا رہی ہیں میں لہلہانا کی جو کیفیت ہمارے ذہن میں ابھرتی ہے ترجمہ میں ممکن ہو اس سے بھی اچھا لفظ استعمال ہو لیکن اس میں فصلوں کا جو شباب پوشیدہ ہے ضروری نہیں کہ وہ ترجمہ میں بھی حاصل ہوجائے یا ترجمہ کی زبان میں لہلہانے کے لیے جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہ لفظ مترجم کو پسند آجائے یا پھر وہ اس کے ہم معنی لفظ استعمال کر جائے۔ اگر لفظ کا تعلق اسماء سے ہو تو متبادل لفظ استعمال کیا جاتا ہے جیسے درخت کے لیے تقریباً ہر زبان میں متبادل لفظ ہیں یا پھر اُس شے کے ساتھ اسی لفظ کو اپنی زبان کا حصہ بنا لیا جاتا ہے جیسے نیم کا

پیڑ میں نیم کے لیے کئی زبانوں میں یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ساتھ ہی کوئی فعل ہے جس کے لیے کئی الفاظ استعمال ہوتے ہیں لیکن استعمال میں فرق کا خیال رکھا جاتا ہے. جیسے قتل، ہتیا اور مرڈر ایک ہی فعل کے لیے ہمارے یہاں روز مرہ کی زبان میں مذکورہ تینوں الفاظ استعمال ہوتے ہیں لیکن جانور کا مرڈر ہوا ہے استعمال نہیں ہوتا جبکہ انسان کے ساتھ تینوں الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔

یہ بات تو تھی کسی بھی زبان میں ایک عام مفرد لفظ کے استعمال کی لیکن جب کوئی بھی زبان اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لیتی ہے کہ وہ محاورات کو جنم دینے لگے اور شعر و ادب تخلیق کرنے لگے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس زبان نے اپنے اندر بہت ہی زیادہ درک حاصل کر لیا ہے کیونکہ اعلیٰ زبان کی شناخت ہی اس کی شاعری ہوتی ہے۔ پھر ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ بھی اعلیٰ معیار کا متقاضی ہوتا ہے۔ بقول کسی ناقد کے ”مترجم اس کی صورت کو بدل کر اس میں ایک نئی روح ڈالتا ہے“ لیکن میرے بقول ”مترجم چاہتا ہے کہ میں اس کے جسم کو تبدیل کروں اور اس میں وہی روح باقی رکھوں جو اس کی اپنی اصلی زبان میں ہے“۔ یہ صرف ادبیات سے متعلق ہی ہے دیگر سماجی و سائنسی علوم میں مترجم معلومات واضح انداز میں پیش کرنے کی کوشش میں رہتا ہے، اس صاف ستھری زبان میں فلسفہ اور پیچیدگی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کہیں کہیں تاریخیں فسانہ کی شکل میں لکھی گئی ہیں جہاں بہادری کے جملے داستانوں کی طرح رقم ہوئے ہیں اور بادشاہ کی تعریف قصیدوں کی طرح کی گئی ہے تو ایسے میں اصل زبان سے انگریزی میں جو تراجم ہوئے وہ صحافتی تراجم ہوئے۔ جس میں صرف اصل واقعہ کو اخذ کیا گیا، باقی کو اپنے ترجمے میں شامل نہیں کیا گیا جس کو ہم تاریخ کو ملیامیٹ کرنے کا نام بھی دیتے ہیں، کیونکہ بنیادی کتابوں میں جس بہادری کی کیفیت اور لڑائی کی جو منظر کشی کی گئی ہے وہ تراجم میں مفقود نظر آتی ہے اس وجہ سے کہ انگریزی زبان جس سادگی کے لیے جانی پہچانی جاتی ہے وہاں حسن تعلیل اور مبالغہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ سماجی، سائنسی و تاریخی علوم کے تراجم کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کے لیے صرف اتنی ضرورت ہوتی ہے کہ مترجم ان علوم کی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتا ہو اور اس علم سے متعلق اصطلاحات کے استعمال پر دونوں زبانوں پر قادر ہو۔ اگر ترجمہ کی جانے والی زبان میں اصطلاحات کا فقدان ہو تو پھر اصطلاحات یا تو اصلی زبان سے ہو بہو لائی جائے گی یا پھر اسی نسل کی زبان میں دیکھیں گے کہ وہاں اس اصطلاح کے لیے کیا استعمال ہوتا ہے جو ترجمہ کی جانے والی زبان میں بھی اجنبیت کا شکار نہ ہو۔ مطلب ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہوں۔ لیکن ادب کے ترجمے میں مترجم ان تمام کے ساتھ اصل زبان کے سماجی، ثقافتی و تہذیبی معاملات سے بھی باخبر ہو جو تلمیحات و اشارات کو بھی سمجھ سکے۔ یہی نہیں بلکہ اس لفظ کے استعمال سے انسان کی پیشانی میں جو خوشی، ناگواری، حیرت و تردد کی کیفیت آتی ہے جو لفظ کے معنی کو کسی حد تک واضح کر دیتی ہے اس سے بھی واقف ہو مز شاعری میں ایک ہی لفظ سے کئی معانی پیش کیے جاتے ہیں اس کا بھی علم ہو۔ اگر ترجمہ میں ایسا ممکن ہو تو اچھی بات ہے ورنہ شاعر کے معنی مراد کی ادائیگی پر مترجم قدرت رکھتا ہی ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر ہم لفظ کے تمام معانی سے واقف ہوتے ہیں لیکن لفظ جس طرح اپنے ساتھی لفظ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اس سے بھی واقفیت ضروری ہو ورنہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کو بیان پر قدرت نہیں۔ جیسے شاید و باید کے لیے کبھی کبھار کا استعمال ہوتا ہے یہ دونوں لفظ لازم و ملزوم کی حیثیت سے ہیں لیکن پہلے میں دونوں لفظ معنی دار ہیں جبکہ دوسرے میں کبھی معنی دار لفظ ہے اور کبھار مہمل ہے جو کبھی تنہا استعمال نہیں ہو سکتا۔ ایسے مہمل الفاظ ہر زبان میں ہوتے ہیں اور ادب اطفال میں کثیر تعداد میں مہمل الفاظ کا استعمال ہوتا ہے جو بچوں کی سماعت کو اچھے لگتے ہیں اور معنی سے دور ہوتے ہیں۔

تراجم میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ مترجم زبان سے تو واقف ہوتا ہے لیکن اس زبان کی صوتی خصوصیت سے قدرے ناواقف ہوتا ہے جس کی بنا پر ترجمے میں ڈھیلا پن آ جاتا ہے۔ اس کی مثال ہماری مقفّٰی اور مسجع عبارتیں ہیں جو اردو میں لاتعداد ہیں۔ صرف قدیم تحریروں میں ہی نہیں بلکہ ن م راشد کی نثری تحریروں تک میں یہ خصوصیت بخوبی پائی جاتی ہے اور ابتدائی بچوں کی نثری تحریروں میں بھی یہ ہوتا ہے تاکہ بچوں کی زبان میں متن تیزی سے رواں ہو جائے اور اس میں اکثر معکوس آوازوں کا استعمال ہوتا ہے تاکہ وہ بچوں کو اچھا لگے۔ اور نظموں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ پہلا بند اگر بلند آہنگ کا حامل ہے تو دوسرا بند پست آہنگ کا جیسے اقبال کی نظم ذوق و شوق میں۔ ایسے میں مترجم کیسے اس ذمے داری کو اٹھائے گا کہ وہ معنوی خوبصورتی جس آہنگ سے پیدا کرتا ہے وہی آہنگ ترجمہ والی زبان میں آ جائے۔ کیا اُس زبان میں ویسے الفاظ موجود ہیں یا نہیں یا اُس زبان میں سرے سے اس کی گنجائش ہی نہیں. خیر ہر زبان کی صوتی خصوصیت ایک نہیں ہو سکتی لیکن صوتی خصوصیات سے جو تاثر قائم کیا جاتا ہے وہی تاثر اس جملے کی جان ہوتی ہے۔ جس کو ہم اس طرح سے سمجھ سکتے ہیں کہ ہم نے ایک خطاطی کے خوبصورت شہہ پارہ کا بلیک اینڈ وائٹ زیراکس پیش کر دیا، جس میں معنی رنگوں کے ذریعے پیش کیے گئے تھے اور ہم نے ان رنگوں پر پانی پھیر دیا۔ یہی حال صوت کا شہہ پارہ کے ساتھ ہوتا ہے جس کی مثال عربی سے اس طرح پیش کرنا چاہتا ہوں:

فقلت ماسمك

فقال لو لو

فقلت لی لی

فقال لالا

جس کا ترجمہ سیدھا سا یہ ہے ”میں نے اُس سے کہا تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا لولو، میں نے کہا میرے لیے، اس نے کہا نہیں“ یہ پوری بات مہمل لگ رہی ہے تو مترجم لولو کا معنی (موتی) بھی قوسین میں لکھے گا۔ اب معنی واضح ہو گیا لیکن اوپر نیچے اور سامنے کی آوازوں سے جو صوتی تفنن پیدا کیا گیا تھا وہ غائب ہو گیا۔

اسی طریقے سے معنوی مزاح کی ایک مثال فارسی سے ملاحظہ فرمائیں۔

ایک دفعہ فیضی بیمار تھا۔ عرفی عیادت کو گیا۔ فیضی کو کتوں کا بہت شوق تھا، کتوں کے بچے گلے میں سونے

اگر ترجمہ کی جانے والی زبان میں اصطلاحات کا فقدان ہو تو پھر اصطلاحات یا تو اصلی زبان سے ہو بہو لائی جائے گی یا پھر اسی نسل کی زبان میں دیکھیں گے کہ وہاں اس اصطلاح کے لیے کیا استعمال ہو تا ہے جو ترجمہ کی جانے والی زبان میں بھی اجنبیت کا شکار نہ ہو۔مطلب ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہوں. لیکن ادب کے ترجمے میں مترجم ان تمام کے ساتھ اصل زبان کے سماجی، ثقافتی و تہذیبی معاملات سے بھی باخبر ہو جو تلمیحات و اشارات کو بھی سمجھ سکے۔یہی نہیں بلکہ اس لفظ کے استعمال سے انسان کی پیشانی میں جو خوشی، ناگواری، حیرت و تردد کی کیفیت آتی ہے جو لفظ کے معنی کو کسی حد تک واضح کر دیتی ہے اس سے بھی واقف ہو مز شاعری میں ایک ہی لفظ سے کئی معانی پیش کیے جاتے ہیں اس کا بھی علم ہو۔

کے پٹے ڈالے پھر رہے تھے، عرفی نے کہا ''مخدوم زادہا بچہ اسم موسوم اند'' (بچوں کے کیا نام ہیں) فیضی نے کہا 'بہ اسم عرفی' (معمولی نام ہیں)۔ عرفی نے کہا ''مبارک باشد'' (مبارک ہو) مبارک فیضی کے باپ کا نام تھا۔ اسی نوعیت کی ایک مثال عربی سے بھی دیکھیں۔ علامہ ابن حجر اور علامہ عینی کے درمیان معاصرانہ چشمک مشہور و معروف ہے۔ دونوں کی لطیف گفتگو کا ایک دلچسپ واقعہ کچھ اس طرح سے ہے۔ اس وقت کے حکمراں مولانا ملک المؤید کی سوانح پر علامہ عینی نے ایک طویل قصیدہ کہا تھا جس میں اس کی بنائی ہوئی جامع مسجد کی تعریف بھی تھی۔ اتفاق سے کچھ عرصے کے بعد مسجد کا منارہ جھک کر گرنے کے قریب ہو گیا اس پر حافظ ابن حجر نے پرچے پر مندرجہ ذیل دو شعر لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیج دیے:

لجامع مولانا المؤید رونق
منارته تزهو علی الفخر والزین
تقول وقد مالت علیّ ترفقوا
فلیس علی حسني اضر من العین

(مولانا مؤید کی جامع مسجد بڑی بارونق ہے، اس کا منارہ فخر و زینت کی وجہ سے بڑا خوشنما ہے، لیکن جب وہ جھکا تو اس نے کہا مجھ پر رحم کرو، میرے حسن پر (عین) بری نظر سے زیادہ نقصان دہ چیز کچھ نہیں ہے) اس شعر کا لطف یہ ہے کہ عین کو عینی پڑھا جاتا ہے جس سے علامہ عینی کی جانب طنز ہوتا ہے۔ ملک مؤید کو یہ رقعہ ملا تو اس نے علامہ عینی کے پاس بھیج دیا۔ اس پر انھوں نے جواباً مذکورہ دو شعر لکھ کر بھیج دیے۔

منارة کعروس الحسن قد جلیت
و هدمها بقضاء الله والقدر
قالوا أصیبت بعین قلتُ ذا خطأ
وإنما هدمها من خیبة الحجر

(یہ منارہ عروس حسن کی طرح درخشاں ہے، اور اس کا گرنا محض اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر سے ہے، لوگوں نے کہا ہے کہ اسے آنکھ لگی ہے، میں نے کہا یہ غلط ہے، در اصل وہ اپنے حجر (پتھر) کے فساد کی بنا پر گرا ہے۔ اس میں حجر سے علامہ ابن حجر کی جانب طنز ہے۔ الغرض دونوں مثالوں میں ایہام گوئی سے کام لیا گیا ہے جس کا لفظی ترجمہ بے معنی ہوتا ہے اور ہمیشہ تشریحی ترجمہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

ترجمہ کے فن پر بہت سی باتیں کی گئی ہیں اور نظریات سے ہمارے دانشور متصادم بھی ہوئے ہیں۔ ترجمہ کی کئی اقسام بھی بنائی گئیں لیکن جب عملی دنیا کی بات کی جاتی ہے تو اس میں قاری کو صرف یہ نظر آتا ہے کہ یہ لفظی ترجمہ ہے، یہ بامحاورہ ہے، یہ ماخوذ ہے۔ پھر اس کی اگلی کڑی اس طرح سامنے آتی ہے کہ یہ خراب ترجمہ ہے، یہ ٹھیک ترجمہ ہے، یہ بہت ہی اچھا ترجمہ ہے اور اگر کوئی خوبصورت زبان کا دلدادہ ہے تو کہتا ہے کہ ایک خوبصورت فقرہ کا خوبصورت ترجمہ۔ لیکن اس جملہ کا تعلق اکثر محاورات و ضرب الامثال سے ہے۔ ظاہری بات ہے جو بہت ہی اچھا ترجمہ ہوگا وہ کسی بھی ادبی فن پارہ کا لفظی ترجمہ کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں ایسی تخلیقیت شامل کی گئی ہوگی کہ قاری یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ہم کسی دوسری زبان کی تخلیق پڑھ رہے ہیں یا یہ کہ یہ کسی دوسرے ملک کا ادب ہے۔ یہ کارنامہ نثری تحریروں میں بہت ہی آسانی سے انجام پا سکتا ہے جس میں اصل کہانی اور مسئلے کو باقی رکھتے ہوئے پوری تخلیق کو اپنی زبان میں اتار دیا جاتا ہے جس کی مثال اردو زبان میں بہت ہی زیادہ ہے جیسے ملا وجہی کی 'سب رس' فتاحی نیشاپوری کے فارسی قصہ 'حسن و دل' سے، غواصی کا 'سیف الملوک و بدیع الجمال' عربی کا مشہور قصہ 'الف لیلہ' سے، ابن نشاطی کا 'پھول بن' فارسی کا قصہ 'بساتین الانس' سے۔ اس طریقے سے کئی داستانوی کتابیں ہیں جن کا ماخوذ ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے جس کو ہم ترجمہ نہیں کہہ سکتے ہیں بلکہ اس جیسا کہہ سکتے ہیں۔ اسی طریقے سے خیام کی فارسی رباعیوں کے اردو میں بھی رباعی کی ہیئت میں ترجمے کیے گئے ہیں۔ اسی تخلیقیت کو پروفیسر آل احمد سرور اس طرح بیان کرتے ہیں ''ترجمے میں تخلیق کو از سر نو پانا ہوتا ہے اس لیے امریکہ میں ترجمہ کے لیے دوبارہ تخلیق (Recreation) کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔''

(ترجمہ کا فن اور روایت مرتب پروفیسر قمر رئیس ص 47)

لفظی معانی تو لغات کی ضرورتوں کے مدنظر ڈکشنریوں میں پیش کیے گئے، لیکن اردو میں باضابطہ لفظی ترجمہ قرآن پاک کے تراجم سے سامنے آتا ہے جس میں اس حد تک التزام تھا کہ اردو تراجم میں بھی وہی نحوی و صرفی تراکیب کا خیال کیا گیا جو عربی میں تھا اور اردو زبان کے لیے بہت ہی اجنبی لہجہ تھا، جو آہستہ آہستہ ختم ہوا اور اب بامحاورہ ترجمہ قرآن پاک کی تعداد زیادہ ہے۔ اسی طریقے سے انگریزی سے اردو میں بہت ہی زیادہ تعداد میں بچوں کے لیے کہانیاں ترجمہ ہوئی ہیں جن کی اشاعت ہندوستان میں قومی کونسل سے بھی ہوئی ہے۔ اُس میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ قصہ کے اصل کردار، مقامات و منظر نگاری کو بالکل بھی نہیں بدلا گیا بلکہ خوبصورت الفاظ میں اسی

ادبی تراجم میں خصوصی طور پر اولیت یہ ہونی چاہیے کہ ہم ان کو اصل زبان سے ہی ترجمہ کریں کیونکہ ترجمہ سے ترجمہ کرنے کی صورت میں معنویاتی تبدیلی تو آتی ہی ہے۔ ساتھ ہی تاثر میں آسمان و زمین کا فاصلہ بھی نظر آتا ہے جیسا کہ مطالعے کے دوران ناصرہ شرما کی کتاب 'ادب میں بائیں پسلی' میں دیکھنے کو ملا۔ جس میں انہوں نے عالمی ادب کو انگریزی کے توسط سے ہندی میں کیا ہے۔ اس میں جب فارسی اور عربی کی شاعری اور کہانیوں کا اصل متن سے موازنہ کرتے ہیں تو معنویاتی اور تاثراتی فرق نظر آتا ہے۔

کہانی کو اردو زبان میں پیش کر دیا گیا ہے۔ البتہ اس میں بھی کہیں کہیں آپ کو فاش غلطی دیکھنے کو مل جائے گی۔ وہ غلطی اس وجہ سے بھی ہوتی ہے کہ ترجمہ کسی پروجیکٹ کا حصہ ہوتا ہے اور وہ جیسے تیسے کر کے دے دیا جاتا ہے، جیسا کہ بچوں کی کئی کتابوں میں دیکھنے کو ملا کہ پہلی لائن کی زبان معروف ہے تو دوسری لائن کی زبان مجہول۔

ترجمہ کے لیے سب سے اہم یہ ہوتا ہے کہ ہم اصل زبان سے کماحقہ واقف ہوں۔ لیکن اس کا سیدھا مطلب ترجمہ کی دنیا میں ایک بہت ہی بڑا دھوکہ ہے اور وہ اس طرح کہ کوئی بھی مترجم بنیادی طور پر ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتا ہے۔ جیسے بیسویں صدی میں اور آج اکیسویں صدی میں بھی انگریزی سے خوب ترجمے ہو رہے ہیں اور انگریزی میں دوسری زبانوں سے۔ لیکن مترجم اس چیز کو نظر انداز کر جاتا ہے کہ اصل تخلیق خواہ کسی اور زبان کی ہے لیکن ہمیں اس سے کیا مطلب، ہم تو انگریزی سے ترجمہ کر رہے ہیں۔ یہ تراجم کے ساتھ سراسر دھوکہ ہے کیونکہ دانشوروں نے مترجم کے لیے جو شرائط لکھی ہیں وہ فن پارہ کی اصل زبان کے لیے ہی ہیں۔ جیسے عربی و فارسی کے اعلیٰ سے اعلیٰ قدیم و جدید ادبی فن کاروں کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے لیکن اب ہمارے مترجمین اصل زبان کی جانب توجہ نہ دے کر ترجمہ ہی کی جانب توجہ دے رہے ہیں جس سے وہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے جو نتیجہ ڈبلیو ایس فیلن اور جان ٹی پلیٹس کے تطابق میں صاحب فرہنگ آصفیہ کہیں کہیں کر گئے ہیں۔

ادبی تراجم میں خصوصی طور پر اولیت یہ ہونی چاہیے کہ ہم ان کو اصل زبان سے ہی ترجمہ کریں کیونکہ ترجمہ سے ترجمہ کرنے کی صورت میں معنویاتی تبدیلی تو آتی ہی

ہے، ساتھ ہی تاثر میں آسمان و زمین کا فاصلہ بھی نظر آتا ہے جیسا کہ مطالعے کے دوران ناصرہ شرما کی کتاب 'ادب میں بائیں پسلی' میں دیکھنے کو ملا، جس میں انھوں نے عالمی ادب کو انگریزی کے توسط سے ہندی میں کیا ہے۔ اس میں جب فارسی اور عربی کی شاعری اور کہانیوں کا اصل متن سے موازنہ کرتے ہیں تو معنویاتی اور تاثراتی فرق نظر آتا ہے۔

ادب اطفال تخلیق کرنا جس طرح مشکل ترین امر ہے اسی طریقے سے ادب اطفال کا ترجمہ بھی مشکل ترین امر ہے۔ سب سے پہلے ہم رائمز کی بات کرتے ہیں۔ انگلش میں رائمز بہت ہی زیادہ مقبول ہوئی ہیں جن کو ہماری اردو اور ہندی زبان میں مطلقاً پوئم کہا جاتا ہے۔ جبکہ انگریزی ادب میں یہ ادب اطفال کی ایک مستقل صنف ہے، جس کو اردو میں حشمت کمال پاشا اور مظفر حنفی نے اپنانے کی کوشش کی لیکن اس کو اردو ادب میں ابھی تک صنف کا درجہ نہیں ملا۔ رائمز میں بنیادی طور پر اصوات کا کمال ہوتا ہے ساتھ ہی کسی بھی مادہ، سبجیکٹ سے تعارف بھی مقصود ہوتا ہے تاکہ بچہ اس لفظ سے آشنا ہوجائے۔ جب اردو میں ہم رائمز کا ترجمہ کرنے کی کوشش کریں گے تو شاید اس چیز کو پیش نہیں کر پائیں جو انگریزی میں پیش ہوئی ہیں بلکہ از سر نو اردو میں لکھنا ہوگا۔ جس کے چند نمونے ہمارے اکثر ادیبوں کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں ایک مثال ملاحظہ فرمائیں

Humpty Dumpty sat on awall,
Humpty Dumpty had agreat fall,
All the King's horses and all the King's men
Couldn't put Humpty Dumpty together
again.

اس کا اردو ترجمہ کسی صاحب نے کیا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ہمپٹی ڈمپٹی چڑھ گیا چھت
ہمپٹی ڈمپٹی گر گیا پھٹ
راجہ کی پلٹن رانی کے گھوڑے
ہمپٹی ڈمپٹی کبھی نہ جڑنے

اس میں دیکھا جاسکتا ہے کہ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ ترجمہ نہیں بلکہ اس سے متاثر ہے، لیکن پھر بھی اس میں اردو حامل مزاج کے بچوں سے جڑنے کی مکمل کوشش کی گئی ہے۔ اس قسم کے رائمز اردو میں بہت ہی کم لکھی گئی ہیں۔ اکثر اردو میں بالکل ابتدائی بچوں کے لیے ایسی نظمیں لکھی گئی ہیں جن میں اصوات کی تکرار بچوں کے ذہن میں کھلونے والی آواز کی کیفیت پیدا کرتی ہے انہی میں سے ایک مشہور نظم ہے'' اکّن بکّن'

اکّن بکّن
دہی چٹاکن
آلو بیگن
کھٹا چورن
گھنگرو باجے
چھن چھن چھن چھن
گھنٹہ بولا
ٹن ٹن ٹن ٹن
ہنستے گاتے
چٹّن مٹّن

اس پوری نظم میں وہ الفاظ ہیں جن سے ہمارے یہاں کے بچے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان میں وہ آوازیں ہیں جو ان کی کانوں کو اچھی لگتی ہیں۔ اس نظم میں ان الفاظ کا استعمال ہوا ہے جو ان کے مزاج کو بہت ہی پسند ہوتے ہیں۔ اس نظم میں تخلیق کار کا جو مقصد پوشیدہ ہے وہ بچوں کی دیگر نظموں سے بہت ہی مختلف ہے جن میں بچوں کے لیے اخلاق مقصود ہوتا ہے او اصلاح کا امر بھی پوشیدہ ہوتا ہے، لیکن یہ خالص ترنمی نظم ہے جس میں کوئی پیغام نہیں ہے بچوں کو صرف خوبصورت آوازوں میں جکڑا گیا ہے اور ان کی زبان میں تکرار لفظ سے زبان کو صیقل کرتا ہے۔ اس کا ترجمہ اگر مقصود ہو تو ویسا ہی ترجمہ ہوگا جیسا کہ اوپر انگریزی سے اردو کا ہوا ہے۔ اس میں الفاظ میں جو جھنکار اور کھنک ہے جو اس نظم کی جان ہے اس کو ترجمہ میں کس طرح برقرار رکھا جائے گا، پھر اس میں ''گھنگرو باجے، چھن چھن چھن چھن'' یہ مکمل ایک آواز کی شناخت ہے جیسے کوے، بلی، کتے اور مرغے کی آواز ہوتی ہے، تو یہ سوال لازمی طور پر اٹھتا ہے کہ کیا آوازوں کا بھی ترجمہ ہوتا ہے؟

الغرض وہ نظم جس کا تعلق صوتی کیفیت سے ہو اس کا ترجمہ بہت ہی مشکل ہوتا ہے کیونکہ ہمیں تو اس بات کا علم ہے کہ ہمارے یہاں کے بچے کن آوازوں سے چہکتے ہیں، لیکن ہماری زبان سے جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے وہاں کے بچے کن آوازوں سے چہکتے ہیں ان کا علم نہیں ہوتا ہے۔ گویا یہاں لفظوں کا ترجمہ نہیں بلکہ ان لفظوں کی کھنک کا ترجمہ پیش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہم جب بچوں کے لیے کسی دوسری زبان سے ترجمہ کرتے ہیں تو مناسب ہے کہ اسی طرز پر ہم تخلیقات کو پیش کریں۔ کیونکہ بچوں کو ہم فطری زبان سکھانا چاہتے ہیں نہ کہ وہ زبان جس میں ہلکی سی اجنبیت پائی جائے اور تاثیر کی تلاش میں ہم ناکام رہیں۔

ترجمہ کے معاملے میں اکثر دانشوروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ نظم کے معاملے میں نثر کے تراجم آسان ہوتے ہیں کیونکہ اس میں نہ تو صنائع وبدائع کا دخل ہوتا ہے، نہ ہی معنویاتی پیچیدگی پائی جاتی ہے اور نہ ہی ردیف وقافیہ کی پابندی بلکہ تخلیق کار سیدھی اور سلیس زبان میں لکھتا ہے تاکہ پیغام میں کسی قسم کی پریشانی نہ آئے، تو مترجم کے لیے آسانی ہوتی ہے کہ وہ مکمل حد تک یا کسی حد تک انہی معنوں کے لیے دوسری زبانوں کے لفظوں کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ لیکن وہاں بھی جب ابتدائی جماعت میں دو حرفی، سہ حرفی اور چہار حرفی لفظوں سے کہانیاں بنائی جاتی ہیں تو اس میں مترجم کو مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا درسیات کا ترجمہ ممکن ہے تو اس کا واضح جواب ہے کہ مولوی اسماعیل میرٹھی کے اردو قاعدہ جیسی جو بھی کتابیں ہیں ان کا ترجمہ لاحاصل ہے بلکہ اس نہج کی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔

آخر میں علامہ اقبال کے ایک مصرع پر بات ختم کرنا چاہوں گا جو دراصل قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ ہے۔

''نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو'' یہ "اھدنا الصراط المستقیم" کا ترجمہ ہے جس میں صرف جمع متکلم کے صیغے کو واحد متکلم سے بدلا گیا ہے۔ یہ بات حقیقت ہے کہ علامہ اقبال باضابطہ مترجم نہیں تھے لیکن جب کوئی فن کار کسی چیز کو اپنے فن میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس میں وہ خوبیاں در آتی ہیں جو شاید کسی پیشہ ور کے یہاں نہیں آسکتیں۔ صراط بمعنی راستہ کے اپنی جگہ پر موجود ہے لیکن اہدنا کا ترجمہ 'مجھ کو چلا' سے کیا گیا ہے جس میں بچوں کی کیفیت کو ہر حال میں ملحوظ رکھا گیا ہے اور بچوں کے شعور کے استعمال پر بھی زور نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر نیک راہ پر چلنے کی ڈور کو خدا کے سپرد کر دیا گیا ہے جو کہ ایک کفیل اور کارجین کی بھی ذمے داری ہوتی ہے۔ مستقیم کا معنی ہمیشہ سیدھا کے ہوتا ہے اور یہ راہ کے ساتھ لازم وملزوم کے طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن علامہ کی تخلیقی قوت یہ ہے کہ انھوں نے اس کو نیک کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ الغرض تخلیق کار جب ترجمہ کرے تو اس کے اندر تخلیقی صلاحیت کا کارفرما ہونا بھی ضروری ہے جو علامہ کے پیش کردہ مصرع میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

■

Amir Hamza
K-12, Third Floor
Haji Colony, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob.:8877550086

2019 کا فکشن
ایک جائزہ

اسلم جمشید پوری

ادبی تاریخ کا ایک ورق (2019) اور تبدیل ہوا۔ 365 حروف والا ورق اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ سلسلہ روزِ ازل سے جاری ہے۔ لمحات، مہ و سال میں اور پھر برس صدیوں میں تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ زمانہ اسی طرح بیکراں سمندر بنتا رہتا ہے۔ گذرتے وقت میں یادگار لمحات، روشن ذروں کی طرح اپنی موجودگی درج کراتے رہتے ہیں۔ 2020 کا استقبال ہے۔ کبھی گذشتہ برس بھی نیا تھا، آج ماضی کے سمندر میں ضم ہو چکا ہے۔ ادب کے وسیع و عریض اور عمیق سمندر میں 2019 کے نشانات کا پتہ لگاتے ہیں۔ یہ 2019 کے فکشن یعنی افسانہ، ناول اور فکشن پر تحریر کردہ تنقید کے علاوہ فکشن کے میدان میں ہونے والی سرگرمیوں کا ایک عالمی جائزہ پیش کرنے کی کوشش ہے۔

2019 میں اردو افسانہ

2019 میں افسانے کا سفر پورے طمطراق کے ساتھ جاری و ساری رہا۔ متعدد افسانہ نگاروں کے نئے مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ پرانے افسانہ نگاروں کے مجموعے بھی شائع ہوئے۔ مجموعوں کے دوسرے ایڈیشن بھی سامنے آئے۔ فکرت (بشیر مالیر کوٹلوی)، کوچۂ قاتل کی طرف (شموئل احمد)، مور کے پاؤں (کہکشاں پروین)، جب چیخا اندر کا منظر (سیف الرحمان عباد)، خوابوں کا قیدی (عشرت ظہیر)، کیا حال ہے جاناں اور قبر میں زندہ آدمی (مشتاق احمد وانی)، سہ شب کا قصہ (ناصر راہی) گریز پا (لالی چودھری) کیا بدن میرا تھا (صبا ممتاز بانو)، وصل میں مرگِ آرزو (رخشندہ کوکب)، چھتری نما کہانیاں (شعیب خالق) خوابوں کے بند دروازے (امین الدین بھایانی) اک چپ، سو دکھ (آدم شیر) شیر کا احساس (اوِناش امن) مجسموں کا شہر (محمد حنیف خان)، میں (خالد فتح محمد) مجمعے کی دوسری عورت (بشریٰ اقبال ملک)، کتبوں کے درمیان (حمیرا اشفاق) یوسف جمال (اور پتھر ٹوٹ گیا)، غیاث اکمل (بیاباں سے پہلے)، جاوید نہال حشمی (کلائڈوسکوپ) ماں (محمد مجیب احمد) ابا جان (رونق جمال) سرگذشت (عبدالقاسم علی محمد) وغیرہ نے سال بھر ایوانِ افسانہ میں ہنگامہ بپا رکھا۔ کچھ افسانوی مجموعوں کا جائزہ حاضر ہے۔

معروف فکشن نگار شموئل احمد کا تازہ افسانوی مجموعہ 'کوچۂ قاتل کی طرف' کی اشاعت نے فکشن شائقین میں ہلچل مچانے کا کام کیا ہے۔ دراصل شموئل احمد کسی نہ کسی تحریر سے ہمیشہ سرخیوں میں رہتے ہیں۔ لنگی کا شور جب تھمنے لگا تو 'کوچہ قاتل کی طرف' عصری مسائل پر بے باکانہ تخلیقی اظہار لیے حاضر ہیں۔ مجموعے میں 11 افسانے اور ان کا نیا ناولٹ 'چمراسر' شامل ہے۔ (جسے بعد میں الگ کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے)۔

بشیر مالیر کوٹلوی اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ ان کے افسانے نہ صرف موضوع اور زبان کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں مختلف ہوتے ہیں بلکہ وہ افسانے کے فن پر بھی زبردست دسترس رکھتے ہیں۔ چار دہائیوں سے کچھ زیادہ عرصے سے افسانے کی زلفیں سنوار رہے ہیں۔ گذشتہ برس ایک ناول 'جسی' کے ذریعے ادبی حلقوں میں دھوم مچا چکے ہیں۔ اس سال ان کا تازہ مجموعہ 'فکرت' عرشیہ پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس سے قبل ان کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

'فکرت' میں ان کے 18 افسانے اور 12 افسانچے شامل ہیں۔ ان کے افسانوں اور افسانچوں میں عصری حسیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ یوں بھی وہ تازہ ترین واقعات کو عمدگی سے افسانے کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ مجموعے کے کئی افسانے فکرت، مجبور، خطاوار، آسیب، تائی لاجونتی، حویلی والا، بامشقت، واویلا، جھوٹا سچ، انفرادیت کے حامل ہیں۔ اس مجموعے میں ایک ڈراما 'ایک لڑکی پاگل سی' بھی شامل ہے۔ ان کے کئی افسانچے جنت نکیں، پہچان، نوازش، جاں کنی، مشورہ، بھی بہت اہم ہیں۔

عشرت ظہیر کا شمار جدید افسانے کے عہد کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ لیکن عشرت ظہیر نے خود کو پورے طور پر جدید ہونے سے بچایا بھی اور افسانے میں جدت کو روا بھی رکھا۔ 'خوابوں کا قیدی' ان کا تازہ مجموعہ ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس

سے قبل ان کے کئی مجموعے 'اُبھرتی ڈوبتی لہریں'، 'خوشبوؤں کا جال' وغیرہ شائع ہوچکے ہیں۔

عشرت ظہیر کے افسانے گہری فکر اور فلسفے کو عمدگی سے لفظوں کا پیراہن عطا کرتے ہیں۔ 'خوابوں کا قیدی' ان کا بھرپور افسانہ ہے۔ افسانے میں تجسس و تحیر کی فضا کثیف ہوتے ہوتے خواب ناک ہو جاتی ہے، لیکن دراصل یہ حقیقت کا ایک پرتو ہے جو قاری کے ذہن پر خواب جیسی کیفیت طاری کرتا ہے۔ پورا افسانہ خواب، سنہرے خوابوں کو سچ کرنے کی تگ و دو میں زندگی سے آنکھیں چار کرنے کی کہانی ہے۔

معروف افسانہ نگار سیف الرحمٰن عباد کا پانچواں مجموعہ 'جب چھنا اندر کا منظر' شائع ہو کر مقبول ہوا۔ تقریباً 20-25 برس قبل ایک ایسا زمانہ تھا جب اُردو کے ادبی رسائل میں سیف الرحمٰن عباد کے افسانے تواتر کے ساتھ شائع ہوا کرتے تھے۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا جب سیف الرحمٰن عباد نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ بہت دنوں بعد ان کا تازہ مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے۔

سیف الرحمٰن عباد کے افسانے ہمارے آس پاس کے واقعات و حادثات کا فنکارانہ بیان ہوتے ہیں۔ عصری حسیت، ان کے افسانوں کا خاص وصف ہے۔ زندگی کی معنویت اور فلسفہ بیان کرتے ہوئے وہ ہنرمندی سے افسانے تخلیق کرتے ہیں۔

مجموعے میں ایک درجن افسانے شامل ہیں جب چھنا اندر کا منظر، دو ہاتھ پال کے، بٹ گئی جب زمین، خود پہ ہی ٹوٹا طلب کا آسمان، رات ڈھلی شبنم روئی، مجموعے کے اہم افسانے ہیں۔ شیطان کون، ایک افسانچہ بھی مجموعے کی زینت ہے۔

'مور کے پاؤں' جھارکھنڈ کی معروف افسانہ نگار ڈاکٹر کہکشاں پروین کا تازہ مجموعہ ہے۔ اس سے قبل اُن کے چار افسانوی مجموعے 'ایک مٹھی دھوپ' دھوپ کا سفر، سرخ لکیریں اور 'پانی کا چاند' شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جھارکھنڈ کے مسائل خصوصاً خواتین کے مسائل کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ مور کے پاؤں، میں ان کے 31 افسانے شامل ہیں۔

کہکشاں پروین کا یہ مجموعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے عمدہ کاغذ اور کور پیج کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مجموعے کے کئی افسانے ایک مٹھی دھوپ، دھوپ کا سفر، آسمان کا چاند، دائرہ، اڑان، کھیل کھیل میں، ٹھنڈی چائے، دھوپ چھاؤں، بہت اچھے ہیں۔

'جڑوں کی تلاش' جموں وکشمیر کے مقبول فکشن نگار، دیپک بدکی کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے۔ دیپک بدکی نئے افسانے کا ایک منفرد نام ہے۔ کشمیر کے حالات، زمین سے جڑاؤ اور فن پر دسترس سے ان کے افسانوں میں ایک خاص کشش پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی مکالموں اور بیانیہ میں مقامی رنگ کی موجودگی، انھیں دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ ادھورے چہرے، زیبرا کراسنگ، اب میں وہاں نہیں رہتا، جیسے افسانوی مجموعے ان کی شناخت ہیں۔ 'جڑوں کی تلاش' میں ان کے بیس افسانے اور ایک ڈرامہ 'روح کے زخم' بھی شامل ہے۔ 'جڑوں کی تلاش' ہجرت کا افسانہ ہے۔ اپنی زمین میں اپنی جڑوں کی تلاش کا افسانہ ہے۔ افسانے میں زندگی کا ایک ایسا درد ہے جو ہر لمحے انسان کو کچوکے لگاتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا تازہ افسانوی مجموعہ 'کیا حال ہے جاناں' ابھی شائع ہوا ہے۔ یہ ان کا پانچواں افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے چار افسانوی مجموعے ہزاروں غم 2001، میٹھا زہر 2008، اندر کی باتیں 2015، قبر میں زندہ آدمی 2019 شائع ہو چکے ہیں۔ مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا مجموعی وصف کشمیری عوام کے مسائل، ان کی زندگی کے نشیب و فراز کی عکاسی ہے۔ تانیثیت کے حوالے سے بھی ان کے کئی افسانے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ مجموعہ ہذا کا ٹائٹل افسانہ بھی خواتین کے مسائل کے پیشِ نظر لکھا گیا ہے۔ افسانے میں زندگی کے فلسفے کا بیان ہے تو میاں بیوی کے درمیان اولادِ نرینہ کو لے کر پیدا ہونے والی پیچیدگی بھی موجود ہے۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس سے مطبوعہ اس مجموعے میں کئی افسانے سماج، عشق، ڈراونی آوازیں، انوکھا رشتہ، ریٹ لسٹ، وغیرہ اچھے افسانے ہیں۔

جموں وکشمیر کے نوجوان افسانہ نگار ڈاکٹر ریاض توحیدی کے دو افسانوی مجموعے 'کالے پیڑوں کا جنگل' اور 'کالے دیوؤں کا سایہ' ایک ساتھ ایک ہی جلد میں شائع ہوئے۔ یہ ان دونوں مجموعوں کا دوسرا ایڈیشن ہے جو 2019 میں میزان پبلشرز، سری نگر سے شائع ہوا ہے۔ یہ ایک نیا تجربہ ہے۔ ریاض توحیدی نئے نئے تجربات کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے زیادہ تر افسانوں میں کشمیری عوام کی دردناک زندگی، تشدد، افواج کے ظلم و ستم اور بے بس و مجبور افراد کے قصے ملتے ہیں۔ ان کے یہاں علامتیں اور تشبیہات واستعارات کا بھی ایک نظام ملتا ہے۔

ریاض توحیدی کی اس کتاب میں دیگر کئی افسانے توجہ کے مستحق ہیں۔ مثلاً ناکہ بندی، نشیب و فراز، قتل، قاتل اور مقتول، ڈپریشن، ہائی جیک، بہشت کی پکار، جنازے، دوشالہ، گلہ قصائی، کالے دیوؤں کا سایہ، خوف وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن کے عنوانات ہی ایک پس منظر پیش کرتے ہیں۔ کتاب میں تقریباً 39 افسانے شامل اشاعت ہیں۔

'سہ شب کا قصہ' جمشید پور سے تعلق رکھنے والے شاعر، افسانہ نگار ناصر راہی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ ناصر راہی 1980 کے بعد اُبھرنے والی نسل کے ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ کافی زمانے سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ شاعر بھی ہیں، اس لیے پہلے نظموں کا مجموعہ 2006 میں لائے، بعد میں افسانوں کو یکجا کیا۔

ناصر راہی کے افسانوں میں جدیدیت کا رنگ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں متعدد تہیں ہوتی ہیں۔ تجسس اور تحیر سے بھرپور افسانوں کا ایک خاص وصف ان کی زبان ہے۔

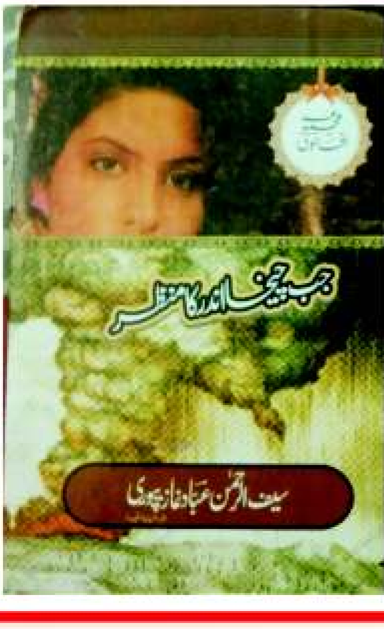

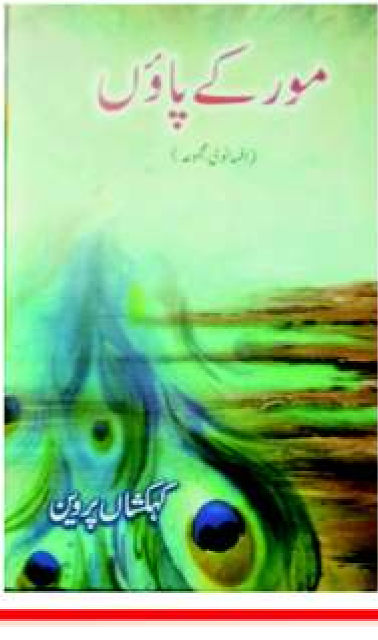

کتاب دار، ممبئی سے شائع ہونے والا مجموعہ 'سہ شب کا قصہ' بشمول سرورق، بہت دیدہ زیب ہے۔ مجموعے میں کل 13 افسانے شامل ہیں، ٹائٹل افسانہ 'سہ شب کا قصہ' اہم افسانہ ہے جس میں ناصر راہی نے جنسی لذت کی شکار بہو کی اندھیروں کی حرکات وسکنات کے دھندلے مناظر اور سرگوشیوں سے پیچ وتاب کھانے والے سسر کی نفسیات کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔ مجموعے کے کئی افسانے مردِ خدا، بلی لوٹن، القصہ، رات کا آخری پہر، چھومنتر، آدمی نامہ ایسے افسانے ہیں جن پر تفصیل سے گفتگو ہونی چاہیے۔

'گریز پا' یو ایس اے کی معروف افسانہ نگار، سفر نامہ نگار لالی چودھری کا افسانوی مجموعہ ہے۔ جسے موڈرن

پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے شائع کیا ہے۔ لالی چودھری کا یہ دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'حد چاہیے سزا میں' ہندوپاک میں خاصا مقبول ہوا۔ ان کے مختلف سفر نامے بھی افسانوی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ جو 'لالی چودھری کے سفر نامے' کے عنوان سے ڈاکٹر رفیعہ سلیم نے مرتب کیے ہیں۔

لالی چودھری کے افسانے بھی ان کے سفرناموں کی طرح بہت مختلف ومنفرد ہیں۔ وہ اپنے مخصوص لب ولہجے میں کہانیاں بیاں کرتی ہیں۔ ان کے موضوعات عصمت چغتائی کی طرح متوسط طبقے کی زندگی کے مسائل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ امریکہ، یورپ وغیرہ میں ہندوپاک کے مہاجرین کی زندگی کو بھی خصوصیت کے ساتھ موضوع بناتی ہیں۔ یہی نہیں ان کی زبان بھی عصمت چغتائی کی طرح بیگماتی زبان کی یاد دلاتی ہے۔

'گریز پا' میں ایک درجن افسانے شامل اشاعت ہیں۔ ہر افسانہ موضوع، ٹریٹمنٹ اور اسلوب کے اعتبار سے الگ نوعیت کا ہے۔ کئی افسانے خاصا متاثر کرتے ہیں۔ گریز پا، تھینک گڈنیس، کھٹ مٹھا رشتہ، پابہ زنجیر، کوگر، بدلت مراسم وغیرہ ایسے افسانے ہیں جو دیارِ غیر میں انسانی زندگی کے نشیب وفراز کو عمدگی سے پیش کرتے ہیں۔ تھینک گڈنیس اور کھٹ مٹھا رشتہ پڑھ کر آپ عصمت چغتائی کو یاد کریں گے۔ کھٹ مٹھا رشتہ میں، ٹیڑھی لکیر، کی طرح گرلز ہاسٹل کے رومان، کزنس کی شوخیاں اور بے تکلف زبان کا استعمال ملتا ہے۔

'مجسموں کا شہر' نووارد افسانہ نگار محمد حنیف خان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ انھوں نے موجودہ صدی کی دوسری دہائی سے ہی افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ محمد حنیف خان کے بیانیہ کا کمال ہے کہ وہ قاری کو نہ صرف باندھ لیتا ہے بلکہ اپنے ہمراہ لیے چلتا ہے۔ ان کی متعدد کہانیوں میں قصے کا طلسم، اساطیر اور حیرت انگیزی ملتی ہے۔ ان کو زبان پر دسترس ہے اور واقعہ بیان کرنا بھی جانتے ہیں۔

'مجسموں کا شہر' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوا ہے، جس میں کل 17 افسانے شامل ہیں۔ نمائندہ افسانوں میں منگل مکھی، کوڑے والی، کھنڈر سے آتی آوازیں، مجسموں کا شہر، دوستوں کے مسافر، گل رخ اور مار زنداں کا شمار ضرور ہونا چاہیے۔ ان میں سے کئی ایک میں کردار نگاری بھی عمدہ ہے۔

اڑیسہ کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر، افسانہ نگار یوسف جمال کا پہلا افسانوی مجموعہ 'اور پتھر ٹوٹ گیا'، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوا ہے۔ مجموعے میں کل تیس افسانے بشمول افسانچے شامل ہیں۔ ان میں ابتدائی 12 افسانے یوسف جمال کے اپنے طبع زاد ہیں اور دو افسانچے بھی، بقیہ افسانے اور افسانچے ترجمہ شدہ ہیں۔ جنھیں یوسف جمال نے عالمی زبانوں اور ہندوستان کی مقامی زبانوں سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ظاہر ہے انھوں نے انگریزی سے یا ہندی کے توسط سے یہ ترجمے کیے ہیں۔

یوسف جمال خود پرانے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز 1964 میں کیا تھا۔ متعدد ناول اور بے شمار افسانے تحریر کیے، لیکن مجموعے کی طرف توجہ نہیں کی۔ اب ان کے افسانوں کے انتخاب کا ایک مجموعہ 'اور پتھر ٹوٹ گیا' کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

دسترس پبلی کیشنز دھنباد سے معروف افسانہ نگار غیاث اکمل کا دوسرا مجموعہ 'بیاباں سے پہلے' شائع ہوا ہے۔ غیاث اکمل ہمارے سینئر افسانہ نگار ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ 2015 میں 'ڈھلان پر رکے ہوئے لوگ' منظرِ عام پر آچکا ہے۔ غیاث اکمل، فائر ایریا والے الیاس احمد گدی کے علاقے جھریا کے رہنے والے ہیں۔ الیاس احمد گدی کے ناول کی طرح غیاث اکمل کے افسانوں میں بھی کوئلہ کانوں کے سماجی اور معاشی مسائل، مزدوروں کی زندگی اور انتہائی پسماندہ افراد کی آواز کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔ اس مجموعے میں ان کے تقریباً 17 افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر افسانوں میں کولیری انتظامیہ کی سیاست، ایجنٹ حضرات کی تکڑم، مزدوروں کا استحصال، زہریلی گیس کا رساؤ اور دم توڑتے انسان جابجا نظر آتے ہیں۔

مجموعے کے کئی افسانے اہم ہیں۔ خصوصاً وہ ایک سیاہ لمحہ، خوف، رام اوتار، احساس کی صلیب، قصہ تمام، درد لا دوا، وش پان، حنوط شدہ سچ، ایسے افسانے ہیں جو خود کو پڑھوانے کی طاقت رکھتے ہیں۔

'کلائیڈوسکوپ' مغربی بنگال کے معروف نوجوان افسانہ نگار جاوید نہال حشمی کے افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ جسے انھوں نے خود شائع کیا ہے۔ آج افسانچہ نگاری اپنے زریں دور سے گذر رہی ہے۔ جاوید نہال حشمی نئی نسل کے ایسے فن کار ہیں جنھوں نے عمدہ افسانے قلم بند کیے ہیں تو افسانچوں میں بھی روح پھونک دی ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے فن پاروں میں بڑے بڑے مسائل، سلگتے ہوئے عصری معاملات، سماجی تانے بانے کا بکھراؤ، رشتوں کے تقدس کی پامالی، حب الوطنی، دہشت گردی، فرقہ پرستی، جیسے موضوعات کامیابی سے پروئے گئے ہیں۔

یوں تو مجموعے کا ہر افسانچہ کسی نہ کسی زاویے سے اہم ہے لیکن 82 افسانچوں میں مجھے چند افسانچے بہت اچھے لگے۔ جن میں نو بیف، کالا دھن، سرابوں کے قیدی، آگ، اس پار، فرقہ پرست، مارکیٹ ویلو، عکس، محافظ، غدار دیش بھگت، بکھی ہوئی زندگی، چراغ تلے، گھڑی کی چبھن، شفٹ ڈیلیٹ، بے جوڑ، کلائیڈوسکوپ، اجازت نامہ، ننگی تصویر، آہٹ وغیرہ اچھے افسانچوں کے زمرے میں رکھے جاسکتے ہیں۔

'ماں' محمد مجیب کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے جسے مجیب پبلیکیشنز، حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ اس سے قبل محمد مجیب کے کئی افسانوی مجموعے 'ممبئی حملوں کے مظلومین' 2012، دل سے 2014، ہم ہندوستانی 2015، میرے دکھ کی دوا کرے کوئی 2017، کوئی چارہ ساز ہوتا 2018، محبت زندگی ہے 2018 میں شائع ہو چکے ہیں۔ 'ماں' مجموعہ ایک معنی میں بہت انوکھا اور منفرد ہے کہ اس میں محمد مجیب احمد نے اپنے ایسے تمام افسانے یکجا کیے ہیں، جو ماں کے موضوع پر تحریر کردہ ہیں۔ محمد مجیب مبارک باد کے مستحق ہیں یہ شاید 'ماں' کے موضوع پر اردو میں کسی ایک مصنف کا پہلا مجموعہ ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں ادھر یک موضوعی افسانے بھی مجموعے کی شکل میں آرہے ہیں۔

'ابا جان' رونق جمال کی بچوں کے لیے لکھی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ رونق جمال معروف افسانہ نگار اور بچوں کے ادیب ہیں۔ ان کے متعدد مجموعے، بچوں کی کہانیوں کی کتابیں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ 'ابا جان' مجموعے میں رونق جمال نے ساٹھ چھوٹی چھوٹی کہانیاں شامل کی ہیں۔ یہ بچوں کے لیے ہیں۔

'شیر کا احساس اور دیگر فسانے' تازہ کار افسانہ نگار اونیاش امن کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے بڑے طمطراق سے شائع کیا ہے۔ دراصل اونیاش امن ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ شاعری تو وہ بہت پہلے سے کرتے ہیں۔ افسانے کی شروعات انھوں نے 2017 سے کی ہے یعنی اردو افسانے کی روایت میں شامل ہونے والا سب سے کم عمر افسانہ نگار جس کے افسانوں کا مجموعہ دو سال میں ہی منظر عام پر آگیا۔ اونیاش کے افسانوں نے اردو افسانے کے ایوان کو متزلزل کرنے کا کام کیا ہے۔ اسلوب کی پختگی، نئے موضوعات اور پھر قصہ بیان کرنے کے سلیقے سے اونیاش امن نے بہت جلد اردو افسانے میں اپنی جگہ بنالی ہے۔

اونیاش امن کے اس مجموعے میں کل پندرہ افسانے ہیں۔ ہر افسانہ اپنے آپ میں مکمل، منفرد اور معیاری ہے۔ کتاب کا ٹائٹل افسانہ بہت عمدہ ہے۔ کئی اور افسانے خصوصی قرأت کے متقاضی ہیں مثلاً قلی گاڑی، عقرب، پل صراط، طوطے کی فطرت، مداری، صبح کیوں نہیں ہوتی وغیرہ۔ عقرب جیسا افسانہ تو ادھر میری نظر سے نہیں گذرا، اونیاش نے کس عمدگی سے عقرب یعنی بچھو کی جسمانی ساخت کی تعریف لفظوں میں کی ہے۔ بہت دنوں بعد اردو افسانے میں ایک اچھے مجموعے کا اضافہ ہوا ہے۔

'سرگذشت' ماریشس کے مقبول ادیب عبدالقاسم علی محمد کی چھوٹی بڑی کہانیوں، یادداشتوں اور سوانحی واقعات سے پُر کتاب ہے۔ کتاب کو انجمن فروغ اردو، ماریشس نے شائع کیا ہے۔ عبدالقاسم علی احمد ماریشس میں چالیس برس اردو کی تعلیم و تدریس سے وابستہ رہ کر سبکدوش ہو چکے ہیں۔ 'سرگذشت' میں عبدالقاسم علی محمد نے بچپن کے واقعات اور یادگار لمحات کو اتنے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ان میں کہانی کا رنگ غالب ہے۔ ہاں کہیں کہیں سوانحی اور ناصحانہ انداز بھی در آیا ہے۔ کتاب میں 37 ایسی تحریریں شامل ہیں جن میں سے کچھ کو افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ کچھ دلچسپ واقعات ہیں۔ کچھ سفر کی روداد ہیں تو بعض مضمون کی نوعیت کی تحریریں ہیں۔ دراصل ماریشس جیسے بعض ممالک میں اُردو کا سفر نصف صدی قبل کا ہی ہے۔ ایسے میں وہاں نہ صرف زبان بلکہ ادب بھی تشکیلی دور سے گذر رہا ہے۔ ہمیں تشکیلی دور کی ان تحاریر کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔

'باہم دگری' ہندی کی منتخب کہانیوں کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ نگار عبدالباری ایم کے ہیں۔ کتاب ممبئی کے نیوز ٹاؤن پبلشرز نے شائع کی ہے۔ عبدالباری ایم کے کی اس سے قبل بھی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ انھوں نے 'بھیروں کبھی مرانہیں' جیسے ہندی ناول کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ 'باہم دگری' میں عبدالباری نے تقریباً 13 / ہندی افسانوں کے تراجم شامل کیے ہیں۔ منتخب کہانیوں میں ہندی کے معروف افسانہ نگار جتیندر، ہری شنکر پرسائی، موہن لال، کملیش، منوہر کاجل، رمیش اُپادھیائے، سُشانت سُپریہ، ہیمنت کمار، ودیا شکلا، سبطین شہیدی کی کہانیوں کا عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے اردو کے نئے افسانہ نگاروں کو مختلف قسم کی کہانیاں ملیں گی۔ تو ہندی کے طرز تحریر سے بھی واقفیت ہوگی۔

'گوکھرو' معروف ہندی شاعرہ، افسانہ نگار، ناول نگار محترمہ پشپتا اوستھی کی منتخب کہانیوں کا ترجمہ ہے، جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ نوجوان ناقد توصیف بریلوی نے ان کہانیوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ گوکھرو، میں ڈاکٹر پشپتا اوستھی کی آٹھ کہانیوں کا انتخاب اور ترجمہ شامل ہے۔ دراصل ڈاکٹر پشپتا ہندی کی معروف شاعرہ (11 مجموعے) افسانہ نگار (2 مجموعے) ناول نگار (ایک ناول) ہیں جو تخلیق کے علاوہ تنقید، ادارت، انٹرویوز وغیرہ پر بھی خاصا کام کر چکی ہیں۔ 2001 سے نیدرلینڈ میں مقیم ہیں۔ توصیف بریلوی نے کہانیوں کے ترجمے میں تخلیقیت کا بھی خیال رکھا ہے۔ یہ صرف لفظی ترجمہ نہیں بلکہ کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ اصلاً اردو کی کہانیاں ہیں۔

معروف افسانہ نگار سلمیٰ صنم کے افسانوں کا انتخاب 'قطار میں کھڑے چہرے' کا پاکستانی ایڈیشن، دستاویز پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا ہے۔ سلمیٰ صنم نے گذشتہ 15-10 برسوں میں اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔ تانیثیت سے بھر پور کہانیاں انھیں معاصرین میں الگ کرتی ہیں۔ انتخاب میں ان کی تقریباً ڈیڑھ درجن کہانیاں شامل ہیں۔ ان کی کئی کہانیاں ان کی شناخت ہیں۔ جن میں بطور پر گیا

ہوا شخص، مٹھی میں بند چڑیا، پانچویں سمت، پت جھڑ کے لوگ، یخ لمحوں کا فیصلہ، آرگن بازار، سورج کی موت کا ذکر ضرور ہونا چاہیے۔

'صبح بہاراں' اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اپنی شناخت بطور افسانہ نگار بنانے والی رمانہ تبسم کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ جسے ارم پبلشنگ ہاؤس، پٹنہ نے شائع کیا ہے۔ 'صبح بہاراں' میں رمانہ تبسم کے تقریباً 17 افسانے شامل اشاعت ہیں۔ ساتھ ہی ان کی افسانہ نگاری پر پروفیسر محمود نہسوی، اشتیاق احمد، محمد مجیب احمد، بے نام گیلانی اور غلام علی اخضر کے مضامین بھی شامل ہیں۔ رمانہ تبسم کے افسانے تازہ ترین واقعات اور ہمارے آس پاس کے حادثات کو ایک مخصوص انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے کئی افسانے چراغ، جال، عکس، داغ، انصاف، صبح بہاراں، دوکلیاں سنجیدہ قرأت کی متقاضی ہیں۔

'پسِ دیوار' رخسانہ نازنین کا افسانوی مجموعہ ہے جسے کرناٹک اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔ رخسانہ نازنین موجودہ صدی کی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ نئے نئے موضوعات کو افسانے کے قالب میں ڈھالنے میں کامیاب ہیں۔ 'پسِ دیوار' میں اُن کے تقریباً 40 افسانے شامل ہیں۔ جن میں سے کئی ایک بہت اچھے افسانے ہیں۔ مثلاً دوغلہ پن، سہاگن، سزا، برف کی دیوار، سراب، بدلتے چہرے، گیلے پروں کی پرواز، ثبوت، فرض کو ان کے اچھے افسانوں کے زمرے میں لایا جاسکتا ہے۔

دوحہ قطر میں مقیم محترمہ فریدہ نثار احمد انصاری کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'گوہر قلزم' بھی اسی سال شائع ہوا ہے۔ فریدہ نثار صاحبہ اچھی افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے ہندو پاک کے اہم ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے قبل ان کا افسانوی مجموعہ 'شنگرفی آنچل کے سائے' شائع ہو چکا ہے۔ 'گوہر قلزم' میں فریدہ نثار صاحبہ کے 16 / افسانے اور ان کی افسانہ نگاری پر بھی کئی مضامین شامل ہیں۔ فریدہ نثار صاحبہ کے افسانے عام فہم اور ہمارے سماج کے افسانے ہوتے ہیں جو قاری کو پڑھتے ہوئے اپنے افسانے لگتے ہیں۔

2019 میں اردو ناول

خوشی کی بات ہے کہ 2019 میں افسانوی مجموعوں کی طرح ناول بھی خاص تعداد میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں زیادہ تر عصری صورتِ حال کو بڑی فنکاری سے پیش کرتے ہیں۔ اس سال جو اہم ناول شائع ہوئے ان میں مشرف عالم ذوقی کا 'مرگِ انبوہ'، احمد صغیر کا آسماں سے آگے، رینو بہل کا نجات دہندہ، صادقہ نواب سحر کا راجدیو کی آمرائی، آصف زہری کا زبان بریدہ، عمران عاکف کا جے این یو کمرہ نمبر 259 (دوسرا ایڈیشن)، عزیز الدین احمد کا دہشت گرد، فضل رب کا سمندر منتظر ہے، امتیاز غدر کا علی پور بستی، حسن منظر کا اے فلک نا انصاف، اسد محمود خن کا پیشی، تنویر سیٹھی کا راہ وفا کی مسافتیں، شاعر علی شاعر کا خواب گاہ، محمد شیراز دستی کا سا سا، شموئل احمد کا چمراسر جیسے دو درجن سے زائد ناول شائع ہوئے ہیں۔ چند ناولوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

عمران عاکف خان، جے این یو کے ایک ذہین طالب علم ہیں۔ ان کا ناول 'جے این یو کمرہ نمبر 259' گذشتہ برس یعنی 2018 میں شائع ہوا تھا۔ مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ سال بھر بعد ہی ناول کا دوسرا ایڈیشن 2019 میں شائع ہوا ہے۔

مشرف عالم ذوقی اردو ناول نگاری کی روایت میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ہمعصر ناول نگاروں میں سب سے منفرد ہیں۔ وہ اکثر ایسے موضوعات پر قلم اُٹھاتے ہیں، جن پر ہمارے بعض ناول نگار سوچ بھی نہیں سکتے۔ ان کا ناول بیان ہو یا مسلمان، پو کے مان کی دنیا ہو یا لے سانس بھی آہستہ، ان سب نے اردو دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ مشرف اب ایک نیا ناول مرگِ انبوہ (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس) لے کر آئے ہیں۔ ناول کا خاصا چرچا ہے۔ دراصل یہ ناول آج کے کمپیوٹرائزڈ عہد میں قدروں کے ختم ہونے اور نت نئی وحشیانہ جنسی حرکات وسکنات میں گرفتار نئی نسل کی خودکشی کے دردناک زندہ مناظر کی تصویر کشی ہے۔ ایک طرف سماج میں بڑھتے فرقہ پرستی کے زہر سے نیلے ہوتے اکثریتی طبقے کے اجسام ہیں تو دوسری طرف جسم کی لذتوں سے بور ہوتے ہوئے وحشیانہ اور جان سوز ویڈیو گیمز کی شکار نئی نسل کے نوجوان ہیں۔

'نجات دہندہ' محترم رینو بہل کا تازہ ترین ناول ہے۔ رینو بہل اردو فکشن کی منفرد فکشن نگار ہیں ان کے متعدد افسانوی مجموعے اور ناول شائع ہو چکے ہیں۔ گذشتہ برس ان کے ناول 'میرے ہونے میں کیا بُرائی ہے' نے خاصی دھوم مچائی تھی۔ دراصل رینو بہل نئے موضوعات پر قلم اُٹھانا پسند کرتی ہیں۔ 'نجات دہندہ' بنارس کے ڈوم ذات کی اندھیرے سے روشنی کی طرف سفر کی کہانی ہے۔ بنارس میں گنگا کے گھاٹ پر مردے جلانے کا کام کرنے والی ذات کے نوجوان جب چنڈی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں تو ابتداء میں اپنی ذات پوشیدہ رکھ کر زندگی گذارتے ہیں۔ یوں بھی آج کل نئے فیشن کے شہروں میں ذات پات کی زیادہ اہمیت نہیں خاص کر طالب علمانہ زندگی میں۔ چنڈی گڑھ سے علم اور زندگی کی روشنی لے کر دوا کر اور بھاسکر جیسے ڈوم کردار، اپنی ذات اور خاندان کے لیے نجات دہندہ بن جاتے ہیں۔ رینو بہل نے عمدگی سے ذات پات کے سماج پر اثرات کو ناول کیا ہے۔

' زبان بریدہ' ڈاکٹر آصف زہری کا پہلا ناول ہے۔ ڈاکٹر آصف بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ تنقید و

تحقیق بھی ان کا میدان ہے لیکن 'زباں بریدہ' لکھ کر انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ نثر پر بھی یکساں عبور رکھتے ہیں بلکہ مجھے یہ کہنے میں تردو نہیں کہ انہوں نے ایک منجھے ہوئے ناول نگار کی طرح بہترین اسلوب میں ناول تحریر کیا ہے۔ زمانے کے بعد گاؤں دیہات کے پس منظر میں، وہیں کی بولی میں کوئی ناول پڑھنے کو ملا ہے۔ ناول کا موضوع بھی ملک میں خودکشی کرتے کسان اور ان کے مسائل ہیں۔

'سمندر منتظر ہے' ڈاکٹر سید فضل رب کا تحریر کردہ ناول ہے، جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر سید فضل رب نے سمندر منتظر ہے، میں موجودہ سماجی رسہ کشی، فرقہ وارانہ ذہنیت اور دن بہ دن عقائد کی بڑھتی دوریوں کو لفظوں کا جامہ پہنایا ہے۔ ناول میں بعض ایسے واقعات کا بیان ہے جسے پڑھ کر دل کانپ جاتا ہے۔ خوں ریزی کے ایسے واقعات فرقہ وارانہ تشدد کی دین ہیں۔ متعدد کرداروں کی ذہنی حالت، وطن سے محبت، زمین کی طرف واپسی، اپنوں سے جدائی کا غم، ناول کو پُر تاثیر بناتا ہے۔

'دہشت گرد' احمد عزیز کا خوبصورت ناول ہے۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع یہ ناول بھی عصری حسیت کا اچھا نمونہ ہے۔ گذشتہ 30-25 برسوں سے دہشت گردی نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

'آسماں سے آگے' احمد صغیر کا نیا ناول ہے۔ اس سے قبل ان کے تین ناول جنگ جاری ہے، دروازہ ابھی بند ہے اور ایک بوند اُجالا، شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے ناولوں میں عصری مسائل اور سیاسی حالات کی بہترین عکاسی ہوتی ہے۔ عشقیہ قصے بھی ان کے ناولوں میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ 'آسماں سے آگے' ان کا رومانی ناول ہے جس میں ایاز، صنوبر اور سعدیہ مثلث کی شکل میں ہیں۔ ایاز اور سعدیہ میاں بیوی ہیں، صنوبر شادی شدہ ایاز احمد سے یک طرفہ پیار کرتی ہے۔ ایاز اُسے ہمیشہ سمجھاتا رہتا ہے لیکن ہلکا پھلکا پیار، شدید ہوتے ہوتے جنون کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ممبئی کی مصروف سماجی زندگی کے درمیان عشقیہ قصے کو احمد صغیر نے عمدگی سے ناول کیا ہے۔

صادقہ نواب سحر کا تازہ ترین ناول 'راجدیو کی آمرائی' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، سے شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نئی صدی کی معروف فکشن نگار ہیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے اور دو ناول ہیں۔ کہانی کوئی سناؤ متاشا، ان کا مقبول ناول ہے۔ 'جس دن سے' کو بھی کافی سراہا گیا۔ 'راج دیو کی آمرائی' میاں بیوی کے رشتے کی نزاکت کے پیش نظر لکھا گیا ناول ہے۔ جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کی اپنی اپنی دنیا ئیں آباد ہو جاتی ہیں، ایسے میں شوہر کو بیوی کی بہت ضرورت ہوتی ہے اور اکثر ایسے اوقات بیوی بچوں کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے۔ یہی وہ نازک وقت ہوتا ہے جب رشتے خراب ہوتے ہیں۔ راج دیو اور اوتکا کی کہانی بھی ایسی ہی ہے۔ عمر کے آخری حصے میں راج دیو اور اوتکا کے درمیان بچے، دولت اور آمرائی (یعنی آم کا باغ) آجاتی ہے۔ معاملہ ساری حدیں پار کر جاتا ہے اور عدالت کا رُخ کر لیتا ہے۔ بیوی کے اصرار کے باوجود راج دیو طلاق نہیں دیتا۔ بیوی، بچے، بہو سب راج دیو سے الگ اور خلاف ہیں۔ جبکہ دولت، پیسہ سب کچھ راج دیو کے پاس ہے۔ بالآخر عدالت خرچے کے پیسے باندھ دیتی ہے راج دیو اپنی دولت میں سے کچھ حصہ غریبوں میں دان کر دیتا ہے۔ باقی ماندہ دولت لے کر دنیا کی سیر کو نکل جاتا ہے۔ صادقہ نواب نے ایک حقیقی کہانی کو لفظ عطا کیے ہیں۔ مقامی زبان کا بھی اچھا استعمال ہے۔

'علی پور بستی' نئی نسل کے نوجوان افسانہ نگار امتیاز غدر کا پہلا ناول ہے۔ جسے حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے شائع کیا ہے امتیاز غدر افسانے اور افسانچے کے لیے مشہور ہیں۔ 'علی پور بستی' ناول آنے کے بعد لوگ حیران تھے۔ زیادہ تر لوگ اسے متن بر متن کا ہی کوئی معاملہ تسلیم کر رہے تھے کہ شاید یہ ناول ممتاز مفتی کے مقبول ناول 'علی پور کا ایلی' کی ہی (Extention) توسیع ہے، لیکن امتیاز غدر نے ناول کو ایک عصری مسئلے سے جوڑ کر لکھا ہے۔ مردم شماری میں اندراج سے لے کر لسٹ شائع ہونے تک مردم شماری میں کیا کیا کھیل ہوتا ہے۔ کیسے یہ ملک کی تعمیر و ترقی کی اساس ہوتی ہے۔ امتیاز غدر نے مردم شماری کے عمل اور اس کی پیچیدگیوں اور ان سے سامنے آنے والی مشکلات کو عمدگی سے لفظوں میں ڈھالا ہے۔

'فائرنگ رینج: کشمیر 1990' شفق سوپوری کا تازہ ناول ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوا ہے۔ شفق سوپوری منفرد قسم کے ناول نگار ہیں۔ وہ آس پاس کے ماحول اور سامنے کے موضوعات کو بڑے سلیقے سے ناول کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس سے قبل ان کا ناول 'نیلیما' خاصی دھوم مچا چکا ہے۔ 'فائرنگ رینج: کشمیر 1990' کئی دہائیوں سے کشمیر کے ناگفتہ بہ حالات کی آواز ہے۔

'آخری ایشوز' اڑیہ کی معروف فکشن نگار ڈاکٹر پرتھا رائے کا مقبول ناول ہے۔ ڈاکٹر پرتھا رائے اڑیسہ کی ہی نہیں، ہندوستان کی مقبول ادیبہ ہیں۔ ان کے تقریباً 22 ناول اور 250 کے قریب افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا ایک ناول سوایڈیشن شائع ہو کر ایک رکارڈ بنا چکا ہے۔ ناول کا اردو ترجمہ عبدالمتین جامی نے کیا ہے، جو خود اڑیسہ کے معروف شاعر، ناقد اور مترجم ہیں۔ اس سے قبل بھی وہ اڑیہ اور ہندی سے متعدد تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ 'آخری ایشور' ایک یتیم بچے کی کہانی ہے۔ اس کا بچپن، تعلیم، پرورش وغیرہ میں آنے والے نامساعد حالات، سماجی اور سیاسی اتار چڑھاؤ اور فرقہ پرستی کو ڈاکٹر پرتھا رائے نے عمدگی سے ناول کیا ہے۔

■

Prof. Aslam Jamshedpuri
HOD, Urdu
CCS University, Meerut (UP)
aslamjamshedpuri@gmail.com
09456259850

سید محمد عقیل رضوی کے خطوط
رضا نقوی واہی کے نام

مناظر عاشق ہرگانوی

رضا نقوی واہی اردو طنز و مزاح کے رجحان ساز شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی طنزیہ شاعری سے سماجی، معاشی، سیاسی پیش منظر کو مختلف انداز سے طنز کے زیر اثر بیان کیا ہے جس میں معاشرتی، تمدنی، ثقافتی، ادبی اور تہذیبی زندگی سمٹ آئی ہے۔ ان کا عمیق مطالعہ تغیرات و تبدل کے قبح و حسن کو قبولیت بخشتا ہے اور ان کا وجودی تجربہ و مشاہدہ افکار و احساسات، تعملات و انفعالات، عواطف و میلانات اور حقائق و بصائر کو وقار عطا کرتا ہے۔

سید محمد عقیل رضوی پروفیسر تھے۔ تقریباً 91 سال کی عمر میں 20 دسمبر 2019 کو ان کا انتقال ہوگیا۔ ترقی پسند ناقدوں میں ان کی شناخت تھی۔ ان کا ادبی اور تعلیمی یا تدریسی سفر لمبا ہے جس سے وجوہات کی نشاندہی ہوتی ہے اور فکر و نظر کی جامعیت سامنے آتی ہے۔ تخلیقی تحقیقی و تنقیدی تقاضے کو گہرائی کی اظہاریت بخشنا جانتے تھے۔ اسی لیے معتقدین اور متوسطین تک ان کی رسائی تھی بلکہ انھوں نے معنوی اعتبار سے جامعیت کو راہ دے کر اثر انگیزی پیدا کی ہے۔

سید محمد عقیل رضوی کے چند خطوط میری لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان میں رضا نقوی واہی کے نام چند خطوط ہیں۔ یہ بھی غیر مطبوعہ ہیں۔ ان میں چھٹا خط جہاں دلچسپ ہے وہیں ان کی شاعرانہ صلاحیت کی تخلیقیت افروزی کو سامنے لاتا ہے۔ ملاحظہ کریں کہ اس میں دو ایک معرکے ہیں، احتشام حسین، اعجاز حسین، علی عباس حسینی، وہاب اشرفی، کلام حیدری کے 'مورچہ' کا ذکر کیا ہے اور بھی دیگر انکشاف ہیں:

4 ستمبر 1968: شب رنگ الہ آباد

محترمی تسلیم! آج ہی آپ کے قلم کے مطابق ایک مضمون 'مرغ' کے لیے روانہ کرچکا ہوں۔ اب ایک درخواست میری بھی ہے کہ 'شب رنگ' کے لیے قارئین بضد ہیں کہ واہی صاحب کا کچھ کلام شائع ہونا چاہیے۔ لہٰذا میری بھی درخواست اس میں شامل کر لیجیے اور جلد 'شب رنگ' کے لیے کچھ روانہ فرمائیے۔ اختر صاحب سے بھی کچھ بھجوانے کی زحمت کیجیے، ممنون ہوں گا!

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خیر طلب: سید محمد عقیل

'Shabrang' Monthly, 63, Zero Road, Allabahd

---

27 اکتوبر 1968: محمود منزل، دریاباد، الہ آباد

محترمی تسلیم! ایک مدت سے آپ کا کوئی عنایت نامہ نہیں ملا، خدانخواستہ کسی پریشانی میں تو مبتلا نہیں ہیں، آپ نے ایک نظم بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ اس کا بھی انتظار ہے۔ سب سے تشویش کی بات یہ ہے کہ اس بار 'شب رنگ' کی تمام وی پیاں پٹنہ سے واپس آگئیں۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ذرا کسی وقت زحمت کرکے پتہ لگائیے کہ کیا معاملہ ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ دوسرے اسکول کے لوگ اب اس کوشش میں ہیں کہ 'شب رنگ' کا سیل ختم کردیا جائے۔ یہ بڑی شرمناک بات ہے۔ لیکن اس اسکول کے لوگ کیوں ایسا چاہتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا۔

'نشتر و مرہم' آج تک نہ ملی۔ 'شب خون' میں دلچسپ تبصرہ دیکھا۔ فاروقی نے اپنے انداز میں آپ کو بھی تہہ تیغ کیا ہے۔ معلوم نہیں آپ نے ملاحظہ کیا یا نہیں۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے؟

خیر طلب: سید محمد عقیل

---

16 دسمبر 1968: محمود منزل، دریاباد، الہ آباد

محترمی تسلیم! ایک مدت کے بعد آپ کے خط کا جواب دے رہا ہوں مگر آپ کے نام سے غافل نہیں رہا۔ احتشام صاحب سے اس کام کے متعلق باتیں ہوگئی تھیں۔ انھوں نے اسے انجام دے دیا تھا۔ ایک صاحب ایک دیرینہ ادیب کے دستی خط کے ساتھ بہ نفس نفیس تشریف لے آئے تھے۔ یہ مناسب بات نہ تھی مگر کیا کیا جاسکتا تھا۔

نیا 'شب رنگ' امید ہے کہ آپ کے پاس پہنچ گیا ہوگا۔ نیوز ایجنٹ کے رسالے بھی آپ کے پاس روانہ کر دیے گئے ہیں۔ آپ ان سے مل کر جیسا کہ آپ نے لکھا تھا باتیں کر لیجیے گا۔ ادھر 'شب رنگ' کو بہت جھٹکے لگے مگر اب سنبھل گیا ہے۔ امید ہے اب ہر وقت نکلے گا۔ جنوری کے شمارہ کے لیے آپ کی نظم مطلوب ہے۔ اگر ممکن ہو تو روانہ فرمائیے۔

آپ کی کتاب پر اعجاز صاحب سے تبصرہ کررہا ہوں۔ اسلم آزاد کی کتاب پر خود کچھ لکھ دوں گا۔ فروری میں غالب نمبر نکالنے کی خواہش ہے۔ دیکھیے۔

خیر طلب: سید محمد عقیل

---

14 مئی 1969: محمود منزل، دریاباد، الہ آباد

محترمی تسلیم! مجھے ندامت ہے کہ اتنے دنوں سے آپ کو کوئی خط نہ لکھ سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔ یہ خبر سن کر بڑا افسوس ہوا۔ اخباروں میں یہاں اس کا ذکر دیکھا۔ یہ بھی خیال کیا کہ نام سے کوئی اپنوں ہی میں سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ کیا خبر تھی کہ مرحوم اتنے قریب کے آدمی نکلیں گے۔ یہاں گھر میں جس نے بھی پڑھا تھا سب کو بڑا افسوس ہوا تھا۔ بجز میرے اور چارہ بھی اب کیا ہے۔ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ لوگوں کو صبر عطا فرمایا۔

عزیز کے لیے جو آپ نے لکھا ہے اس سلسلے میں جو بھی کوشش مجھ سے ہو سکے گی اٹھا نہ رکھوں گا۔ یہاں کچھ انجینئر پچھلے مہینے ہی رکھے گئے ہیں، کیا خبر تھی۔ ورنہ آپ کو اطلاع دے کر درخواست منگا لیتا۔ عباس حسینی صاحب سے تو کوئی خاص ملاقات ان لوگوں کی نہیں مگر 'شب رنگ' کا تقریباً تمام عملہ اس کمپنی میں کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ تھوڑی سی میری ملاقات بھی وہاں کے ارباب حل و عقد سے ہے۔ میں آج ہی پتہ لگاؤں گا کہ کیا پوزیشن ہے۔ اس کام میں احتشام صاحب بھی اچھی خاصی مدد کر سکتے ہیں لیکن وہ ابھی دو ہفتے کے لیے سویت یونین گئے ہوئے ہیں۔ تقریباً پہلی جون تک واپس ہوں گے۔ اس وقت تک ایک خط انھیں بھی لکھ دیجیے گا۔ امید تو ہے کہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ میں صحیح حالات دریافت کرکے پھر آپ کو اطلاع دوں گا۔ مطمئن رہیے۔

'شب رنگ' کا 'غالب نمبر' پھنسا ہوا ہے۔ اسی میں آپ کی کتاب پر اعجاز صاحب کا لکھا ہوا ریویو بھی شامل ہے۔ امید ہے کہ دس پندرہ روز میں اسے شائع کریں گے۔ لیکن گاڑی بری طرح پھنس گئی ہے۔ دیکھیے آج کل امتحانات کی وجہ سے کافی مصروف ہوں۔ دم لینے کی فرصت نہیں۔ کاپیاں سر پر کھڑی ہوئی ہیں۔ اور امتحان کے کام بعض اوقات بہت بیہودہ اور پریشان کن بھی ہوتے ہیں۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خیر طلب: سید محمد عقیل

---

7 اگست 1969: محمود منزل، دریاباد، حیدرآباد

محترمی تسلیم! مجھے ندامت ہے کہ آپ کے دو خطوں کا جواب نہ دے سکا اور بڑی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ میرے بچے ٹائیفائڈ کا زبردست شکار تھے۔ ہر وقت انھیں الجھنوں میں گرفتار رہتا۔ اب بہتر ہیں۔

میں نے شروانی فیکٹری کے ارباب حل و عقد سے باتیں کی تھیں۔ انھیں زیادہ تر میکینکل انجینئروں کی تلاش رہتی ہے۔ تاہم اگر کوئی موقع نکل سکا تو عسکری صاحب خود مدد کریں گے۔ ادھر لکھنؤ کے حالات کا بھی اچھا خاصا اثر اس فیکٹری پر پڑا ہے۔ پٹنہ کے کوئی محمود الحق صاحب ہیں جو عرف عام میں یہاں حق صاحب کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انھیں کے ہاتھ میں آپ کا یہ کام ہے۔ اگر وہاں سے کسی سے کوئی سفارش پہنچا دیجیے تو عجب نہیں کہ کام ہو جائے۔ درخواست پہنچ گئی ہے۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خیر طلب: سید محمد عقیل

Dr. S.M. Aquil Rizvi Urdu Department
M.A. D.Phil Allahabad University

27 مارچ 1970

محترم قبلہ! ملی آپ کی ترسیل جمیل
سخت شرمندہ ہوں خط لکھنے کی نکلی نہ سبیل
لیت و لعل اور کبھی وقت کی کوتاہی سے
مرغ نمک خامہ بنا سستی میں شہباز سے چیل
آپ واقف ہیں کہ بندہ نہیں اس جرگے سے
جو کہا کرتا ہے انکار بلاغ و ترسیل
نیک سید ہوں فقط صبر سے شیوہ اپنا
میری میراث ہے ہونا صفِ باطل کا قتیل
متعبیان جدیدہ کو سزاوار ہے سب
'سوختہ گنج' کریں، لے کے چلیں خبر ثقیل
ابن اوقات پہ ہر ایک عمل ہے زیبا
وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے اس کی تخئیل
لطف ہم نے بھی لیا اشرفی کے مضمون کا
بحث میں گرد ہوئے خوب، مخالف کے دلیل
مورچہ باندھ نہ پائے کہ تیرے ٹوٹ گئے
کام آئی نہ یہاں ہاشمی کی کوئی دلیل
سارے قلعے تھے ہوائی پہ دشمن کے
ہم بھی دیکھا کیے، یہ دھس گرا، وہ ٹوٹی فصیل
آج ہی میں نے پڑھا، بین سطوری، جھگڑا
یہ بھی معلوم ہوا شمس سے بگڑے ہیں خلیل
سارا جھگڑا ہے امامت کا نئے لوگوں میں
ہے ہر اک پٹھے کی خواہش کہ کہیں اس کو فیل
لطف تو یہ ہے کہ انساں کا نہیں درد انھیں
اپنے ہی غم سے مگر سینہ ہے عمرو کی زنبیل
ہر جدیدی کو گماں ہے کہ وہ پیغمبر ہے
'اسم اعظم' ہے جو اک گھر میں تو اک میں انجیل 1
اک نیا ڈھونگ سنا اور رچا ہے سب نے
جس کو کہتے ہیں، نئے ذہن کا ہے سنگ میل
یعنی شاعر تو کلام اپنا سنانا چاہے
اس پہ قدغن ہے مگر، اس میں نہ ہوئے ترتیل
کچھ یہ کہتے ہیں کہ شعر اپنا سنائیں کیونکر
اہل محفل، نئے شعروں پہ بجاتے ہیں زفیل
محفل شعر نہیں شعروں کو سننے کی اہل
'نیا شاعر' وہی جو شعر سنانے میں بخیل
واقعہ یہ ہے کہ ڈرتے ہیں جو ہوٹنگ سے سب
اسی ہوٹنگ سے بچنے کی نکالی یہ سبیل
اک خبر اڑتی ہوئی آئی ہے پٹنہ سے یہاں
کہ 'نئے شعر' کے حامی ہوئے استاد جمیل
آپ فرمائیں کہ ہے اس میں حقیقت کتنی
غالباً یونہی کسی نے ہے اڑ آئی یہ زنبیل
تا نہ پھر آپ کو آئندہ شکایت ہوئے
خط کے لکھنے میں ہمیشہ میں کروں گا تعجیل
شاعری فن ہے بڑا، میں تو نہیں اس کا اہل
ورنہ اشعار میں لفظوں کی جلاتا قندیل
رو میں آکر یونہی بس کھینچ دیے یہ کچھ شعر
کیا عجب بول رہے ہوں کھڑے 'سر پر جبرئیل'
ایک محسن ہیں مرے حضرت اختر، اس جا
ہو ملاقات تو پہنچائیں گے تسلیم عقیل
گو کہ ہنس کر وہ کہیں گے نہیں شرعی یہ سلام
نہیں 'تسلیم' کو اسلام سے نسبت بھی قلیل
معذرت کرکے یہ کہیے گا، یہی ہے کافی
لفظ تسلیم میں اک کام تو آخر ہے دخیل
قافیہ اور بھی باقی ہیں مگر وقت نہیں
تاک سے، نیند کے جھونکوں میں نکلتی ہے زفیل
احتشام، حضرت اعجاز سبھی اچھے ہیں
ختم نامہ ہے، بجا لاتا ہے تسلیم، عقیل
ہوشمندی کی مری آپ کے کی ہے تعریف
حسن ظن آپ کا دراصل ہوا میرا کفیل
خود جو ہو جہل مرکب، اسے کیا عقل سے کام
ہاں مگر شک نہیں اس میں کہ محمدؐ تھے عقیل

تاریخی اعتبار سے ان ادبی خطوط کی الگ اہمیت ہے!

---

1 نیا عہد نامہ از خلیل الرحمن اعظمی

■

Prof. Manazir Ashiq Harganvi
Kohsaar, Bhikanpur -3
Bhagalpur - 812001 (Bihar)
Mob.: 9430966155

فیضان الحق

خدیجہ عظیم سے پہلی اور آخری ملاقات

اردو ادب کی تاریخ میں ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کی پانچ بہنیں ہوں اور سب کی سب اردو زبان وادب کی بڑی عالمہ میں شمار ہوتی ہوں۔ شاہدہ زیدی، صابرہ زیدی، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی اور خدیجہ عظیم ایسی ہی پانچ بہنوں کے نام ہیں، جن میں سے ہر ایک کی اپنی منفرد شناخت قائم ہے۔ ان سب کی والدہ بیگم مختار فاطمہ زیدی خود ایک شاعرہ تھیں اور تاریخ ادب اردو کی عظیم خاتون صالحہ عابد حسین کی سگی بہن تھیں، جن کا سلسلہ نسب خواجہ الطاف حسین حالی تک پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ خدیجہ عظیم مشہور فکشن نگار انور عظیم کی بیوی تھیں۔ انھوں نے پوری زندگی انور عظیم کا ساتھ دیا اور مشکل حالات میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

انور عظیم جس وقت سے میری تحقیق کا موضوع بنے، میں نے ان کی شخصیت، کارنامے اور اہل وعیال کے متعلق معلومات جمع کرنی شروع کر دی تھیں۔ اساتذۂ کرام کے علاوہ انور عظیم کے دوست احباب اور ان کے ملنے جلنے والوں سے بھی رابطہ کیا۔ اسی دوران مجھے علم ہوا کہ چھوٹے پردے کی مشہور اداکارہ اور کتھک رقص کی ماہر 'نیلیما عظیم'، انور عظیم کی صاحب زادی ہیں، اور بالی ووڈ کی سرزمین شہر ممبئی میں قیام پذیر ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ فلمی دنیا کا چمکتا ستارہ شاہد کپور ان کا حقیقی ناتی اور نیلیما عظیم کا بڑا بیٹا ہے۔ یہ سب جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی، کیونکہ نیلیما عظیم سے رابطہ ہو جانے کے سبب ان کے والد کے متعلق اچھی طرح معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں۔ لہٰذا کام کو آگے بڑھانے سے قبل میری پہلی ترجیح نیلیما عظیم سے رابطہ کرنا تھا۔

مجھے یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ انور عظیم کی بیوی خدیجہ عظیم دہلی میں رہتی ہیں لیکن ان کی رہائش گاہ نا معلوم تھی۔ میں نے نیلیما عظیم کو ایڈریس پوچھنے کی غرض سے ایک بار پھر میسج کیا، لیکن شائد مصروفیت زیادہ ہونے کی وجہ سے پیغام توجہ کا محتاج رہ گیا۔ اس بیچ میں نے دوسرے لوگوں سے بھی ان کا پتہ جاننے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہی ہاتھ لگی۔ میں نے تیسری بار نیلیما عظیم کو میسج کیا، لیکن 'ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا'۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی اور میں نے دوسرے ذرائع سے پتہ حاصل کرنے کی کوشش تیز کر دی۔ اور جب کہیں سے کوئی سراغ ملتا نظر نہ آیا تو میں نے ایک بار پھر ہمت کی اور سوچا اس بار نیلیما عظیم کو میسج نہیں بلکہ براہ راست کال کروں گا۔ اور شام قریب پانچ بجے میں نے انھیں کال کر دیا۔ لیکن ہوا وہی... جس کا ڈر تھا... فون ریسیو نہیں کیا گیا۔

میں نے سوچا اب ملاقات کا کوئی راستہ نہیں۔ ساری کوششیں بے کار ہیں۔ میں اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھا کہ اسی بیچ نیلیما عظیم کی کال بیک آ گئی۔ میں نے فون اٹھایا، تعارف کرایا، اور اپنا مقصد بیان کیا۔ انھوں نے نہایت شفقت سے بات کی جس سے میری حوصلہ افزائی ہوئی۔ میں نے ان سے خدیجہ عظیم کی رہائش گاہ کا ایڈریس اور رابطہ نمبر مانگا۔ انھوں نے فوراً بھیجنے کی بات کہتے ہوئے فون رکھ دیا۔ چند ہی منٹ بعد واٹس اپ پر ان کے بھائی احمر پاشا کا لینڈ لائن نمبر موصول ہوا۔ میں نے میڈم کا شکریہ ادا کیا اور لینڈ لائن نمبر پر کال لگائی۔ ادھر سے کسی ادھیڑ عمر خاتون کی آواز آئی جو آسانی سے میری بات بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ بہت کوششوں کے بعد اسے یہ سمجھ آیا کہ میں خدیجہ عظیم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ خیر اس نے خدیجہ میڈم کو بلا کر فون ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

فون پر ایک ضعیف اور بزرگ خاتون کی دھیمی دھیمی اور نرم آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔۔ آپ کون صاحب ہیں؟''۔ یہ خدیجہ عظیم تھیں، انور عظیم کی بیوی۔ میں نے انھیں اپنا تعارف کرایا اور اپنے کام سے متعلق جانکاری دی۔ انور عظیم کا نام سن کر وہ بہت خوش ہوئیں اور کہا کہ آپ کام کیجیے مجھ سے جو بھی ہو سکے گا مدد کروں گی۔ میں نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے کہا کبھی بھی آ جائیے۔

اگلی صبح (13 اپریل 2019) قریب گیارہ بجے میں ان سے ملاقات کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے نکل پڑا۔

سامنے والے کمرے سے ایک ضعیفہ اپنی واکر (Zimmer frame) ٹیکتے ہوئے آہستہ آہستہ میری جانب بڑھتی نظر آئیں۔ گہرے نیلے رنگ کا سوتی شلوار

سوٹ، جس میں سفید پھول پتیاں بنی ہوئی تھیں، بالکل سفید بال جو ایک لاسٹک سے پیچھے بندھے ہوئے تھے، سفید سفید، جھریوں والا چہرہ، اور ہاتھوں سے لٹکتی ہوئی کھال، آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں، لیکن ان میں ایک چمک برقرار، میں انھیں دیکھتے ہی سلام کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا، اور انھیں سہارا دینے کے لیے آگے بڑھا۔ وہ دھیرے دھیرے آ کر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اور پھر شفقت بھری نظروں سے میری جانب دیکھ کر پوچھا:

''تو آپ ہی ہیں فیضان الحق؟''

''جی میڈم'' (آہستہ سے میرے ہونٹ ہلے)

''اچھا اچھا بہت خوب۔۔ اچھا ہوا آپ آ گئے... آپ کے کام کا اصل موضوع کیا ہے؟

''انور عظیم کی افسانہ نگاری.. 'اجنبی فاصلے' کی روشنی میں'' (میں نے تھوڑی بلند آواز میں جواب دیا تا کہ وہ آسانی سے سن سکیں)

''اچھا! افسانہ نگاری پر''... ''جی میڈم''

''افسانے تو انور نے بہت لکھے ہیں۔۔ اور میں کیا کہوں، ماشاء اللہ بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔''

'جی میڈم... بحیثیت ایک قاری مجھے بھی ان کے افسانوں نے کافی متاثر کیا۔''

''انور لکھتے تو بہت تھے لیکن ان کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ کبھی بھی اپنی چیزوں کی حفاظت نہیں کی۔''

'اچھا!' (یہ لفظ بے ساختہ میرے منھ سے کچھ اس انداز سے نکلا جس میں مزید جاننے کی خواہش چھپی ہوئی تھی)

''ہاں! جہاں لکھا وہیں چھوڑ دیا۔ کوئی پرواہ نہیں سنبھال کر رکھنے کی۔ ایک بھی چیز انھوں نے حفاظت سے رکھنے کی کوشش نہیں کی''۔

(میں خاموشی سے سر ہلاتا جاتا تھا اور ان کی ایک ایک بات توجہ سے سنتا جاتا تھا۔)

''میں کیا بتاؤں جب میں نے ان کے افسانے جمع کرنے شروع کیے تو میرے سر کے بال سفید ہو گئے''

''ہاہاہا...'' (ہم دونوں نے ہلکی آواز میں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا)۔

''میڈم آخر کیا وجہ رہی کہ اتنے اچھے افسانے لکھنے کے باوجود انھیں ادبی دنیا میں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے؟'' (میں نے سوال کیا)

''یہ بات آپ نے صحیح کہی۔ انھیں ادبی دنیا میں ان کا حق نہیں ملا۔ اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ ان کے بعد لوگوں نے ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ یار دوست بھی غافل ہو گئے۔ اور کچھ میرا بھی قصور ہے۔ میں تو اپنے آپ کو انور عظیم کا گنہگار مانتی ہوں کہ میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکی۔''

''نہیں میڈم ایسا نہیں ہے۔۔ آپ نے تو پھر بھی بہت کچھ کیا... شاید آپ کا ساتھ دینے والے لوگ نہیں ملے''۔ (میں نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی کہ انھیں جذباتی ہونے سے بچایا جا سکے، کیوں کہ یہ بات کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے)

''ہاں یہ بات صحیح کہی آپ نے۔ ان کے کام کو آگے بڑھانے والے لوگ نہیں ملے مجھے۔۔ بلکہ لوگوں نے ان کے ساتھ بہت برا کیا... اب میں نام نہیں لوں گی لیکن یہ سچ ہے کی ان کی کتنی ہی چیزیں لوگوں نے غائب کر دیں۔''

''اچھا!!! میڈم کیا اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ لوگوں نے ان کی تخلیقات اپنے نام سے شائع کرا دیں؟''

''نہیں اس کے امکانات بہت کم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انور جو بھی لکھتے تھے اس کی اتنی شہرت ہو جاتی تھی کہ پھر دوسرے نام سے اسے چھپوانا یا چوری کرنا مشکل ہے''۔

''اچھا اگر ایسا نہیں ہے تو پھر غائب کرنے یا چرانے کی دوسری وجوہات کیا ہیں؟''

''بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں... ممکن ہے ان کے دل میں کوئی ذاتی خلش رہی ہو۔ یا اور بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ مجھے تو معلوم نہیں آپ نے ان کی کون کون سی کہانیاں پڑھی ہیں... ان کی کئی کہانیاں تو بہت دلچسپ ہیں''

میں نے افسانوی مجموعہ 'اجنبی فاصلے' ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا: ''اس مجموعے کی تمام کہانیاں پڑھ لی ہیں میڈم۔''

''اچھا اچھا!... یہ پڑھا آپ نے 'آنگن کی دھوپ''؟

''جی میڈم! مجھے تو لگتا ہے یہ شاہد کپور اور آپ کی پوتی میگھا پر لکھی گئی کہانی ہے۔''

''Exactly۔۔ آپ نے بالکل صحیح کہا۔ اس کہانی کے مرکزی کردار وہی دونوں ہیں۔ اور ''مردہ گھوڑے کی آنکھیں؟''... کیا زبردست کہانی ہے۔ اسی طرح 'سفید آنکھیں'۔ اور 'ہانپتے کانپتے لوگ' پڑھی ہے آپ نے؟

'جی میڈم میں نے یہ تمام کہانیاں پڑھی ہیں۔ اور موضوع کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان نے مجھے کافی متاثر کیا ہے۔

''ارے کیا غضب کی کہانی ہے ''دھرتی کا بوجھ''... بہت اچھی کہانی ہے... انور لکھتے بہت اچھا تھے''۔

کہانیوں سے متعلق باتیں کرتے کرتے وہ چپ ہو گئیں۔ پھر تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک دو باتیں کرنے کے بعد وہ کچھ سوچنے لگتی تھیں۔ جیسے کچھ تلاش رہی ہوں۔

تھوڑی دیر بعد میں نے ایک اور سوال کیا ''میڈم! انور عظیم کے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع معلوم ہوتا ہے۔ کون کون تھے ان کے خاص ملنے جلنے والوں میں؟

''ارے وہ تو ہمیشہ دوستوں ہی کے بیچ رہتے تھے۔ گھومنے پھرنے کا اتنا شوق کہ کوئی مل گیا تو دو دو، تین تین دن گھر سے غائب۔ میں ڈھونڈھتی پھرتی تھی کہاں گئے۔ سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس، اختر الایمان، کیفی اعظمی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، رتن سنگھ، شمیم حنفی اور بلراج مینرا وغیرہ سے تو بہت گہری دوستی تھی... کبھی بھی کوئی دوست گھر آ جاتا تو دروازہ کھولتے ہی انور کے دونوں ہاتھ یوں پھیل جاتے (اپنے دونوں بازوؤں کو وا کرتے ہوئے اشارہ کیا) اور آنے والے کو اپنی بانہوں میں بھر لیتے... یہ کہتے ہوئے کہ ''ارے!! آپ آ گئے... میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا... آیئے آیئے... اندر تشریف لایئے''... اس طرح سے ان کے ملنے جلنے والے اور بھی بہت لوگ تھے... اب تو میرا ذہن بھی کام نہیں کرتا... اور نا ہی کسی سے مل پاتی ہوں... اس لیے دھیرے دھیرے وہ تمام یادیں ختم ہوتی جا رہی ہیں''۔

''میڈم انور عظیم کی افتادِ طبع کے متعلق کیا خیال ہے۔ وہ ہنسی مذاق بھی کرتے تھے یا سنجیدہ رہتے تھے؟

''ارے انور تو بہت مزاقیہ انسان تھے۔ خوب ہنساتے تھے سب کو۔ لیکن آخر میں تھوڑا پریشان رہنے لگے تھے اور پہلے جیسے نہ رہے تھے۔''

میڈم میں نے پڑھا ہے کہ وہ رسم و رواج اور بناؤ سنگار کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے متعلق کیا خیال ہے آپ کا؟

''بالکل۔۔۔ وہ کبھی بھی ان سب چیزوں کی طرف دھیان نہیں دیتے تھے۔ شادی بیاہ میں جانے کے لیے بھی سادے کپڑے پہن کر نکل پڑتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے بہت اصرار کیا کہ اچھے کپڑے پہن لیجیے۔ تو کہنے لگے میرا ایک اچھا سا جوڑا نکال لو اور لے جا کر وہاں ٹانگ دینا.. کوئی پوچھے تو بتا دینا یہ انور عظیم ہیں.. اور میں نہیں جاؤں گا۔''

ہاہاہا.. (مجھے یہ بات سن کر ہنسی آ گئی)

میڈم انور عظیم نے ناول اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

''ہاں ہاں! انھوں نے کئی ناول لکھے اور ڈرامے تو بہت اچھے لکھے ہیں۔ ان کے ڈرامے کئی جگہ اسٹیج کیے گئے اور ریڈیو پر پڑھے گئے۔ ''جھلستے جنگل'' ان کا کتنا شاندار ناول ہے۔ (اس ناول پر خدیجہ عظیم کا ایک تجزیہ بھی ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود ہے جو انھیں کی دی ہوئی کتابوں میں مخطوطے کی شکل میں موجود تھا)۔

میڈم! انور عظیم کی ترجمہ نگاری کے متعلق کچھ بتائیے انھوں نے کئی فن پاروں کے ترجمے کیے ہیں۔ خاص طور پر روسی زبان سے۔

''ہاں انھوں نے ترجمے بھی کیے ہیں۔ کچھ ترجمے ہم دونوں نے مل کر کیے ہیں۔ روسی زبان انور عظیم سے اچھی مجھے آتی تھی۔ میں نے انا کارنیا جیسے فن پاروں کو اردو میں منتقل کیا۔ انور نے میکسم گورکی کے سرمائے کو اردو میں منتقل کیا.. اس طرح کام تو انور نے بہت کیے ہیں''

میڈم! کیا انور عظیم نے کبھی بحیثیت استاد خدمت انجام دی ہے؟

''نہیں۔ وہ کبھی ٹیچر نہیں رہے۔۔ انھوں نے اخباروں میں کام کیا۔ بلٹز کی ادارت کی۔ قومی آواز میں لکھتے رہے اس کے علاوہ دیگر علمی، ادبی و صحافتی مصروفیات رہیں لیکن ٹیچنگ انھوں نے نہیں کی۔

میڈم! انور عظیم اصلاً کہاں کے رہنے والے تھے۔ اور ان کی زندگی کا زیادہ وقت کہاں صرف ہوا؟

''وہ بہار کے رہنے والے تھے۔ ان کی تعلیم بھی بہار ہی میں ہوئی۔ ان کے والد 'بدرالدین احمد' ایک ڈاکٹر تھے۔ انور بعد میں دہلی آ گئے تھے.. وہ کلکتہ میں بھی رہے، کلکتے میں میں ان کے ساتھ نہیں تھی۔ ممبئی میں بلٹز پیپر کی ادارت کے دوران میں ان کے ساتھ رہی.. پھر روس بھی انھیں کے ساتھ جانا ہوا، جہاں ہم لوگوں نے پانچ سال گزارے.. وہیں رہ کر ہم نے روسی زبان سیکھی۔ اس کے بعد وہ دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی وابستہ رہے۔ اخیر عمر میں ان کا قیام بھی یہیں رہا اور ان کا انتقال بھی دہلی ہی میں ہوا۔''

میڈم: آپ کا آبائی وطن کہاں ہے؟ اور آپ کے بھائی بہنوں میں کون کون ہیں؟

''میں اصلاً پانی پت کی رہنے والی ہوں۔ میرے والد 'سید محمد مستحسن زیدی' کا انتقال ہو چکا تھا اور پھر... تقسیم ہند کے بعد ہم لوگ اپنی اماں 'بیگم مختار فاطمہ زیدی' کے ساتھ علی گڑھ آ گئے... میری پانچ بہنیں تھیں... صابرہ، ساجدہ، زاہدہ، شاہدہ اور میں سب سے چھوٹی خدیجہ... ہماری اماں شیعہ مذہب کو مانتی تھیں اور خوب مجلسیں پڑھتی تھیں۔... وہ بہت اچھی اردو جانتی تھیں اور شاعرہ بھی تھیں ('چراغ تہ داماں' ان کا شعری مجموعہ ہے جسے جابر حسین نے خدیجہ عظیم کی مدد سے مرتب کر کے شائع کیا ہے، اس کا ٹائٹل نیم 'انور عظیم' نے ہی منتخب کیا تھا)... صابرہ کا تو جلد ہی انتقال ہو گیا تھا۔ شاہدہ نے ایک ہندو سے شادی کر لی۔ ساجدہ نے قیصر حسین زیدی سے شادی کی... زاہدہ نے شادی ہی نہیں کی... اور میری شادی انور سے ہو گئی'' ۔میڈم ایک ایک بات بہت ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھیں اور میں خاموشی سے سنتا جا رہا تھا انھوں نے پھر کہنا شروع کیا:

''جب انور سے میری شادی لگی تو خوب ہنگامہ ہوا۔ لوگوں نے کہا انور تو سنّی ہے اور ہم لوگ شیعہ ہیں، لیکن میری اماں نے کہا یہ سب کچھ نہیں... بس لڑکا اچھا ہونا چاہیے... تو ان کی مرضی سے ہم لوگوں کی شادی ہو گئی.. شادی کا ایک دلچسپ قصہ سناتی ہوں... جب نکاح کا وقت قریب آیا تو ایک عورت نے مجھ سے آ کر کہا کہ زیادہ مت بولنا، خاموش ہی رہنا، بس صرف ہاں کر دینا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ پھر جب سب لوگ نکاح پڑھانے آئے تو میں کچھ بول ہی نہیں رہی تھی... وہ لوگ پوچھا کیے میں چپ چاپ بیٹھی رہی.. نئی نویلی دلہن کی طرح شرماتی ہوئی.. اسی بیچ انھیں میں سے کسی نے کہا: ''یہ کیا بے وقوفی ہے، تم کب سے شرمانے لگی۔۔ تم تو پڑھی لکھی ہو''... تب میں بول پڑی اور کہا: ''میں کہاں شرماتی... مجھے تو ایسا ایسا کرنے کو کہا گیا ہے''... پھر سب لوگ خوب ہنسے۔'' (مجھے بھی میڈم کا یہ قصہ سن کر ہنسی آ گئی... اور پھر تھوڑی دیر تک خاموشی رہی)

اچھا میڈم! یہ بتائیے نیلیما عظیم فلمی دنیا کی طرف کیسے گئیں؟ اور کیا انور عظیم انھیں سپورٹ کرتے تھے؟

''ہاں انور بھی سپورٹ کرتے تھے۔ وہ تو بہت آزاد خیال تھے... اور پھر نیلیما کی شروع ہی سے ڈانس میں دلچسپی تھی۔ کتھک میں اس نے مہارت حاصل کی۔ پھر اس نے اپنا راستہ خود بنایا۔ اسی طرح وہ دھیرے دھیرے ٹی وی دنیا اور فلمی دنیا میں پہنچ گئی۔''

میڈم اپنے ناتی ''شاہد کپور' اور 'ایشان کھٹر' کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ لوگ اپنے نانا کو جانتے ہیں یا نہیں؟

''ہاں ہاں بالکل، شاہد تو اپنے نانا کا بہت چہیتا تھا۔ وہ اسے انگلی پکڑ کر اسکول لاتے لے جاتے تھے۔ اور فلمی دنیا میں جانے کے بعد بھی وقت نکال کر شاہد ان سے ملنے آتا تھا۔ بٹ ''ایشان'' Ishan is a very loving boy... بہت پیارا بچہ ہے وہ... میں اس کے برتھ ڈے پر اس کے لیے شاعری لکھ کے دیتی ہوں۔ وہ مجھے بہت مانتا ہے۔ وہ بہت پیارا بچہ ہے۔ دہلی جب بھی آتا ہے مجھ سے ضرور ملتا ہے۔ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔''

میڈم آپ کے کتنے بیٹے بیٹیاں ہیں؟

''میرا بس ایک بیٹا احمد ندیم انور ہے۔ گھر پر اسے ہم لوگ 'پاشا' کہتے ہیں۔ اپنے اسی بیٹے اور بہو ہیملا انور کے ساتھ میں یہاں رہتی ہوں۔ دونوں کالج میں پروفیسر ہیں۔ باقی میری ایک بیٹی نیلیما عظیم ہے جسے ہم 'کنول' کہہ کر پکارتے ہیں۔ وہ ممبئی میں رہتی ہے۔

میڈم! آپ کے خاندان میں کئی طرح کے لوگ دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

''جی! میرے خاندان میں ہر رنگ آپ کو مل جائے گا۔ میرا خاندان پچ رنگی ہے۔ کوئی بہار سے ہے تو کوئی

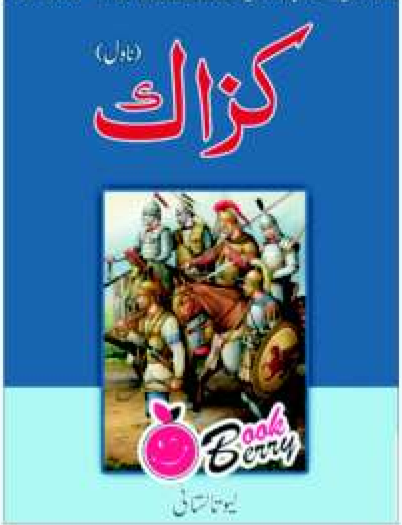

پانی پت سے۔ میری بہو ہیملا انور کشمیر کی ہے۔ میری ایک بہن نے غیر مسلم سے شادی کی۔ خود میری شادی سنّی کے ساتھ ہوئی۔ میری بیٹی کنول نے بھی اپنی مرضی سے شادی کی... تو ہمارے یہاں ذات پات، اور مذہب نہیں دیکھا جاتا ہے۔ ہم بس اپنی مرضی سے کرتے ہیں جو بھی کرتے ہیں۔ ہمارے گھر میں عیسیٰ مسیح کی تصویر بھی ہے۔ بعض لوگوں کو اعتراض ہوا کہ یہ کیا ہے۔ میں نے کہا میری مرضی... مجھے پسند ہے، میں رکھتی ہوں... اس کا مطلب یہ تھوڑی کہ ہم عیسائی ہیں... بس ہمیں جو اچھا لگتا ہے ہم کرتے ہیں۔ یہ سب ہماری اپنی پسند ہے۔ آدمی کو ایک اچھا انسان ہونا چاہیے بس۔''

گفتگو کے دوران ہی وہ میرے ہاتھوں کے سہارے ایک دو کمروں میں گئیں جہاں وہ اپنی کتابیں تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن کتابیں نہ مل سکیں۔ بالآخر جب وہ تھک کر بیٹھ گئیں تو میں نے کام کرنے والی آنٹی سے پوچھا: آنٹی! کیا کہیں کچھ کتابیں رکھی ہیں اردو کی؟ میڈم تلاش کر رہی ہیں''۔ انھوں نے کچھ دیر تک سوچا پھر ایک کمرے میں کونے پر رکھی کچھ کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ اس میں دیکھ لو یہ تو نہیں ہیں، بھابھی نے ردی پیپر خریدنے والے کو دینے کے لیے یہ سب نکال کر رکھا ہے۔ وہ کل ہی اٹھانے آنے والا تھا لیکن ابھی آیا نہیں ہے۔

میں نے وہاں جا کر دیکھا کچھ کتابیں ایک کونے میں فرش پر رکھی ہوئی تھیں۔ خدیجہ میڈم بھی میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں تک آگئیں۔ وہ ساری کتابیں اردو کی تھیں۔ وہی کتابیں جن پر انور عظیم یا خدیجہ عظیم کا ہاتھ پڑا تھا۔ کتابوں کو دیکھ کر خدیجہ میڈم نے کہا: ''آپ بہت اچھے وقت پر آگئے ورنہ میں پوری زندگی روتی رہ جاتی... اور مجھے پتہ بھی نہ چل پاتا کہ میری کتابیں کیا ہوئیں''۔ میں ایک ایک کتاب اٹھا کر انھیں دکھاتا رہا۔ وہ ہر کتاب کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں، پھر انھوں نے ان تمام کتابوں کو میرے حوالے کرتے ہوئے اور میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا: ''آپ خوش قسمت ہیں جو آپ کو یہ کتابیں مل گئیں، اور میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم مل گئے۔ تم نے میرا کام آسان کر دیا۔ ان کتابوں کو اب تم سنبھالو اور کام کو آگے بڑھاؤ''۔ میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ اور میں نے دل کی گہرائیوں سے میڈم کا شکریہ ادا کیا۔

یہ تقریباً 30،35 کتابیں تھیں۔ ان میں سے کچھ کتابیں میں نے بیگ میں رکھی اور بقیہ کا ایک بنڈل بنا لیا۔ کچھ انور عظیم کے تراجم تھے اور کچھ خدیجہ عظیم کے۔ باقی فکشن کی اردو انگریزی کی متعدد کتابیں تھیں۔ ان میں کچھ ایسی کتابیں بھی تھیں جو مصنفین کی جانب سے انور عظیم کو تحفتاً پیش کی گئیں تھیں۔ کسی ادیب کے گھر سے اس سے بڑا تحفہ اور کیا مل سکتا ہے، میں خوش قسمت سمجھتا ہوں اپنے آپ کو کہ یہ تحفہ میرے حصے میں آیا۔

اب وقت کافی ہو چکا تھا۔ میڈم کی بہو ہیملا اور بیٹا پاشا بھی کافی پہلے گھر آچکے تھے۔ اسی بیچ ان کی بہو نے آکر کہا: ''میڈم نوے سال کے اوپر چل رہی ہیں۔ اس لیے انھیں زیادہ دیر تک بٹھانا ٹھیک نہیں۔ آپ تھوڑا تھوڑا کر کے پوچھ لیجیے'' مجھے یہ بات سنتے ہی اپنے آپ میں بہت شرمندگی ہوئی اور سوچا واقعی مجھے اتنی دیر تک نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔ لیکن میں بھی مجبور تھا۔ کیوں کہ میں نے کئی مرتبہ اٹھنے کی کوشش کی لیکن خدیجہ میڈم نے ہر بار بٹھا لیا۔ مجھے پوری ملاقات میں ایسا محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے نہیں بلکہ اپنے کسی بچھڑ کر ملنے والے بیٹے سے باتیں کر رہی ہیں۔ پوری گفتگو کے دوران ان کے چہرے پر مسکراہٹ اور بشاشت تیرتی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آج ایک مدت کے بعد انھیں کسی سے اپنے مطلب کی گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے۔ اور وہ اپنی ساری باتیں کہہ دینا چاہتی ہیں۔ (کسے خبر تھی کہ واقعی ان کے پاس وقت بہت کم ہے اور ان کی باتیں سننے والا کوئی نہیں) انھوں نے یہ بھی کہا کہ آپ چاہیں تو یہاں آرام کر سکتے ہیں۔ پھر کھانا کھا پی کر جائیے گا۔ لیکن اب اور تاخیر کرنے کی نا مجھ میں ہمت تھی اور نا ہی مناسب تھا۔ اس لیے میں نے خدیجہ میڈم سے بادل ناخواستہ اجازت لے لی۔ جاتے جاتے انھوں نے پھر چائے منگا کر پلائی۔ چائے پی کر میں نے اپنا بیگ اور کتابوں کا بنڈل اٹھایا۔ اور میڈم کی دعائیں لیتا ہوا فلیٹ سے باہر نکل گیا۔ خدا حافظ کہتے وقت میں نے دیکھا خدیجہ میڈم کی آنکھوں میں ایک اطمینان اور خوشی کی چمک تھی۔ اور میرا دل خوشیوں سے بھرا ہوا تھا۔

خدیجہ عظیم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور جلد ہی دوبارہ ملنے کی حسرت دل میں باقی تھی، لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اب یہی ملاقات آخری بھی ثابت ہوگی۔ دوبارہ احمر ندیم انور پاشا سے ملنے جب میں ان کی رہائش گاہ پر پہنچا (27 نومبر 2019) تو رات کے قریب آٹھ بج چکے تھے اور خدیجہ میڈم دوا کھا کر لیٹ گئی تھیں۔ طبیعت زیادہ ناساز ہونے کی وجہ سے انھیں جگانا بھی مناسب نہیں تھا۔ گرچہ میرے دل میں کئی بار یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ملاقات ہو جاتی تو اچھا تھا۔ لیکن کاتب تقدیر نے دوسری ملاقات لکھی ہی کہاں تھی۔

18 جنوری 2020 کو مجھے احمر انور پاشا سر کے ذریعے یہ جانکاہ خبر ملی کہ خدیجہ عظیم اب اس دنیا میں نہیں

خدیجہ عظیم کو اردو اورانگریزی کے ساتھ ساتھ روسی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ انھوں نے انور عظیم کے ساتھ ماسکو میں پانچ سال قیام کے دوران بہت سے روسی فن پاروں کو اردو میں منتقل کیا اور پھر وہاں سے واپس آنے کے بعد ساہتیہ اکادمی دھلی سے وابستہ ھو کر متعدد ترجمے کیے۔ ان کی شاھکار مترجم کتابوں میں لیو تالستایے کے مشھور زمانہ ناول 'انّا کارنیا' اور ولادیمیر کرالنکو کی خود نوشت 'نابینا موسیقار' کو پیش کیا جاسکتا ھے۔

رہیں۔ ان کا انتقال دو دن قبل 16 جنوری 2020 کی دوپہر کو ہوا اور انھیں آئی پی ایکسٹنشن، دہلی کے ایک قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی پیدائش 15 جون 1931 کو پانی پت میں ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے انھوں نے قریب نوے سال کی ایک طویل عمر گزارنے کے بعد اس جہان فانی کو خیر باد کہا۔

خدیجہ عظیم کو اردو اور انگریزی کے ساتھ ساتھ روسی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ انھوں نے انور عظیم کے ساتھ ماسکو میں پانچ سال قیام کے دوران بہت سے روسی فن پاروں کو اردو میں منتقل کیا اور پھر وہاں سے واپس آنے کے بعد ساہتیہ اکادمی دہلی سے وابستہ ہو کر متعدد ترجمے کیے۔ ان کی شاہکار مترجم کتابوں میں لیو تالستائے کے مشہور زمانہ ناول 'انا کارنیا' اور ولادیمیر کرالنکو کی خود نوشت 'نابینا موسیقار' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے کیے اور تنقیدی و تحقیقی مضامین لکھے۔ انھوں نے انور عظیم کی طرح خاموشی سے اردو زبان و ادب کی خدمت کی اور ترجمہ نگاری کے میدان میں لازوال کارنامے انجام دیے۔

خدیجہ عظیم کا ذوق ادبی تھا۔ وہ نہایت ملنسار، خوش خصلت، خوش مزاج اور دوسروں کی مدد کو ہمہ وقت تیار رہنے والی خاتون تھیں، جس کا اندازہ مجھے پہلی ہی ملاقات میں ہو گیا تھا۔ اور آج جب ان سے ملنے جلنے والوں کی زبانی ان کا ذکر سنتا ہوں تو اس بات کی مزید توثیق ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے علمی کارناموں کو دوام بخشے۔ (آمین)

■

Faizanul Haque
Abbasi Apartment, R 301/2 Jogabai Ext.
Jamia Nagar, Batla house,
New Delhi-110025
Mobile No: 8800297878

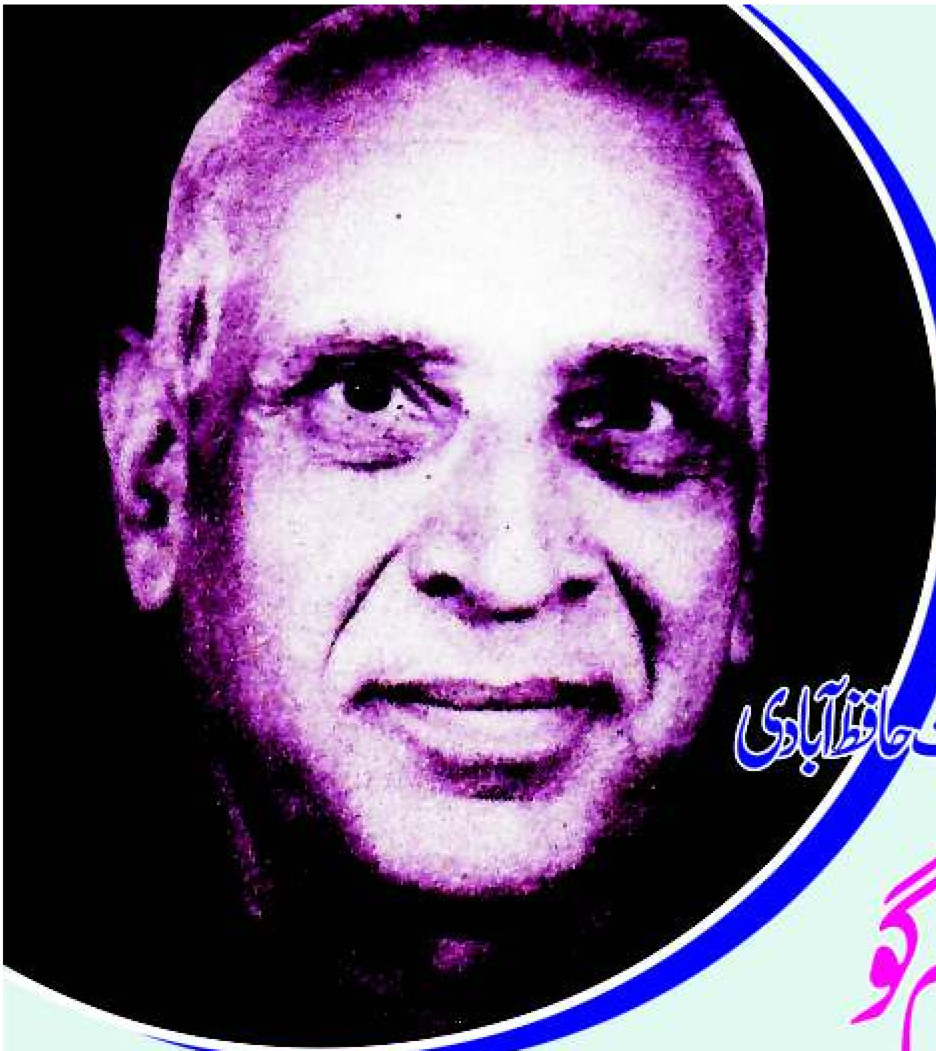

کمار پانی پتی

ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ عشرت حافظ آبادی

بحیثیت نظم گو

کیوں نہ ہو نظموں میں میری چاند تاروں کی چھبن
عیش[1] کا عشرت ہوں، ہیرالال ہوں اقبال کا!

عشرت کی منظومات کی سب سے بڑی خوبی ان کا وہ انداز بیاں ہے جس کے سہارے موصوف کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے اپنی تخلیق کو حالاتِ حاضرہ کی صحیح اور سچی تصویر بنادیتے ہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی کے معروف انگریزی نقاد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مستند الفاظ میں 'آپ' اپنے عہد کو اپنی روح میں بسا کر ہی کچھ تحریر فرماتے ہیں (He writes with his age in his bones) ۔

مثال کے طور پر دیکھیے ان کے شاہکار 'ہولی' (1946) اور دیوالی (1959) کو ہی صدیوں سے ہندوستان میں ہندو مسلمان یہ تیوہار اکٹھا مل کر مناتے آرہے تھے۔ سرحد کے اُس پار ہمارے علاقے میں رہنے والے ہر مذہب، ہر قوم اور ہر فرقے کے لوگ آپس میں بڑے پیار سے مل جل کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہاں عید اور دیوالی کے تیوہار ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے یکساں خوشیوں اور مسرتوں کی بہار لاتے تھے۔ دیوالی کے موقعے پر ہندوؤں کے گھروں میں بنی ہوئی مٹھائیوں کا انتظار اکثر مسلمانوں کے گھروں میں رہتا تھا اور عید کے موقعے پر مسلمانوں کے گھروں میں بنی ہوئی سویاں ہندوؤں کے گھروں میں بڑے چاؤ سے پروسی جاتی تھیں۔ کانٹا مسلمان کو چبھتا تھا تو تکلیف ہندو کو ہوتی تھی۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میری چچازاد بہنوں کی اکثر سہیلیاں مسلمان گھروں سے تھیں اور وہ اپنا زیادہ تر وقت ایک دوسرے کے گھروں میں ہی گزارتی تھیں۔ میرے بچپن کے کئی دوست مسلمان تھے جو اکثر ہمارے گھر میں ہی کھیلا کرتے تھے...

مگر 47-1946 میں ایک دم ایک ایسا انقلاب سا برپا ہونے لگا جس کے زیر اثر اس خوبصورت خطے کو کسی بدذات کی نظر لگ گئی۔ چنانچہ دیکھیے 15 مارچ 1946 کو لکھی گئی نظم 'ہولی' کی شروعات عشرت کہاں سے کر رہے ہیں۔

ہندو نے اردو مسلماں نے سا کھا اپنی ہے جگ بھر میں کھولی
آپس کی لڑائی سے پہلے کیوں من کی بات نہیں تولی
لکھ تو ہولی پر رہے ہیں لیکن دیکھیے بات کہاں سے شروع کر رہے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں، عزیزوں، ساتھیوں اور بزرگوں کو پرانے دنوں اور رشتوں کی یاد دلاتے ہوئے اپنے ہی انداز میں سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اک چہرے کے دو نین ہیں ہم، اک پنچھی کے دو پنکھ ہیں ہم
اک منزل کے دو راہی ہیں، ہم دونوں ہیں دامن اور چولی

اور پھر اخلاقی اور مذہبی سطح پر انھیں پیار کا واسطہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

رام اور رحیم کا جھگڑا کیا؟ کرشن اور کریم میں فرق ہی کیوں؟
سب نام ہیں یہ اس مالک کے، سب اس کے پجاری ہم جولی
اور پھر ہم، ہندو ہوں یا مسلمان، باسی بھی تو ایک ہی ملک کے ہیں۔ ہم ایک ہی ہوا میں سانس لیتے ہیں، ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں، ایک ہی طرح کے کپڑے پہنتے ہیں، ایک ہی طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں، تو پھر یہ تفرقات کیوں؟ یہ جھگڑے کیوں؟

آپس میں اَن بن کیوں؟
جب ایک ہی دیس میں رہتے ہیں، دونوں کا اَن جل ایک ساتھ
یوں مل کر رہنے والوں میں، پھبتی نہیں یہ بولی ٹھولی!
دونوں قوموں کا ایک ہی محور تھا اور ایک ہی مقصد۔ دونوں ایک ہی مقصد کے لیے غیر ملکی حکومت کے خلاف بڑھ رہی تھیں۔ پھر دونوں میں تفرقات کیوں؟

1 عشرت کے والد محترم ڈاکٹر دولت رام عیش حافظ آبادی

بھارت آزاد کراتا ہے، اس بات کو پورا کرنے کو
واجب ہے ایک بنالیں ہم ہندو ومسلماں کی ٹولی!

عشرت نہیں چاہتے تھے کہ ہندو مسلمان بکھریں، علیحدہ علیحدہ پگڈنڈیوں کی جانب لپکیں، انگریزوں کی چالوں میں پھنس کر مختلف بولیاں بولتے ہوئے اپنے راستے سے بھٹکیں۔ چنانچہ ان کے اپنے لفظوں میں

سنسار کی کھیتی پھولی ہے، پھولوں پر جوبن آیا ہے
رحمت کی برکھا پڑتی ہے سب مل کر پھیلا دو جھولی!

کتنے بہترین انداز میں انھیں ایک ہوکر ایک ہی راستے پر چلتے ہوئے مل کر قدم بڑھانے کی تلقین کرتے ہیں!

اور کیونکہ اس تیوہار کے موقعے پر ہندو ہولی جلایا بھی کرتے ہیں، چنانچہ عشرت اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھیے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

دل والو! دل کی میل جلے اور پریم کے رنگ میں ہولی ہو
پیغام یہ جل کر دیتی ہے ہم کو رنگوں والی ہولی!

نظم 'ہولی' پر ہے مگر جس خوبصورتی سے عشرت حالاتِ حاضرہ کی طرف ایک لفظ میں اشارہ کرتے ہوئے ہمیں مل کر زندگی جینے کا واسطہ دیتے ہیں، وہ ہر لحاظ سے اپنی مثال آپ بن کر ان کے فن اور شخصیت کو سامنے لاتے ہوئے، ان کے فلسفۂ حیات کی عکاسی کرنے میں بدرجہ اتم کامیاب ہوتی ہے!

اور بالکل یہی انداز ہے، عشرت کی نظم 'دیوالی' کا جو ان کے قلم سے 1958 میں پھوٹی۔ عشرت اس وقت تہران میں تھے اور بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا رہے تھے۔ وہ ایران خصوصاً تہران میں اساتذہ اور طلبا کی نظر کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ ہندوستانی سفیر کی آنکھوں کا کاجل بن کر کامیابی کی نئی نئی منزلیں طے کر رہے تھے... مگر پھر بھی تھے تو تہران میں — بھارت سے دور، بہت دور! اور وہ دیوالی کی رات کو اپنے آپ میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان کے دل میں اپنے وطنِ عزیز کی میٹھی میٹھی یادوں کی ہوک اٹھ رہی تھی۔ چنانچہ وہ تہران میں دیوالی مناتے ہوئے اپنے قلم کا سہارا لیتے ہوئے کچھ یوں فرماتے ہیں۔

آج کا دن ہے چراغوں اور پروانوں کا دن
دن کو جو شرما سکیں ایسے شبستانوں کا دن
یاد کرنے کے لیے گمگشتہ افسانوں کا دن
موسمی تیوہار ہے ہندو مسلمانوں کا دن
آج دیوالی مبارک کی مبارک رات ہے
دافع آلام و غم ہے، ادفع آفات ہے

دیوالی کی مبارک رات کو ہندوستان میں لوگ کچھ اس طرح سے چراغاں کرتے ہیں کہ رات دن سے بھی زیادہ پرنور دکھائی دینے لگتی ہے۔ لوگ رام کو یاد کرتے ہوئے رامائن کے ان گنت گم گشتہ افسانوں کی گہرائی میں اتر کر سو طرح کی فلسفیانہ پھلجھڑیاں جلاتے ہوئے روشنی کی جڑیں کریدلاتے ہیں لیکن عشرت کی نگاہ میں دیوالی کا تعلق محض رام کی اجودھیا واپسی سے ہی نہیں۔ وہ تو اسے موسمی تیوہار مانتے تھے۔ چنانچہ ان کی نظر میں یہ تیوہار ہندو مسلمان کی مشترکہ تہذیب کی تصویر پیش کرتا ہے۔ آج کی رات لوگ ہر طرح کے غم و آلام کو بھول کر انسانیت کی پرنور بستیاں بسانے کی کوشش میں جٹ جاتے ہیں۔

پر تہران کی تنہائی میں ایک دم عشرت کو پھر اپنے وطن کے بدلتے ہوئے موسموں کی یاد آنے لگتی ہے۔ چنانچہ ایران میں دیوالی مناتے ہوئے فرماتے ہیں۔

آج اپنے دیش میں گھر گھر ہے پوجا ہو رہی
اس شب تاریک میں ہے روشنی ہی روشنی
سرسوتی پھیلا رہی سنسار میں ہے شانتی
شانتی کے دور میں خود آرہی ہے لکشمی...

اور پھر بحیثیت ذہین مورخ تاریخ کی بہترین جھلکیاں دکھانے لگتے ہیں۔

کونہ کونہ ہند کا اب خوش ہے اور دلشاد ہے
ہے بڑی نعمت کہ اب ہندوستاں آزاد ہے

اور پھر پرانی جھلکیاں دکھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

رام نے لنکا میں راون کا کیا قصہ تمام
اور اجودھیا میں ہوا جب واپسی کا اہتمام
فتح تھی سچائی کی اور یہ تھا تزک و احتشام
آج تک لیتے ہیں نام رام سب با احترام
آج کا دن ہے اسی عظمت کی گویا یادگار
سیکڑوں سالوں کی اس کی یاد ہے یوں برقرار

اور پھر ابھرتا ہے عشرت کے تخیل میں 1947 سے پہلے کا وہ زمانہ جب ہندو مسلمان سب مل کر اس تیوہار کو روشن سے روشن تر بنادیا کرتے تھے۔

سب مناتے تھے اسے معراج کی یہ رات تھی
ملک کی ظلمت مٹانے کو عجیب سوغات تھی
یہ چراغاں تھی کہ دن کی روشنی بھی مات تھی
ہندو مسلم سب مناتے تھے یہ کل کی بات تھی

نظم پھر پرانی تاریخ کی عظمت کو چار چاند لگاتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔

بادشاہانِ مغل کا ہند میں جب راج تھا
تھی حکومت ان کی اور ان کا ہی تخت و تاج تھا
عظمتِ رفتہ کا نقشہ کھینچتی تھی ہوبہو
جس میں سب ملتے تھے آپس میں گلے سے روبرو...

اور اب دیکھیے تاریخ کا ایک اور پہلو جس کے صدقے یہ تیوہار سکھوں کا تیوہار بھی بن جاتا ہے۔

آج کے دن ہی ہوئے آزاد سکھوں کے گورو
اور خوشیوں کے ترانے گا رہے تھے کوبکو...

اور اب دیکھیے 1947 کے بعد آزادی کے شب وروز۔

آج آزادی سے وہ خوشیاں دوچنداں ہوگئیں
اور گھر گھر میں ہیں یوں شمعیں فروزاں ہوگئیں

اور پھر نظم کے آخری بند میں عشرت اس پیغام کی طرف آتے ہیں جو اس روشنی کے تیوہار کی بیش قیمت سوغات ہے۔

آج دیوالی ہمیں دیتی ہے پیغامِ حیات
ہے محبت ہی فقط انساں کا انجامِ حیات
ہم اگر چاہیں منور کرسکیں شامِ حیات
مل کے بیٹھیں گے منور ہوگا آرامِ حیات
آؤ مل بیٹھیں کبھی سے آج دیوالی کے دن
پھر وہ لے آؤ پرانی عظمت عالی کے دن!

دیوالی تو ڈاکٹر عشرت نے تہران میں منائی مگر اس کے کچھ ہی دن بعد وہ تہران سے ڈی۔ لٹ کی ڈگری لے کر واپس بھارت آگئے اور آتے ہی کلکتہ یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز اور کلچر کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوگئے اور لگ بھگ 26 برس کی کامیاب خدمات کے بعد اس عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

عشرت مذہباً تو ہندو تھے مگر پروفیسر اسلامی ہسٹری اور کلچر کے۔ چنانچہ اسلامک ہسٹری کے گوشے گوشے سے پوری طرح واقف تھے۔ جب بھی کسی اسلامک موضوع پر بھی قلم اٹھاتے اسے عام شعرا کی طرح محض چوم کر ہی نہیں چھوڑ دیتے تھے۔ اس بھاری پتھر کو بھی سر پہ لیتے ہوئے اس کے ہر پرمغز پہلو کی مکمل ویڈیوگرافی کرڈالتے تھے۔ وہ کچھ اس لیے نہیں کہتے تھے کہ ان کی طبیعت موزوں تھی بلکہ اس لیے کہ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ ٹھوس ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر دیکھیے ان کی تخلیقات 'امام حسینؓ کی شہادت پر' (1951) اور 'جشن میلاد النبیؐ' (1952) حضرت امام حسین کی شہادت پر ہزاروں تخلیقات آپ کی نظر سے گزری ہوں گی۔ لیکن ڈاکٹر عشرت کی نظم کا انداز ہی کچھ اور ہے۔ اس کی اپنی ہی شان ہے۔ نظم پہلے ہی بند میں ہر پڑھنے والے کو اپنی باہوں میں کس لیتی ہے۔

ہمیت نہیں مخصوص ہوتی دام اور در سے
بشر بھی نوعِ انساں سے بگڑتا ہے رو و کد سے

مظالم اس قدر بڑھتے ہیں دنیا میں کبھی حد سے
کہ پیغمبر بھی نا محفوظ ہیں شیطان کی زد سے
ہو شیطاں مغفل جس سے بشر وہ کام کرتا ہے
غضب ہے آلِ پیغمبر کا قتل عام ہوتا ہے

حیوانیت کی اندھی گپھاؤں میں انسانیت کچھ ایسے رستہ بھول جاتی ہے کہ خدا کی پناہ! کسی کو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ کسی کو ہوش ہی نہیں رہتا، کچھ اچھائی یا برائی کا۔ ایسے حالات میں پھر کسی نہ کسی پاک صاف روح کو بصورت ناخدا دھرتی پر اترنا ہی پڑتا ہے اور وہ بھی سر بکف! لیکن بشر کی حیوانیت اسے بھی نہیں بخشتی۔

ہدایت کو زمانے کی جو آیا ناخدا بن کر
بشر ہوکر جو آیا مالکِ ارض و سما بن کر
شب تاریک عالم کے لیے شمع ہدا بن کر
وہ آیا ناخدا بن کر کبھی ظلِ خدا بن کر
رہِ حق میں شہادت کے لیے بالائے بام آیا
فنا میں ہے بقا مضمر وہ یہ لے کر پیام آیا...

چنانچہ عشرت سجدہ بجالاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

سلام اے فخرِ آلِ مصطفےٰ اے نورِ یزدانی
سوار دوش پیغمبر دلِ محبوب ربانی
سمجھنے لگ گئے ہیں تیرے قاتل اپنی نادانی
چرا کارے کند ناداں کہ باز آید پشیمانی!
زمانہ آج واقف ہوگیا تیری حقیقت سے
صداقت سے، محبت سے، اخوت سے، شجاعت سے

اور پھر عشرت لے چلتے ہیں ہمیں ظلم و تشدد کی ان تاریک وادیوں میں جہاں انصاف نام کی کوئی چیز ہی دکھائی نہیں دیتی۔ کتنا غیر منصفانہ منظر آنکھوں کے سامنے ابھرتا ہے جب ہم پڑھتے یا سنتے ہیں۔

اُدھر لاکھوں کا لشکر ہے، اِدھر تیرا بہتر ہے
انھیں عیش و دوام، ان کو نہ پانی تک میسر ہے
ادھر تیر و تبر ہے اور ادھر قلب و دل و سر ہے
ادھر شیطان کا لشکر ادھر معصوم اصغر ہے

مگر ایسے حالات میں بھی۔

بجا لائی ہے آلِ مصطفےٰ آداب فرزندی
انھیں کے خون سے فطرت نے کی ان کی حنابندی

مگر خداوند کریم کی آنکھوں میں تو کبھی کوئی دھول جھونک ہی نہیں سکتا۔ اس کی خاموش لاٹھی سے کوئی بچ ہی نہیں سکتا۔ وہ سو طرح کے معجزے دکھاتا ہے۔ چنانچہ عشرت کے الفاظ میں۔

شہادت سے تری عالم ہوا یکسر تہ و بالا
کہ ہے سطحِ زمیں اوڑھے ہوئے رنگِ رخِ لالہ
ترا ماتم کناں ہے سارا عالم اے شہ والا
وہ ایراں ہو کہ توراں ہو کہ پنجاب و بنگالہ
جہاں آدم کی بستی ہے وہاں فریاد کرتے ہیں
تری معصومیت پر شکوۂ بیداد کرتے ہیں

عشرت اک نیک دل معصوم فرشتے کی عظمت کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے کہیں سے کہیں جانکلتے ہیں۔

کہاں اے رہرو راہِ حقیقت تیری منزل ہے
کہ خود طوفاں میں ہے، طوفاں زدوں کا خود ہی ساحل ہے
تو خود ہے مضطرب لیکن قرار و صبر ہر دل ہے
ملا دے خالق و مخلوق کو وہ تیری محفل ہے
اگرچہ ظلم کے ہاتھوں تری محفل پریشاں ہے
مگر اس محفل دنیا کی ہر جاں تجھ پہ قرباں ہے

موت کی آغوش میں بھی ایسی روحیں جہاں بھر کے ایک ایک فرد و بشر کا خیال رکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں دھرتی کا ذرہ ذرہ اپنی قدر و قیمت لیے ہوئے ہمیشہ اپنی آب و تاب دکھاتا ہی چلا جاتا ہے۔ عشرت یہاں ایک زبردست حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے قارئین کو چونکا دیتے ہیں۔

ترے قرباں شہا مرے وطن کو یاد رکھا تھا
نصیبہ تھا مرا میرے چمن کو یاد رکھا تھا
مرے اس دیس کے سرو سمن کو یاد رکھا تھا
دعا میں بھی حسینی برہمن کو یاد رکھا تھا
وہ رہتے ہیں سیاہی پوش اب بھی تیرے ماتم میں
مسرت سے ہیں منہ پھیرے ہوئے ماہِ محرم میں

یہاں حسینی براہمن کا ذکر قابل غور ہے۔ عشرت یہاں ان غیر مسلم لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو محرم کے مہینے میں اپنے مسلم بھائیوں کو مشکل کے دور سے گزرتے ہوئے دیکھ کر ان کے ساتھ برابر کے شریک نظر آتے ہیں۔

عشرت مذہباً تو ہندو تھے مگر پروفیسر اسلامک ہسٹری اور کلچر کے۔ چنانچہ اسلامک ہسٹری کے گوشے گوشے سے پوری طرح واقف تھے۔ جب کبھی کسی اسلامک موضوع پر بھی قلم اٹھاتے اسے عام شعرا کی طرح محض چوم کر ہی نہیں چھوڑ دیتے تھے۔ اس بھاری پتھر کو بھی سر پہ لیتے ہوئے اس کے ہر پرمغز پہلو کی مکمل ویڈیوگرافی کرڈالتے تھے۔ وہ کچھ اس لیے نہیں کہتے تھے کہ ان کی طبیعت موزوں تھی بلکہ اس لیے کہ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ ٹھوس ہوتا تھا۔

اپنی جان پر ہنستے ہنستے کھیل کر حضرت حسین نے جس شان سے دنیا کو ظلم و جبر کی طاقتوں سے پاک صاف کردیا، اس کی مثال شاید دنیا کی تاریخ میں کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی۔

تری آمد سے فطرت بھی نئی کروٹ بدلتی ہے
حقیقت پردۂ مستور سے باہر نکلتی ہے
شہادت تیرے قدموں پر مچلتی ہے اچھلتی ہے
تری درگہ میں باطل کی بھلا کب دال گلتی ہے
رہِ حق میں جو یوں جامِ شہادت بھر دیا تونے
مٹا باطل، حقیقت کو حقیقت کردیا تونے

اور پھر حضرت امام حسین کی بے مثال قربانی کا ذکر کرتے ہوئے عشرت ان کے قدموں میں عقیدت سے سر جھکا دیتے ہیں اور احتراماً سجدہ بجا لاتے ہوئے، اپنے ہی انداز میں سلام پیش کرتے ہیں۔

عجب انداز سے مقتل میں آتا ہے امام اپنا
معین کرکے مہر و ماہ سے اونچا مقام اپنا
صداقت سے کیا دنیا و عقبیٰ کو غلام اپنا
شہید ابنِ شہید اور شاہدِ حق پر سلام اپنا
ابد تک اہلِ بیت مصطفےٰ کا فیض ہو سب پر
سلام ان کے لیے دل میں، درود ان کے لیے لب پر

ڈاکٹر عشرت کی اس عقیدت کے مدنظر ان کے دل کی آواز سننے کے بعد کون یہ کہنے پر مجبور نہ ہوگا کہ عشرت سے بڑا مسلمان شاید دھرتی پر کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکے!... ٹھیک تو کہا تھا کبھی برصغیر ہند و پاک کی بیسویں صدی کے ہر دل عزیز پروقار ادبی سفیر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے۔

عشق ہوجائے کسی سے کوئی چارا تو نہیں
صرف مسلم کا محمد پہ اجارا تو نہیں!

اس میں کوئی شک نہیں کہ عشرت اپنی نظموں میں اکثر معنی و مفہوم کو حسن پر ترجیح دیتے ہیں مگر ان کی نظموں میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی ایسی تخلیق نہیں ملتی جو حسن کے جلوؤں سے جگمگا نہ رہی ہو اور اس حقیقت سے وہ خود بھی بے بہرہ نہیں تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔ کہیں۔

میری غزلوں پر اگر ہوتا ہے نظموں کا گماں
میری نظمیں بھی حقیقت میں ہیں غزلوں کی سی ہی!

■

Dr. 'Kumar' Panipati
1375/ MIG-B, Sector 11-12
New Housing Board Colony
Panipat - 132103 (Haryana)
Mob.:09253193704

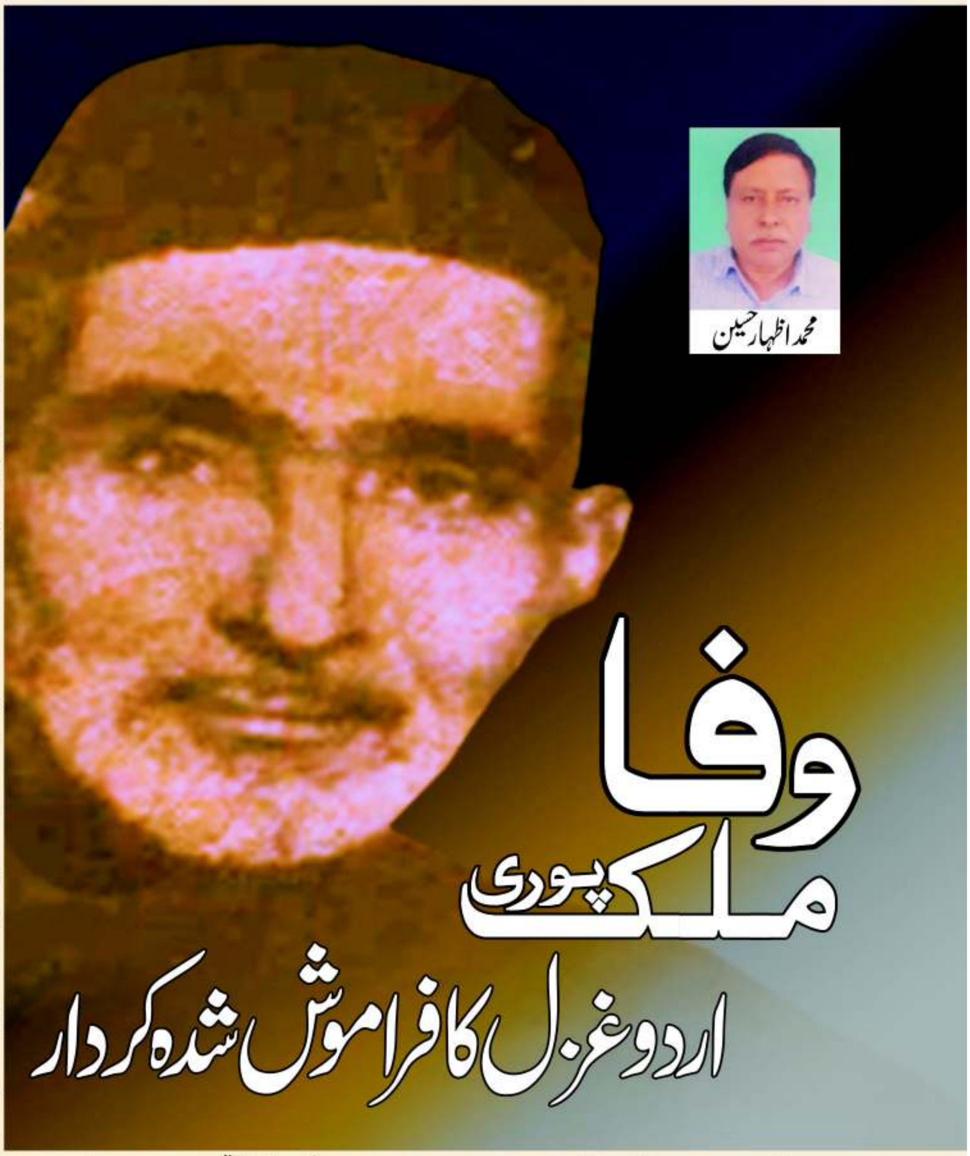

وفا ملک پوری
اردو غزل کا فراموش شدہ کردار

محمد اظہار حسین

وفا ملک پوری اردو غزل کی تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جو ادبی مرکز سے دوری اور ارباب تنقید کی بے توجہی کے سبب نذر طاق نسیاں ہوگئے۔ خدا بھلا کرے ان تحریکات ور جحانات کا جن سے مرکز کی لامرکزیت کے تصور کو فروغ ملا اور مرکز سے دور حاشیائی شعرا و ادبا کو ازسرنو پڑھنے، سمجھنے اور ان کی تحسین کا موقع میسر ہوا۔

وفا ملک پوری کی ادبی تخلیقات کا دائرہ شاعری اور صحافت کو محیط ہے۔ ان دونوں میدانوں میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ شاعری میں انھوں نے حمد، نعت، غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ، سلام، رباعی تقریباً اکثر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ادبی صحافت میں بھی انھوں نے انمٹ نقوش ثبت کیے۔ انھوں نے 1952 میں صبح نو کے نام سے ایک معرکۃ الآرا ادبی ماہنامہ جاری کیا۔ اس رسالے کی عظمت و معنویت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس عہد کے موقر و معتبر شعرا و ادبا کی تحریریں اس کی زینت بنا کرتی تھیں۔ جمیل مظہری، کلیم عاجز اور ان کے علاوہ متعدد مشاہیر ادب کی تخلیقات اس رسالے میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ وفا صاحب کے ادبی کمٹمنٹ کا مکمل ادراک اس وقت ہوتا ہے جب ہم اس بات سے واقف ہوتے ہیں کہ انھوں نے اس پورنیہ سے رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا جہاں نہ بجلی نہ سڑک نہ پریس تھا۔ اسے وفا صاحب کی کوہ کنی ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایسے دور افتادہ مقام سے 'صبح نو' کے کئی شمارے نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔

وفا ملک پوری کی شعری تخلیقات ان میں ان کی غزل گوئی کا مرتبہ بلند ہے۔ حالانکہ ان کی غزلوں کا صرف ایک مجموعہ 'حرف وفا' کے عنوان سے ہے جو 1988 میں شائع ہوا۔ صرف اٹھاسی غزلیں ہیں۔ وہ غزلیں اتنی پرقوت اور کلاسیکی توانائی سے اس قدر بھرپور ہیں کہ ان کی گونج ابھی تک باذوق قاری کی زبانوں پر سنائی دیتی ہے۔

وفا ملک پوری کی غزل کلاسیکی روایت اور عصری حسیت سے متصف ہے۔ انھوں نے صنف غزل کو برائے شعر گفتن اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ اپنے قلبی واردات اور عصری مسائل کے اظہار کے لیے غزل کے تہہ دار اسلوب کا انتخاب کیا تھا۔ وہ حرف وفا کے ابتدائیہ میں 'قلم گوید' کے عنوان سے تحریر کرتے ہیں:

''صنف غزل کو میں ہر باشعور اور حساس انسان کے قلبی واردات اور ذہنی کیفیات نیز آفاقی تصورات کے اظہار کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ یہی وہ صنف سخن ہے جس میں ہر دور کے عصری تقاضوں کی ترجمانی کی بھرپور صلاحیت ہے اور یہی برہنہ حرف نہ گفتن کا دلنشیں ذریعہ بھی ہے جو کمال گویائی کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں دوسرے اصناف سخن میں تکمیل فکر وفن کے لیے ترجیحی طور پر غزل کو پسند کرتا ہوں اور اس لیے بھی کہ۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحی مے ناب و سیفنہ غزل است

وہ آگے اپنی غزلوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے مزید رقم طراز ہیں:

''میں نے محض برائے شعر گفتن شاید کبھی غزل نہیں کہی۔ زیادہ تر غزلیں میرے تاثرات، محسوسات اور واردات قلبی کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے میری غزلیں آورد سے بہت حد تک محفوظ ہیں۔'' (ص6)

وفا ملک پوری غزل کے جینوئن شاعر ہیں۔ اس دعوے کی بنیاد یہ ہے کہ جس زمانے میں انھوں نے غزل کہنے کا آغاز کیا، وہ زمانہ ترقی پسندی کے زوال اور جدیدیت کے عروج کا تھا۔ جدیدیت کے زمانے میں جدیدیت سے مخصوص اسلوب اور موضوع اختیار کرنے کے سبب کمتر درجے کے فن کاروں کو بھی جلد شہرت مل جاتی تھی اور نقادان فن کی نظر التفات بسہولت حاصل ہوجاتی تھی۔ وفا صاحب نے فیشن زدہ معیاروں کو قبول کرنے کے بجائے غزل کے اس اسلوب کو ذریعۂ اظہار بنایا جس

پر ان کا ایقان تھا۔

وفاملک پوری کی غزلیں کلاسیکی رسومیات پر پوری طرح کھری اترتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں عاشق، معشوق اور رقیب اپنے تمام کلاسیکی رنگ و آہنگ کے ساتھ رواں دواں نظر آتے ہیں۔

ادائے محبوب کی معصومیت پر وفا صاحب کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

کتنی پرکار ہے ظالم کی پشیماں نظری
جس نے دیکھا اسے معصوم سراپا سمجھا

اس شعر میں بظاہر کسی طرح کا کسی پیچیدہ شعری محاسن کا استعمال نہیں نظر آتا ہے۔ لیکن اس رواں، سادہ اور آسان شعر میں متعدد محاسن برتے گئے ہیں۔ 'کتنی' کے لہجے سے حیرت و استعجاب کا اظہار ہوتا ہے۔ ظالم اور معصوم کے درمیان تضاد کی صنعت ہے۔ اس کے ذریعے ایک طنز کی فضا تیار کی گئی ہے۔ اس سے وفا صاحب کے اس دعوے کا ثبوت فراہم ہوجاتا ہے کہ ان کے اشعار میں آورد کے بجائے آمد کی کیفیت زیادہ ہے۔

راہ وفا میں مصائب سے دوچار ہونے کا مضمون کلاسیکی روایت کا اہم جز ہے۔ دیکھیے وفا صاحب اس مضمون کو کس طرح باندھتے ہیں۔

گذرے ہیں دشت شوق سے آوارگان عشق
کانٹوں کا منھ ہے خون وفا سے دھلا ہوا
اک لمحہ حیات یہ کس کس کا قرض ہے
تجھ کو منالیا تو زمانہ خفا ہوا

ان اشعار میں بھی ایک عجیب روانی ہے۔ دشت شوق اور آوارگان عشق کی ترکیب اضافی کے علاوہ روزمرہ کا بہت خوبصورت استعمال ملتا ہے۔

محبوب کی کج ادائی کے مفہوم کو وفا صاحب کس طرح پیش کرتے ہیں ملاحظہ کیجیے۔

وہ بار بار پاس سے ہو کر گذر گئے
میں رہ گیا فریب نظر دیکھتا ہوا

وفاملک پوری کے کلام میں حسن و عشق اور محبوب سے شوخی وغیرہ کے علاوہ متعدد موضوعات کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے تصوف کے مضامین نہایت فنی چابک دستی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

شاعر و صوفی و مجذوب و قلندر نکلا
تیرا دیوانہ کئی بھیس بدل کر نکلا
دے سکے جو مرے سجدوں کو بلندی کا یقیں
اک ترے در کے سوا اور نہ کوئی در نکلا

وفا صاحب کی غزلوں میں عظمت آدم کا مضمون بھی فنی رچاو کے ساتھ ملتا ہے۔ شعر دیکھیے۔

ازل سے دامان زندگی میں امانت درد دل لیے ہے
ملک سے بڑھ جائے کیوں نہ رتبہ خدا کے نزدیک آدمی کا

وفا صاحب کو موقر و مستند شاعر جمیل مظہری سے بھی تلمذ کا شرف حاصل تھا۔ جمیل مظہری کو عظمت آدم، عرفان نفس اور خودی کے مضامین کے بیان میں انفرادیت حاصل ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس نوع کے مضامین کے ذکر میں انھوں نے جمیل مظہری سے استفادہ کیا ہو۔

وفا صاحب کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

چاہتا ہوں کہ آپ تک پہنچوں
کیا کروں راستہ نہیں ملتا

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اپنے آپ تک پہنچنے، اپنی صلاحیتوں کو دریافت کرنے اور اپنے عرفان کی دل میں بہت خواہش ہوتی ہے لیکن ان طریقوں سے اوران وسائل سے ناواقف ہوں جن سے اس جوہر کا حصول ممکن ہے۔

وفاملک پوری کی غزلیں کلاسیکی روایت کے ساتھ ساتھ عصری مسائل کی ترجمانی اور اس پر طنز سے عبارت ہیں۔ ان کی غزلوں میں انسانی اقدار کے زوال کا نوحہ ملتا ہے۔ وہ محبوب کی بے وفائی اور ان کے دوہرے پن کے حوالے سے عام انسانی صورت حال کے مکروفریب پر طنز کے تیر چلاتے ہیں۔ شعر ملاحظہ کیجیے۔

چمن میں جو دل برباد کی نشانی تھا
وہ آشیاں بھی جلا میرے بال و پر کی طرح
ہوائے گرم کے جھونکوں سے چوب خشک ہوئے
کبھی تھے ہم بھی چمن میں ہرے شجر کی طرح
رہانہ عہد ترقی میں فرق عیب و ہنر
کہ لوگ عیب بھی کرتے ہیں اب ہنر کی طرح

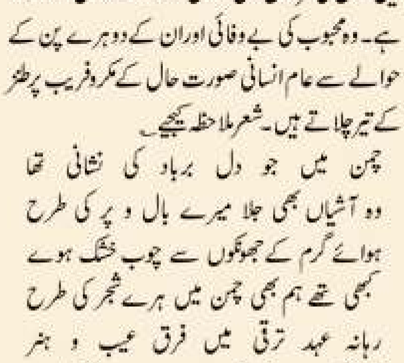

”
وفاملک پوری کی غزلیں کلاسیکی روایت کے ساتھ ساتھ عصری مسائل کی ترجمانی اوراس پر طنزسے عبارت ہیں۔ ان کی غزلوں میں انسانی اقدارکے زوال کانوحہ ملتا ہے۔ وہ محبوب کی بے وفائی اوران کے دوہرے پن کے حوالے سے عام انسانی صورت حال کے مکروفریب پر طنز کے تیر چلاتے ہیں۔
“

اس عہد کے معتبر نقاد شمس الرحمٰن فاروقی وفاملک پوری کی غزل گوئی پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''وفاملک پوری کی غزل میں جو چیز سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے وہ ایک لطیف طنزیہ انداز ہے لطف یہ ہے کہ شاعر نے یہ انداز شعوری طور پر نہیں اختیار کیا ہے اور نہ اس کا کوئی منصوبہ ہے کہ وہ دنیا کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھے۔ یہ دراصل کلاسیکی غزل گوئی کا انداز ہے۔ فنی نقطہ نگاہ سے دیکھیں تو وفاملک پوری کی غزل کا سلسلہ انیسویں صدی کے اواخر میں ترقی پانے والی اس غزل سے ملتا ہے جس کی بہترین نمائندگی ضامن علی جلال اور اصغر علی نسیم کی غزلوں میں ہے...ان کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ انھوں نے اساتذہ کی مکھی پر مکھی نہیں ماری ہے بلکہ ان کے طریقۂ کار کو اپنے محسوسات اور تجربات کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔''

مذکورہ بالا معروضات کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وفاملک پوری نے کلاسیکی روایت کے ساتھ ساتھ عصری مسائل کو غزل کے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں حسن وعشق، رندی و سرمستی کے علاوہ تصوف، عظمت آدم اور عصری مسائل کی ترجمانی کے مضامین فنی رچاؤ کے ساتھ ملتے ہیں۔ ادبی مراکز سے دوری اور ارباب تنقید کی عدم التفات کے سبب وہ گوشہ گمنامی کی نذر ہوگئے۔ آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ان کی غزلوں کی از سر نو قرات کی جائے اور ان کی شاعری کو جدید تنقیدی نظریات کی روشنی میں پڑھنے کی فضا ہموار کی جائے۔

■

Mohd Izhar Husain
Asso. Prof.
Nehru College, Bahadur Ganj
Kishanganj - 855101 (Bihar)

مانوس سہسرامی کی شاعرانہ عظمت

پرویز اشرفی

سہسرام کا شمار بہار کے خوش نصیب اور مردم خیز مقامات میں ہوتا ہے۔ یہاں وقفے وقفے سے ایسے علما صوفیا، شعرا ادبا اور ارباب فضل وکمال پیدا ہوتے رہے ہیں، جنھوں نے علم وتصوف اور شعر وادب کی دُنیا میں اپنی شناخت بنائی ہے۔ دورحاضر میں دیگر شعرا کے علاوہ مانوس سہسرامی قابل ذکر ہیں۔

مانوس سہسرامی کی شاعری کسی نظریے یا رجحان کی تبلیغ نہیں کرتی۔ یہ خالص تغزل کی پروردہ ہے جس میں معنی ومفاہیم کے نئے ابعاد روشن ہوتے ہیں۔ مانوس کا مزاج کچھ تو پہلے ہی سے غزل سے مطابقت رکھتا تھا دوسرے حوصلہ شکن واقعات نے راہ دکھائی۔ یہی وجہ ہے کہ مانوس کے ابتدائی کلام میں رنج وغم کا غلبہ ہے۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کا دل چوٹ کھایا ہوا ہے، ذاتی چوٹ بھی اور زمانے کی چوٹ بھی اور دونوں کے زخموں سے مجروح ہوکر مانوس کے دل سے خون ٹپکتا ہے۔

غم کسی کا ہو اس نگاہ میں ہے
اک جہاں جن کی پناہ میں ہے
کون اس کے سوا یہ سمجھے گا
دل کی روداد دل کی آہ میں ہے

مانوس سہسرامی فکر وفلسفہ کے شاعر یقیناً نہیں ہیں ان کا سرمایۂ فن اُن کے احساسات وجدبات ہی ہیں۔ لیکن اپنے احساس وجذبے کو انھوں نے اس متانت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جوش کے ساتھ تفکر کی کیفیت بھی پیدا ہوگئی ہے۔

مانوس سہسرامی کا اصلی نام محمد الطاف حسین اور تخلّص مانوس تھا۔ آپ کے والد کا نام منشی اصغر حسین تھا۔ سہسرام کے محلّہ املی آدم خاں ضلع روہتاس بہار میں مقیم تھے۔

مانوس سہسرامی کا تعلق تاجر گھرانے سے ہے والد ماجد ایک تاجر اور خوش نویس تھے، والدہ باہنر معلّمہ اور چچا مظہر حسین مرحوم ایک باذوق شاعر تھے۔ دور جوانی سے قبل ہی والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا مانوس اور اُن کے دو چھوٹے بھائی یتیم ہوگئے۔ خاندان کا بار بھی مانوس کے سر آن پڑا۔ تلاش معاش میں سرگرداں رہے، مختلف پیشے اختیار کیے لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اللہ نے مانوس صاحب کو تین بچے عطا کیے لیکن بدقسمتی سے اُن بچوں کی ماں دُنیا سے رخصت ہوگئی جبکہ بچے ابھی چھوٹے ہی تھے۔ رہنے کا مکان بھی کھنڈر ہوگیا۔ اُن کا مکان میر تقی میر کے مکان کا عکس پیش کرتا تھا۔ مانوس اپنے بچوں کے لیے گھر کے کام میں لگے رہتے۔ اُن کی نگہداشت کرتے۔ سردی، گرمی اور برسات کے موسم میں بھی سڑکوں پر سامان فروخت کرتے۔ انہی حالات میں جوانی کے دن گزر گئے۔ بچے جب جوان ہوئے تو والد کی معاونت کرنے لگے۔ اللہ نے فراغت دی مگر مانوس عہد ماضی سے ہی جُڑے رہے۔ ماضی کی تلخیاں اُن کے ذہن پر چھائی رہیں۔ جس انسانی کی زندگی اتنی الجھنوں میں گزری ہو وہ تعلیم کیا حاصل کرے گا۔ پھر بھی ابتدائی مکاتب میں انھوں نے رسمی تعلیم حاصل کی۔ گلستاں وبوستاں کے درس لیے۔ سعدی نے اُن کی زندگی پر ایک نقش چھوڑا۔

مانوس سہسرامی کی تعلیم مکمل نہ ہوسکی، لیکن مطالعے کے شوق نے انھیں بڑا فائدہ پہنچایا۔ انھوں نے علم وادب کی بہت سی کتابوں کو پڑھا۔ اور اکتساب علم کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کے ہر نشیب وفراز سے وہ بڑی حد تک واقف ہیں۔ تاریخ سے بھی انھیں شغف تھا۔ زمانے کے ستائے ہوئے ہونے کے باعث تاریخ سے فطری انداز میں درس حاصل کیے ہیں۔ جس کی جھلک اُن کے کلام میں ملتی ہے۔

مانوس ایک چیز ہے بس قوت عمل
سب کچھ لکھا ہوا ہے خدا کی کتاب میں

سوال ہے کہ ایک قصباتی شاعر کے ذہن میں کائناتی نقش کس طرح اُبھرا؟ جب کہ علمی فضیلت کے شواہد بھی موجود نہیں۔ مانوس کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے سہسرام کے کوہساروں اور ان میں بہنے والے آبشاروں پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ مانوس اپنا غم لے کر فطرت کے ان ہی بلند ورواں نظاروں کے درمیان معتکف ہوئے اور ان کی

تجلیوں سے سکون قلب حاصل کیا۔ غم کو فطرت میں ملا دینے ہی سے شاعر کی طبیعت میں ایک کائناتی حس پیدا ہوئی۔

کبھی کچھ کبھی کچھ زمانے کے ہاتھوں
غم دل کی تفسیر ہوتی رہے گی
کبھی اُن کے بس میں کبھی ان کے بس میں
غریبوں کی تقدیر ہوتی رہے گی
سُبک تر یہ احساس جتنے بھی ہوں گے
گراں رسم زنجیر ہوتی رہے گی

مانوس سہرامی نے 1912 سے 1973 تک کئی بہاریں دیکھیں وہ اپنے دور سے بالکل مایوس نہیں۔ اُن کے کلام میں ملّی غم بہت نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ذاتی غم ملی غم سے ہم آہنگ ہوگیا ہے۔ وہ بڑی حد تک انسانی نفسیات کا درک رکھتے تھے۔

قبضے میں کسی کے اب اپنی تقدیر نہ دیکھی جائے گی
انساں ہی کہ ہاتھوں انساں کی تحقیر نہ دیکھی جائے گی
منزل سے ہم اپنی واقف ہیں، منزل پہ پہنچ کر دم لیں گے
ہرگام پہ یہ تخریب بہ کف تعمیر نہ دیکھی جائے گی

مانوس سہرامی نے اکتسابِ فن کے لیے جو کوشش کی ہے اس کا ذکر بھی کرنا اشد ضروری ہے۔ مطالعے کے علاوہ انھوں نے ہندوستان کے مشاہیر اساتذۂ سخن سے اصلاحیں لی ہیں۔ جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

(1) عشرت لکھنوی (2) جلیل مانک پوری (3) سیماب اکبرآبادی (4) دل شاہجہاں پوری ان کے علاوہ سہرام کے مشاہیر اساتذۂ سخن غلام مخدوم مست سہرامی اور شفیق عماد پوری کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔

اپنے کلام پر خود ہی نظر ثانی کرتے رہے۔ حال یہ تھا کہ کبھی کبھی اپنی پوری غزل بدل دیتے تھے۔ ان کی اسی فن کاری نے اُن کو ایک باکمال شاعر بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مشہور ناقدِ فن اختر اورینوی یہ کہتے ہیں:

''شاد اور یاس (یگانہ) عظیم آبادی کے بعد بہار نے جدید غزل نگاری کا ایک اور چشم و چراغ پیدا کیا، یعنی مانوس سہرامی''

ایک جگہ اور وہ لکھتے ہیں:

''مانوس سہرامی کی شاعری کا افق بہت وسیع ہے اور اس کے تجربات میں سرشاری کے ساتھ گہرائی پائی جاتی ہے''

مزید آگے وہ تحریر کرتے ہیں:

''جدید غزل میں فکری عنصر جذبی عنصر سے مل کر نئی لذتیں پیدا کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نئی لذتیں، کلام مانوس میں بدرجہ اتم موجود ہیں'' یہ شعر ملاحظہ فرمایئے۔

اس فضا سے بھی نہ ہو جائے کہیں مانوس دل
ہم اکیلے وادیِ پُرخار سے آگے بڑھے
زندگی کی راہ میں کانٹے ہی کانٹے ہیں تو کیا
کوئی تو پیمانۂ ایثار سے آگے بڑھے

حقیقت یہ ہے کہ وقت نے مانوس سہرامی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ لیکن عصر حاضر کی غزل کی کوئی تاریخ مانوس سہرامی جیسے منفرد فن کار کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہوگی۔

کبھی کبھی جو مصیبت میں زندگی گزری
یہ ان کی خاص عنایت ہے، بے رخی تو نہیں
سمجھ میں آئے جو مانوس وہ کیے جاؤ
رہائی غم سے بہر حال جیتے جی تو نہیں

مانوس سہرامی نے درد کو اپنا درد کہا ہے۔ حالانکہ درد و غم انھیں زمانے سے ملا ہے۔ اس شعر میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غم سے رہائی جیتے جی ناممکن ہے اور یہ سب کے ساتھ ہے۔ یہی سچے ادب کی خوبی ہوتی ہے یہاں اُنہوں نے ذاتی غم کو مرکز میں رکھا ہے لیکن وہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو بھی میری غزل کو پڑھے گا اُسے یہ غم زندگی اپنا غم محسوس ہوگا۔

مانوس سہرامی کے تین مجموعے منظرِعام پر آئے ہیں۔ پہلا 'سازِ الم' دوسرا 'نقشِ ناتمام' ہے، جس میں آرزوئے ناکام اور کائنات کی صناعی کا اشاریہ ہے۔

مانوس کی زندگی کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک طاقت ہے، جس نے زندگی کی دشوار راہوں میں انھیں سہارا دیا نہ صرف سہارا دیا بلکہ ان کے وجود کے اندر شعریت کا ایک پرزور دھارا بھی بہایا۔ یہی وہ عنصر ہے جس نے مانوس کی شاعری کا وقار قائم کیا۔

ایک اہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ مانوس سہرامی کے اندر کائناتی نقش کس طرح ابھرا؟ جہاں تک میری سمجھ کام کرتی ہے، اس ابھار کی وجہ فطرت کا گہرا مطالعہ ہے۔ دوسرا سچ یہ بھی ہے کہ مانوس کے کلام میں مناظر قدرت کی تصویر کشی تقریباً مفقود ہے لیکن استعارات وتشبیہات، الفاظ وتراکیب کے استعمال پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ مانوس نے صبح وشام جیسی فطرت کی بہت ہی سادہ تصویروں سے اپنے خیالات کے پیکر تراشے ہیں۔

اُن کی کلیات 'نالۂ شب گیر' مانوس سہرامی کے پہلے دونوں مجموعوں کا ایک جامع انتخاب ہے۔ ابھی مانوس کا چشمۂ سخن جاری ہے اور ان کے بہت سے اشعار ہمارے سامنے نہیں آئے ہیں۔ اس لیے نالۂ شب گیر نہ آخری مجموعہ ہے نہ مکمل کلیات۔ مانوس سہرامی کی شاعری کے مطالعے کی بڑی گنجائش باقی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مانوس سہرامی کے کلام میں کچھ ناہمواریاں بھی ہیں لیکن یہ کمی تو میر کے کلام میں بھی پائی گئی ہیں۔

مانوس سہرامی نے اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ دو عظیم جنگیں، ترکی خلافت کا خاتمہ اور تحریک آزادیِ ہند وغیرہ جیسے واقعات نے ان کے ذہن کو جھنجھوڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں رنج وغم کا عنصر موجود ہے۔ مگر وہ محض قنوطی شاعر نہیں ان کے کلام میں رجائی احساسات کی جھلکیاں ہیں۔ مانوس خالص فکر وفن کے شاعر نہیں تھے لیکن انھوں نے بہت سی باتیں سوجھ بوجھ کی کہی ہیں اور ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

ناقدین فن کا خیال ہے کہ مانوس سہرامی وہبی شاعر ہیں۔ اس سلسلے میں مالک آروی مرحوم کا کہنا ہے کہ:

''قدرت نے ان کے دل میں ایک ایسی لازوال ہوک تحلیل کردی، جس نے مانوس کو شاعر بنا دیا۔''

مانوس سہرامی کی شاعری پر پہلا مقالہ عبدالمالک آروی نے تحریر کیا، جو مانوس کے مجموعہ کلام 'سازِ الم' میں مقدمے کے طور پر شامل ہے۔ ان کے بعد پروفیسر عبدالمغنی نے ایک مقالہ لکھا جو ان کے دوسرے تنقیدی مجموعے 'جادۂ اعتدال' میں درج ہے۔

مانوس سہرامی کے منتخب اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

تری محفل سے جاتے ہیں تو جانے دے کہ ہر پھر کر
یہیں آنا ہے ان کو اور یہیں آئیں گے دیوانے

جہاں سورج کی کرنیں بھی ہوں نشتر
اسی گلشن میں کھلنا تھا کلی کو!

کسی طرح شام و سحر ہورہی ہے
وہی جیسے تیسے بسر ہورہی ہے
ادھر سے اُدھر کارواں ہوگیا کیا
پریشان گردِ سفر ہورہی ہے

معیار وفا عشق میں کچھ اور ہے لیکن
ان کے بھی بتائے ہوئے معیار سے گزرے
ہر گام پہ وہ حسن و جوانی کی نمائش
دامن کو بچائے ہوئے بازار سے گزرے

(ماخذ: نالۂ شبگیر، مرتب محمد ارتضاء الدین حاذق ضیائی سہرامی)

■

Perwez Alam
D-321, Dawat Nagar
Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025
Mob: 9990129128
Email: Parwezashrafi1955@gmail.com

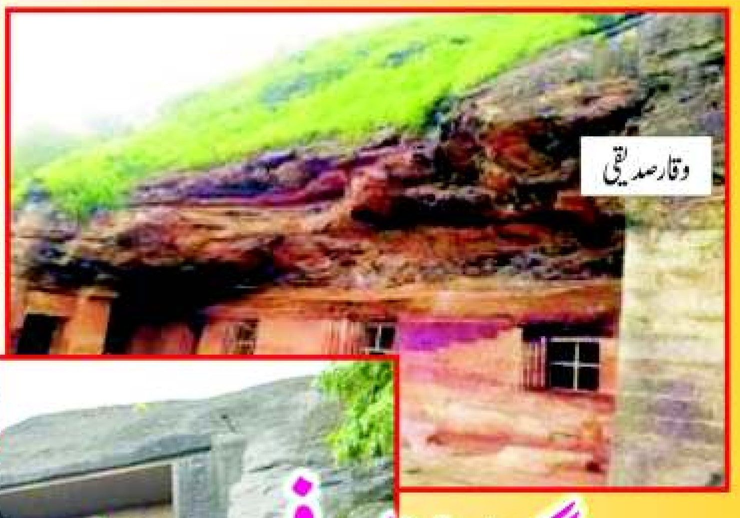

قدیم گوالیار میں فنِ مصوری اور بت گری کی روایت

وقار صدیقی

ہندوستانی فن کی تواریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ دنیائے مصوری، ڈرائنگ اور پینٹنگس میں گوالیار کو جو ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ فن سنگ تراشی اور مصوری کے جو اولین نمونے ملک میں پائے جاتے ہیں، وہ ان مصوروں اور سنگ تراشوں کی تخلیقی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جو ہزاروں سال پہلے اس پہاڑی علاقے کے باشندے تھے جو گوالیار اور مدھیہ پردیش کے کچھ مقامات کے گرد حلقہ بنائے ہوئے ہیں اور جو وندھیا چل پہاڑی سلسلے کے نام سے مشہور ہیں۔ مصوری اور سنگ تراشی قدیم زمانے میں خیالات کے اظہار کا ایک موثر ذریعہ تھی۔ عہد ظلمات کی یہ اولین مگر اہم ترین تخلیقات رفتہ رفتہ ترقی کی منزلیں طے کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے باگھ کی گپھاؤں اور پہاڑ گڑھ کے غاروں کی تصاویر کی شکل اختیار کرلی جو اپنے عہد کی لاثانی تخلیقات ہیں۔

مصوری ہی کی طرح فن سنگ تراشی (Sculpture) کے میدان میں بھی یہ علاقہ اپنی نظیر آپ تھا۔ ودیشا کے قریب اُولے گری کی پرشکوہ 'وراں' کا بہترین مجسمہ ہے نیز گیارس پور کی سُر سندری (Sura Sundri of Gyarspur' جسے ہندوستانی مونالزا Monalisa of India کہا جاتا ہے، ایسے شاہکار ہیں جن پر کوئی بھی ملک فخر کرسکتا ہے۔ کلاسکی مصوری، نقاشی اور بت تراشی کے یہ بہترین نمونے اس سرزمین کے لوگوں کی جاوداں تخلیقات ہیں جس کا شمار ہندوستان میں تخلیقی سرگرمیوں کے اوّلین مراکز میں سے ہوتا ہے۔

پوایا کی مورتیاں: چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں گوالیار کے قریب پدماوتی نام کا ایک شہر تھا جسے آج کل پوایا کے نام سے جانا جاتا ہے، وہاں سنسکرت کے نامور کوی بھوبھوتی ہوئے ہیں۔ ان کی تصانیف 'مالتی مادھو' اور 'اتر رام چرت' میں تصویروں کا تذکرہ ملتا ہے۔

پوایا میں ایک مورتی ملی ہے، جس میں سنگیت کا آرکسٹرا منقش ہے۔ اس میں مختلف قسم کے سازوں کے ساتھ ایک رقاصہ کی مورت بھی شامل ہے۔ اس سے ہمیں اس زمانے کی مورتی کلا کے ساتھ ساتھ سنگیت کی بھی جانکاری ملتی ہے۔ یہ مورتی گوالیار قلعے کے میوزیم 'گوجری محل' میں موجود ہے۔ اسی جگہ ٹیرا کوٹا یعنی پکی ہوئی مٹی سے بنی ہوئی مورتیاں بھی ملی ہیں، جن میں بال سنوارنے کا انداز طرح طرح سے دکھایا گیا ہے۔ اسی قسم کی ناگ ونشیوں کے 'اشٹھ دیؤ' کی مورتیاں بھی ملی ہیں، جو گپتاؤں کے عہد سے پہلے کی ہیں۔ ان میں 'منی بھدر یکس' مورتی بہت اہم ہے۔[1]

باگھ گپھائیں: چوتھی صدی پنچی گپتی ناگ (310-344) جسے راجہ دھارادھیش بھی کہا جاتا ہے، کے عہد میں باگھ کے غاروں (گپھاؤں) کی تعمیر ہوئی۔ ان کی کل تعداد نو ہے اور یہ سابق ریاست گوالیار میں وندھیا چل پہاڑی کے جنوبی ڈھال پر باگھ ندی کے کنارے واقع ہیں لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ گپھائیں تقریباً پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں اختراع کی گئیں۔ دوسرے غار میں 1929 میں تانبے پر لکھا ہوا ایک کتبہ ملا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ یہ گپھائیں راجہ سُبندھو (416-485) کے دور میں تعمیر کی گئی تھیں۔ یہ گپت خاندان کا آخری دور تھا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ ساری گپھائیں کسی وقت تصاویر سے پُر تھیں۔ ان میں سے کچھ ابھی تک بچی ہیں لیکن زیادہ تر ضائع ہوگئیں۔ دوسری وجوہات کے علاوہ ان تصاویر کے برباد ہونے کی سب سے خاص وجہ یہ ہے کہ ان غاروں کی چٹانیں قدرے نرم اور خستہ ہیں۔ لہٰذا تصویروں کی سطح جلدی خراب ہوگئی۔

سُبندھو کے کتبہ کی بنیاد پر شری گردے نے انھیں پانچویں صدی کا قرار دیا ہے جبکہ ہری ہرنواس دیویدی نے کہا ہے کہ ان گپھاؤں کی تعمیر کا زمانہ سو، دوسو برس پہلے کا ہونا چاہیے۔ ان کی دلیل ہے کہ اس عظیم کام کا آغاز سبندھو کے کتبہ سے سو، دوسو سال قبل ہی ہوا ہوگا۔ ملک راج آنند نے جون 1972 میں شائع رسالہ 'مارگ' کے 'باگھ خصوصی نمبر' میں کتبہ کا زمانہ 416-417 عیسوی ہی تسلیم کیا ہے۔[2]

ان گپھاؤں کو اجنتا کی طرح پہاڑیوں کو کاٹ کر بدھ بھکشوؤں کے قیام کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ان غاروں کے نام بھی مختلف ہیں۔ جیسے چوتھی گپھا کو 'رنگ محل' کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر انیس فاروقی نے چوتھی گپھا کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے جس سے ہمیں ان تصاویر کے موضوعات، اس وقت کی مروج پوشاک، موسیقی اور رقص کے مناظر، گھوڑسواروں اور ہاتھیوں کے جلوس، عورتوں کی حالت زار کے علاوہ پرندوں، پیڑ پودوں اور پھول پتیوں کی بھی زیبائش و آرائش کی مثالیں ملتی ہیں اور رنگوں کے استعمال

کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر انیس فاروقی کے مطابق:

''چوتھے غار کو 'رنگ محل' کہتے ہیں۔ اس کی دیوار اور چھت پر کچھ تصاویر بچی ہیں۔ اس غار کی سب سے مشہور تصویر 'ہلی ساکا' (گربھا رقص) ہے، جس میں ایک مرد کے ساتھ کئی عورتوں کو گاتے، ناچتے اور ساز بجاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ عورتوں کے سروں کے جوڑے کے ڈیزائن، شفاف اور چست پیرہن بھی اجنتا طرز سے ملتے جلتے ہیں۔ کپڑوں پر کالے، سفید اور بھورے رنگوں کے ڈیزائن ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ نیلے، لال اور پیلے رنگوں کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ گھوڑسواروں کے جلوس، ہاتھیوں اور روتی ہوئی عورتوں کے مناظر ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ پرندوں، پیڑ پودوں، پھول پتیوں کی بھی آرائشی طرز میں بہترین عکاسی ملتی ہے۔''[3]

باگھ گپھاؤں کی تصاویر سیکولر ہیں۔ انڈین سوسائٹی لندن کے ذریعے ان غاروں پر شائع مضمون جس کا عنوان 'باگھ کیوز' (Bagh Caves) ہے، جس کے مصنف ڈاکٹر جے۔ پی۔ ایچ ووگل ہیں، یوں رقم طراز ہیں:

All we can say is that they do not appear to illustrate any subject taken from the Buddha Legend but in all probability relate to some Jataka Dr Avadana.

گویا وہ (تصاویر) کوئی ایسے موضوع کا اظہار نہیں کرتی ہیں، جسے بدھ کی داستانوں سے اخذ کیا گیا ہو بلکہ وہ کسی جاتک یا اودان سے ماخوذ ہیں۔

ڈاکٹر فاروقی نے بھی باگھ کی غاروں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کے موضوعات کا غیر مذہبی ہونا قرار دیا ہے۔ لہٰذا انیس فاروقی 'ہندوستانی مصوری - ایک خاکہ' میں لکھتے ہیں:

''باگھ غاروں کی تصاویر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے موضوعات غیر مذہبی ہیں جبکہ اجنتا کے مذہبی ہیں۔''[5]

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ باگھ گپھائیں سابق دیسی ریاست گوالیار کے وندھیاچل پہاڑی سلسلے میں واقع تھیں لیکن آزادی کے بعد مدھیہ پردیش کا قیام عمل میں آتے ہی یہ اس صوبے میں شامل ہوگئی ہیں۔

1818 میں سب سے پہلے ان غاروں کا تعارف اور تفصیل لفٹنٹ ڈینجر فیلڈ نے بمبئی سے شائع کیا تھا۔ ان گپھاؤں کی تصاویر کا معائنہ 1908 سے 1907 کے وسط میں کرنل سی۔ ای لوآرڈ نے کیا اور دوبارہ یہ تصاویر دنیا کے سامنے منظر عام پر آئیں۔

ان گپھاؤں تک پہنچنے کے لیے پہلے مہو ریلوے اسٹیشن تک ٹرین سے جانا پڑتا ہے اور پھر مہو سے دھار کو جانے والے راستے سے باگھ قصبے تک موٹر گاڑیوں سے 87 میل کا راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ باگھ قصبے میں قیام کے لیے ریسٹ ہاؤس ہے لیکن دوسری سہولتوں کے لیے سیاحوں کو اپنے طور پر انتظام کرنا پڑتا ہے۔ باگھ قصبے سے یہ غار تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ برسات کے موسم میں باگھ ندی میں باڑھ کی وجہ سے آنے جانے میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ عام طور سے مہو سے سیاحوں کے لیے ٹیکسی اور موٹر گاڑیوں کی سہولت حاصل ہو جاتی ہے۔[6]

پہاڑ گڑھ گپھاؤں کی پینٹنگس:

ڈاکٹر ڈی، پی ایس دوارکیش نے مرینا ضلع کے پہاڑ گڑھ غاروں کے کامپلیکس کی تحقیق کر کے ایک اہم انکشاف کیا ہے۔ اس انکشاف سے متعلق ایک دلچسپ اور سحر انگیز تذکرہ بھی کتابچے کی شکل میں شائع کیا ہے، جس کا عنوان Pahargarh Cave Paintings ہے۔

ان گپھاؤں میں بہت سی نادر تصاویر کے نمونے بکھرے پڑے ہیں۔ اس لیے یہ غار 'مصور غار' (Painted Rocks) کہلاتے ہیں۔

ویسٹرن مشی گن یونیورسٹی کے سربراہ ڈاکٹر جان، ٹی برن ہارڈ نے 'پہاڑ گڑھ کیو کامپلیکس' کے کتابچے کے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے کہ 1979 میں ڈاکٹر ڈی، پی، ایس دوارکیش نے جو اسی یونیورسٹی میں لسانیات کے پروفیسر تھے، اب تک نامعلوم اور غیر تحقیق شدہ غاروں، کے بارے میں جو پہاڑ گڑھ گپھاؤں کے کامپلیکس کے نام سے مشہور ہیں، کی تحقیق کر کے اس بڑے راز سے پردہ اٹھایا ہے۔ یہ کتابچہ نہ صرف اس دریافت کا دلچسپ اور سحر انگیز بیان ہے بلکہ یہ آئندہ تحقیقات میں ممکنہ پیچیدگیوں کی طرف نشاندہی بھی کرتا ہے۔

ان گپھاؤں میں بہت سی مصوری کے نمونے پائے جاتے ہیں، جن کے بارے میں ایک سول انجینئر شری رام شرما نے جو ڈاکٹر دوارکیش کے دوست تھے انھیں ان بہت سے اساطیری داستانوں کے سلسلے میں بتایا تھا جو انھوں نے عجیب و غریب، نادر اور عمدہ رنگ آمیز چٹانوں کے بارے میں سن رکھے تھے۔

ان گپھاؤں میں بہت سی پینٹنگس ہیں ہزار سال قبل کی ہیں، جو انھیں بھیم بیٹکا کے غاروں کی تحقیق سے دو گنا قدیم بنا دیتی ہے۔ ڈاکٹر دوارکیش کا ماننا ہے کہ پہاڑ گڑھ کی کچھ ڈرائنگس Ideographs ہو سکتی ہیں جن سے ماقبل تاریخ ہندوستان کی زبان اور تحریر کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔

ماقبل تاریخ کے زمانے کے یہ غار پہاڑ گڑھ گاؤں کے قریب آسن ندی کے پہلو میں واقع ہیں جو دہلی کے جنوب میں 240 میل کے فاصلے پر ہیں اور گوالیار سے تقریباً سو کلومیٹر دور ہیں۔[7]

قرآن شریف کا نادر نسخہ: قطب الدین ایبک کے زمانے میں ہی گوالیار میں اسلام کا اثر ہو چکا تھا۔ 1398 میں لکھے گئے قرآن شریف میں بیل بوٹے کی فنکاری کے نمونے موجود ہیں جو نہایت عمدہ ہیں۔ یہ بہت پرانا اور نادر نسخہ ہے جو محبوب شایان کی فنکاری کا اعلا نمونہ ہیں۔

چندیری کا شاندار دروازہ: چندیری میں پٹھان فن تعمیر (Architecture) ملتا ہے۔ یہاں کا عظیم الشان دروازہ پٹھان فن تعمیر کی عمدہ مثال ہے۔

گوالیار کے قلعے میں فنکاری کے نمونے

گوالیار کے قلعہ کے اُروئی گیٹ سے جب ہم قلعے پر چڑھتے ہیں تو پہاڑ کو کاٹ کر دو بہت بڑی جین مورتیاں راجہ ڈونگرین سنگھ تومر نے تخلیق کروائی تھیں۔ ان مورتیوں کی اونچائی 57 فٹ ہے۔ اسی زمانے میں قلعے پر بہت سی جین مورتیاں بنوائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ 'ساس بہو کے مندر' کے اندر اور باہر جو کھدائی کا کام کیا گیا ہے وہ نہایت عمدہ ہے۔ جہاں گوالیار کے قلعے میں صدیوں پرانی مورتیوں کے شاہکار موجود ہیں، وہیں راجپوت، مغل اور مرہٹہ عہد کی صناعی، نقاشی اور فن تعمیر کے بے شمار نمونے بھی بکھرے پڑے ہیں۔

حواشی

1. لکشمن بھانڈ گوالیار قلم، ص22، 1995
2. Mulk Raj Anand: Bagh Caves, special issue Marg
3. ڈاکٹر انیس فاروقی: ہندوستانی مصوری - ایک خاکہ، ص28
4. Dr. J. P. H. Vogel-Bagh Caves, Indian Society London
5. ڈاکٹر انیس فاروقی: ہندوستانی مصوری - ایک خاکہ، ص28
6. ڈاکٹر اوی ناش بہادر ورما: بھارتی چتر کلا کا اتہاس، ص66
7. Dr. D.P.S Dwarikesh- Pahargarh Cave Complex, Forward by John. T Bernhard, President, Wester Michigan University.

■

Waqar Siddiqui
103, Garden Homes
Phase - 3, Alkapuri
Gwalior - 474006
Mob.:8989133543

دکنی منظومات میں نقدِ شعر کی روایت

آصف مبین

دکن کا تنقیدی سرمایہ

دکن کا شعری تصور اردو تنقید کی خشتِ اوّل ہے۔ اس باب میں دکنی شعرا کا کلام بنیاد کا وہ پتھر ہے جس پر اردو تنقید کی پوری عمارت قائم ہے۔ اردو تنقیدی روایت کی تلاش پر ہونے والی تمام بحث عموماً ملا وجہی اور اُس کے شعری تصور کے اردگرد گھوم کر رہ جاتی ہے۔ بہت خیال رکھا تو کسی نے ابن نشاطی کے ایک آدھ شعر کا ذکر کر دیا۔ جبکہ نقدِ شعر کا یہ تصور یکجا نہیں جا بہ جا بکھرا پڑا ہے۔ اس سلسلے میں بڑی آزمائش مواد کا بکھراؤ ہے۔ مثال کے طور پر مثنوی 'چندر بدن و مہیار' میں مقیمی نے 'وانصاف دادنِ شعر و ترتیب کردنِ سخن' کی سرخی قائم کر کے سخن اور کلام کے اوپر آٹھ شعر کہے ہیں۔

زباں کا اتا ہوں سچا جوہری کروں بت سخن سوں گہر گستری
قصا یک کہوں میں گہربار کا سو چندر بدن اور مہ یار کا
سنے کوئی مج کوں دعا یاد کر رہیں گے تعجب سوں دل شاد کر
تتبع غواصی کا باندیا ہوں میں سخن مختصر لیا کے ساندیا ہوں میں
عنایت جو اس کی ہوئی مج اُپر یو تب نظم قصہ کیا سر بسر
ولے میں اپس کوں سرایا نہیں شعر میں کسی کا پھرایا نہیں
سرانا پھرانا نِتھا کام ہے کرے اُن عمل یو کہ جو خام ہے
شعر کا تلازم گہردار ہے سنورنا طبیعت کوں ناچار ہے

(مثنوی چندر بدن و مہیار از مرزا محمد مقیم مقیمی بیجاپوری، مرتب: محمد اکبرالدین صدیقی ایم اے: مجلس اشاعت دکنی مخطوطات اور دکھنی ساہتیہ پرکاشن سمیتی 1956)

اس سے ذرا پہلے ایک عنوان 'بیان ابتدائے عشق و تالیف کتاب' کے آخری دو شعر میں کہتا ہے۔

ہوا دل پویوں کر تفکر قریب کہوں شعر موزوں، حکایت عجیب
بچن دُرہو دل تھے اُبلنے لگے نوے طرز خوش تب نکلنے لگے

مثنوی کے خاتمے پر آخری سے پہلا شعر کچھ اس طرح کہا:

دنیا تو فنا ہے مقیمی سہی رہے گی بچن کی نشانی یہی

اس طرح پوری مثنوی اور تین سرخیوں میں 'نقدِ شعر' پر گیارہ بیت ملتی ہیں۔

دکنی منظومات میں تنقیدشعر

دکنی ادب میں 'تنقیدِ شعر' کے نمونے 'تصورِ شعر' کی شکل میں ملتے ہیں۔

(کلیات محمد قلی قطب شاہ، مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی 1998)

دکنی شعرا نے 'تعریف سخن'، 'در باب سخن' جیسے عنوانات کے تحت شعر کے سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً غواصی نے مثنوی 'سیف الملوک و بدیع الجمال' میں کلام کے امتیازات کے لیے 'تعریف سخن' کی سرخی استعمال کی ہے۔ مقیمی نے 'چندر بدن و مہیار' میں 'وانصاف دادنِ شعر و ترتیب کردنِ سخن' کے عنوان سے شعری خصوصیات کا بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ملا وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' میں 'درشرح شعر گوید' اور 'وجہی تعریف شعر خود گوید' جیسی سرخیوں کے تحت دکن کی تنقید شعر کا سب سے اہم اور تفصیلی بیان پایا جاتا ہے۔ بسا اوقات شاعر کی 'تعلّی' سے بھی۔ جو عموماً اپنے کلام کی خصوصیات، قادرالکلامی کے اظہار اور فنی برتری کے افتخار پر مشتمل ہوتی تھی۔ شعر کے بارے میں شاعر کی رائے کا علم ہوتا ہے۔

عربی و فارسی کے ادبا و نقاد کے حوالے سے شعر کی اصل پر بحث کرنے کے بعد شبلی نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ''جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے۔'' شعرالعجم کی چوتھی جلد میں شبلی نے شعر کے عناصر متعین کرنے کی کوشش کی تھی اور ایک عنوان بنام 'شاعری کے اصلی عناصر کیا ہیں؟' قائم کیا تھا۔

(شبلی نعمانی، شعرالعجم، جلد چہارم، انوارالمطابع لکھنؤ، ص6)

اسی سے متصل دوسرے باب 'ایران میں شاعری کی ابتدا کیونکر ہوئی؟' کے تحت شبلی نے کئی عنوانات مثلاً: صحتِ الفاظ کی پروا نہ تھی، عروض کے قواعد کا چنداں لحاظ نہ تھا، تشبیہ کی سادگی، مدح میں سادگی، عاشقانہ خیالات میں سادگی، پر بات کی ہے۔

(تفصیل کے لیے دیکھیں شعرالعجم، جلد چہارم، صفحات 104-89)

شبلی کی بحث سے پتا چلتا ہے کہ شاعری کا دریا ابتدا میں بیان کے خارجی قواعد سے آزاد ہوتا ہے۔ دکنی شعرا کے تصورِ نقد پر بات کرتے ہوئے، یہ پہلو اہمیت کا حامل ہے کہ اپنے تنقیدی شعور میں یہ شعرا مشرقی تصورِ نقد کے کتنے دور یا پاس رہے ہیں۔

دکن کے دستیاب متن کو تاریخی طبیعت کے سانچے میں دیکھا جائے تو وجہی جیسے شعرا سے قبل بھی اُردو تنقید کی روایت کا سراغ ملتا ہے۔ بہمنی دور میں نظامی کے علاوہ فیروز بیدری، لطفی اور مشتاق کے نام ملتے ہیں۔ فیروز (قطب الدین قادری)، سید محمود اور ملا خیالی قطب شاہی دور کے اوّلین شاعروں میں ہیں اور چوتھے قطب شاہی حکمراں ابراہیم قطب شاہ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس بات کی دلیل وجہی اور ابن نشاطی جیسے شعرا کے وہ اعترافات ہیں جو انھوں نے اپنے پیش رو شعرا کی تفہیم و تنقیدِ فن کے سلسلے میں کیے ہیں۔ چنانچہ وجہی کہتا ہے۔

کہ فیروز و محمود اچھتے جو آج تو اس شعر کوں بہوت ہوتا رواج

(مثنوی قطب مشتری 1018ھ از اسداللہ وجہی، مرتب: ڈاکٹر حمیرا جلیلی: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ جون 1992)

طیب انصاری نے بہمنی سلطنت کے عروج اور محمود گاواں کے دورِ وزارت کی ترقیوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: ''اب اُردو کے قدیم ادب میں جسے آپ دکنی ادب بھی کہتے ہیں مذہبی عقائد کے علاوہ علمی اور خالص ادبی و رومانی افکار بھی در آئے۔ چنانچہ دبستانِ بیدر میں نظامی، نظیری، آذری، ہاشمی، فیروز اور محمود جیسے اساتذۂ سخن پیدا ہوئے۔'' (ص:15: نصرتی کی شاعری از طیب انصاری: مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد- 1984)

ابن نشاطی ان استادانِ فن کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے۔

نہیں وو کیا کروں فیروز استاد   کہ دیتا شاعری کا کچ مزا داد
اَہے صد حیف جو نیں سید محمود   کتے پانی کوں پانی دُودُ کوں دُودُ
نہیں اس وقت پر وو شیخ احمد   سخن کا دیکھتے باندیا سو میں سد
حسن شوقی اگر ہوتا تو الحال   ہزاراں بھیجتا رحمت منجہ اُپرال
اچھے تو دیکھتا مُلّا خیالی   یو میں برتیا ہوں سو صاحب کمالی

(مثنوی: پھول بن از ابن نشاطی- 1076ھ: مرتبہ: اکبرالدین صدیقی: مطبوعہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 2008 (طبع اول- 1978)

تنقید کا پہلا وجود فن کار کی اُس نظر اور رائے سے وابستہ ہے، جو فن کے متعلق اس کے ذہن میں جا کرتی ہے۔ میں یہاں اس سلسلے کی صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ دکنی شعرا میں وجہی پہلا شاعر ہے جس نے شعر کی بابت اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مثنوی 'قطب مشتری' میں اُس نے اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وجہی نے اس مثنوی میں 'درشرح شعر گوید' اور 'وجہی تعریف شعر خود گوید' سرخیوں کے تحت کل ستانوے اشعار معیارِ سخن کے طور پر درج کیے ہیں۔ سادگی، معنی آفرینی اور لفظ و معنی کے بیچ ربط و تعلق؛ وجہی کے شعری نظریے کے تعلق سے یہ تین باتیں اکثر سامنے آتی ہیں۔

جو بے ربط بولے توں بیتاں پچیس   بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
سلاست نہیں جس کیرے بات میں   پڑیا جائے کیوں جز لے کر بات میں
کھیا ہے توں یو شعر ایسا سرس   کہ پڑنے کو عالم کرے سب ہوس
(سلاست و روانی)

جسے بات کے ربط کا فام نئیں   اسے شعر کہنے سوں کچ کام نئیں
دو کچ شعر کے فن میں مشکل اچھے   کہ لفظ ہور معنی یو سب مل اچھے
جو معنی ہے معشوق بھوو حات کا   پناپا ہوں کسوت اسے بات کا
(لفظ و معنی کے بیچ ربط)

اگر فام ہے شعر کا تجکوں چھند   چنے لفظ لیا ہور معنی بلند
رکھیا ایک معنی اگر زور اچھے   ولے بھی مزا بات کا ہور چھے
(معنی آفرینی)

وجہی کے تنقیدی خیالات کا ذکر کرتے ہوئے سید مسعود سراج نے اپنے مقالے 'دکنی ادب میں تہذیب اور سماج' میں لکھا ہے ''وجہی شاعری میں ندرت، جدت، ذاتی اُپج کا قائل ہے۔ روشِ عام پر چلنا یا پامال مضامین کو باندھنا اسے پسند نہیں۔ شعر میں جدت ہونی چاہیے۔ دوسروں کا تتبع کرنا آسان ہے۔ ان خیالات کو پیش کرنا جن کو پیش رو شعرا ادا کر چکے ہیں سہل ہے۔ لیکن نئی بات پیدا کرنا مشکل ہے۔ حقیقی شاعر وہی ہے جو اپنے دل سے نئی بات پیدا کرتا ہے۔

جو کرتا کیس کا ہنر دیک کر   ہنروند اسے نیں کتے ہیں ہنر
ہنروند اس کو کھیا جائے گا   جکوئی اپنے دل سے نوا لیائے گا
فرق ہے اول ہور آخیر میں   تفاوت اہے نیر ہور شیر میں

سخن گو وہی جس کی گفتار تے   اچھل کر پڑے آدمی ٹھار تے
نکو بول مضمون توں ہور کا   کہ کالا ہے وو جگ میں منہ چور کا'

(ص:76-77: دکنی ادب میں تہذیب اور سماج، مقالہ نگار: ایس مسعود سراج: یونیورسٹی آف میسور، میسور- 1984)

وجہی نے 'قطب مشتری' میں اس موقعے (عنوان: وجہی در شرح شعر گوید) پر مذکورہ باتوں کے علاوہ کلام کی اہمیت، کلام کا شیریں ہونا، صنائع کا استعمال اور کلام میں ندرت کا پایا جانا جیسی باتیں بھی بیان کی ہیں۔ لیکن اس نے کچھ اور باتیں بھی کہی ہیں، جو شعر و سخن کے تعلق سے اہم ہیں اور وجہی کی وسعتِ قلبی اور علوِ نظر پر دلالت کرتی ہیں۔ یہاں ان عنوانات کو مثالوں کے ساتھ ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا۔

اتباعِ قدما

اسی لفظ کوں شعر میں لیائیں توں   کہ لیایا ہے استاد جس لفظ کوں

شناسانِ فن کی اہمیت

کہ فیروز و محمود اجیتے جو آج   تو اس شعر کوں بھوت ہوتا رواج
یا۔

جو عاقل ہے یو بات مانے وہی   قدر اس ادا کی پچھانے وہی

'دودھ اور چھاچھ ایک نہیں ہو سکتے' بتانے کے بعد کہتا ہے کہ 'فن فنکار کے پاس ہوتا ہے'۔

نہ یو بات ہر ایک کے سات ہے   جکوی عارف ہے اس سوں یو بات ہے

شاعری جزویست از پیغمبری ہم سنتے آئے ہیں۔ وجہی نے بھی کہا تھا کہ یہ خداداد چیز ہے، زور لگا کر حاصل نہیں کی جا سکتی۔

اپی ہو کے لیانا، سو ہے جھوٹ سب   خدا غیب تے دیوے تو کیا عجب

اور آخر میں اُردو زبان کا یہ سخنور کہتا ہے کہ؛ گرچہ شعر گوئی کمال ہے لیکن شعر فہمی اس سے بھی بڑا کمال ہے:

شعر بولنا گرچہ اُپروپ ہے   ولے فامنا کہنے تے خوب ہے
('قطب مشتری' عنوان: وجہی در شرح شعر گوید)

ابن نشاطی:

ابن نشاطی بنیادی طور پر ایک انشا پرداز تھا۔ مثنوی 'پھول بن' پر لکھے اپنے مقدمے میں اکبرالدین صدیقی نے لکھا ہے کہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھول بن سے قبل ابن نشاطی نے شعر کہنے کی کوشش نہیں کی بلکہ انشا پردازی کی طرف ہی زیادہ مائل رہا ہے۔'' (اکبرالدین صدیقی: مقدمہ مثنوی 'پھول بن') شاید یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی تعلّی کی بنیاد انشا پردازی اور صنعت گری پر رکھی ہے۔

مری ہے نظم میں انشا کے دھاتاں   رہے انشا کے دھاتاں اور باتاں

اس بات کو ذہن میں رکھ کر جب ہم مثنوی 'پھول بن' کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ گو، اُس کا درجہ انشا پرداز کا سہی، لیکن وہ معنی کی اہمیت اور نصیحت کے وزن سے انکاری نہیں۔ ابن نشاطی زبان کے خارجی حسن اور معنی کی گیرائی؛ دونوں کی اہمیت سے واقف اور اُن کا قائل ہے۔ ابن نشاطی نے شاعری کے دو اصول بتائے ہیں۔ پہلا، یہ کہ صنائع بدائع؛ صحت قافیہ اور خوبصورت تشبیہات شاعری کی جان ہیں۔ دوسرا فن شاعری عالی فن ضرور ہے لیکن 'خالی بات' سے کام نہیں چلتا جب تک کہ اس میں کوئی نصیحت نہ پوشیدہ ہو۔ نصیحت اور صنعت کے مل کر ایک بن جانے سے بلند شاعری وجود میں آتی ہے۔

اگرچہ شاعری کا فن ہے عالی   ولے کیا کام آوے بات خالی

طیب انصاری نے کتاب 'نصرتی کی شاعری' میں ابن نشاطی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''لانگی نس نے ایک صدی بعد وہی بات کہی جو ابن نشاطی (پھول بن) نے ایک صدی قبل کہی تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ اگر شعر میں نصیحت نہ ہو تو کم از کم صنعت تو ہو۔ اگر شعر میں نصیحت ہو نہ صنعت تو ایسا شعر ہیچ ہے۔'' (نصرتی کی شاعری، ص:37) 'پھول بن' میں ابن نشاطی نے سرخی 'دربیان آواز دادن ہاتف' کے تحت سخن، عبارت آرائی، طرز موزوں اور طبع رواں کے بارے میں شعر کہے ہیں۔

سخن کا آج ہوکر تو گہر سنج　　سخن کا کھولنا نیں کیا سبب گنج؟
سخن کے پھول کی تاثیر تے توں　　معطر کرجگت یک دھیر تے توں
سخن کوں فہم سوں کرتا ہے توں خوب　　سلاست بات کا دھرتا ہے توں خوب
سخن کوں توں سنگارن جانتا ہے　　سخن کوں تیرے ہر کئی مانتا ہے
سخن کا طرز تجہ آتا ہے تازا　　سخن کا سٹ توں عالم میں آوازا
خدا تج کوں دیا ہے فہم عالی　　سخن کے تج کوں بخشتا ہے لوالی
تجے معلوم ہے سارے صنائع　　نکو اوقات کر توں اپنا ضائع
کہاں مشکل عبارت کس کوں سجتا　　عبارت سب کے وو نیں سجتا
لگا کر طبع کی موتیاں سوں ڈورا　　بچن کا جگ منے ماریا ڈھنڈورا
علم کو بات کے اُنچا اُچایا　　اپس کی طبع کی زوری دکھایا
نہ تھا جس ٹھار بل، پھرنے کوں تازی　　کریا اُس ٹھار میں چوگان بازی

مثنوی کے آخری حصے میں بھی تقریباً چوالیس شعر اس مضمون سے متعلق پائے جاتے ہیں جس میں کہتا ہے۔

جو کوئی صنعت سمجھتا ہے سو گیانی　　وہی سمجھے مری یو نکتہ دانی
ہنر کوئی نیں دکھائے سو دکھایا　　صنائع ایک کم چالیس لایا
ہر ایک مصرعہ اوپر ہوکر بیحد خوب　　رکھا میں قافیہ لامستند خوب

یہ دلچسپ بھی ہے اور عجیب بھی کہ غزل کا جادو اُس اولین دور میں ہی لوگوں پر چڑھ رہا تھا چنانچہ غزل کی مقبولیت اور مرتبے کا اعتراف اور اپنی شاعری سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

غزل کا مرتبہ گرچہ اول ہے　　ولے ہر بیت میرا ایک غزل ہے

دکنی تنقید کی بنیاد

دکن کے اس 'تصور شعر' سے قبل اُردو میں تنقید شعر کی روایت موجود نہ تھی۔ تنقید شعر کی جو روایت ان تک پہنچی تھی وہ عربی اور فارسی ورثے پر مشتمل تھی۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے لکھا ہے کہ ''عربی ادب میں اگرچہ مواد اور اسلوب دونوں کی اہمیت مسلم ہے لیکن ہیئت کو موضوع پر فوقیت اس لیے حاصل ہے کہ شاعر کا تصور ان کے ذہن میں فنکار کا نہیں بلکہ مرصع کار یا دستکار کا ہے۔'' (اردو تنقید کی تاریخ: ڈاکٹر مسیح الزماں: اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ - 1983، پہلا اکادمی ایڈیشن: ص22) شعری روایت کا یہ شعور صنائع بدائع اور طرز اظہار کی برتری پر مبنی تھا۔ تنقید شعر کا جو سرمایہ ان لوگوں تک پہونچا وہ مشرقی تنقیدی تصورات پر مبنی تھا جس کا بڑا حصہ عربی اور فارسی ادب کے تصور شعر پر مشتمل تھا۔ عہد وسطیٰ میں ان دونوں (عربی و فارسی) زبانوں میں شعری ادب کے تعلق سے تقریباً ایک جیسے معیارات ملحوظ خاطر رہے ہیں۔ اُس دور کے علمائے ادب لفظ کو معنی پر ترجیح دیتے تھے۔ شاعری کو پرکھنے کے لیے معانی، بیان، بدیع، عروض اور علم قافیہ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کے مطابق ''اردو میں جب باقاعدہ شاعری شروع ہوئی تو اس کے شاعروں کے آگے فارسی ادب کا پربہار چمن لہلہا رہا تھا۔ کانوں میں فارسی نغمہ نجوں کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ مذاق اسی صنعت گری کی داد دے رہا تھا۔ اس لیے یہاں بھی وہ تمام چیزیں لائی جانے لگیں جو فارسی میں رائج تھیں۔'' (اردو تنقید کی تاریخ: مسیح الزماں خاں، ص:41) دکنی شعرا نے انہی معیارات کو سامنے رکھا۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ دکنی ادب اور شمالی ہند میں بارہ ماسہ کی روایت کے حوالے سے، اُردو پر شمالی ہند کی زبانوں؛ اَودھی، برج بھاشا اور بھوج پوری کے ساتھ ساتھ سنسکرت اور اس کی شعریات کا اثر رہا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے دکنی کی نشوونما میں علاء الدین خلجی کے دور میں افواج اور فیروز تغلق کے وقت میں شہریوں کے ساتھ آئی 'دہلی و پیرامنش' کی زبان نیز اکبر کے ذریعے فتح گجرات کے بعد گجری کے 'بقیۃ السلف' کے علاوہ برج بھاشا کا بھی ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں ''دکنی ہندوستانی کے ارتقا کی بحث میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی ہی کے عہد میں گجرات کے علاوہ دوآبہ کے بھی ارباب علم و فضل دکن پہنچے کیونکہ اس بادشاہ کو موسیقی اور ہندوؤں کے علوم سے دلچسپی تھی۔ اس کے دربار میں ان علوم و فنون کے جو ماہر ہندوستان خاص سے آئے تھے وہ یا تو برج بھاشا کے شاعر اور موسیقی دان تھے۔ یا اُن کی زبان پر برج بھاشا کا بہت اثر تھا۔ چنانچہ خود ابراہیم نے برج بھاشا سیکھی اور اس کی کتاب 'نورس' اسی زبان میں ہے۔'' ('ہندوستانی لسانیات' از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پبلشر: نسیم بک ڈپو لکھنؤ، سنہ اشاعت: 1975، صفحہ 110)

اسی طرح نظامی کی 'کدم راؤ پدم راؤ' کے بارے میں شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے ''کدم راؤ پدم راؤ' کی زبان مغلق اور کٹھن ہے...اس کی وجہ یہ ہے کہ نظامی نے فارسی پر تکیہ کرنے کے بجائے تیلگو، کنڑ، کسی قدر مراٹھی اور پھر سنسکرت کے تت سم الفاظ کو کثرت سے راہ دی ہے۔'' (فاروقی، اُردو کا ابتدائی زمانہ مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ وقومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، دہلی سنہ اشاعت 2011 صفحہ 74)

عبدالقادر سروری، ڈاکٹر زور وغیرہ کی تحقیقات اور ماضی قریب کی تصنیفات مثلاً 'اُردو کا ابتدائی زمانہ' سے پتا چلتا ہے کہ دکنی شعرا کا شعور نہ صرف گذشتہ تنقیدی روایت کے مطابق بلکہ منظم بھی تھا۔ ان میں اولین دور کے بعض شعرا کا نہایت طاقتور ہے جو اشارہ کرتا ہے کہ انھیں اپنے کلام کی اہمیت اور افادیت کا بھرپور احساس بھی تھا اور اُس پر فخر بھی۔ نصرتی کے چند شعر جو فارسی شعر کی معیار بندی، اس کی مقبولیت اور اس کے بالمقابل دکنی کلام کے تعین قدر کے ضمن میں آئے ہیں۔

معانی کی صورت تے ہو آرسی　　کیا شعر دکھنی کوں جوں فارسی
فصاحت میں گر فارسی خوش کلام　　دھرے فخر ہندی بچن پر مُدام
میں اس دو ہنر کے خلاصیا کوں پا　　کیا شعر تازہ دونو فن ملا
اَدیکھیا اگر ہو حسد سوں کباب　　رکھے بول اتنا کہ دکھنی کتاب
سج دار کو خوب سودے سوں کام　　نہ دوکان کا دیکھنا سقف و بام

(مثنوی گلشن عشق- 1068ھ، مرتب: سید محمد ایم۔اے۔ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات، حیدرآباد)

نصرتی نے اس نظریہ شاعری کے مطابق کلام کو طاق گردوں پر لے جا کر رکھا ہے۔ سخن کی بیل کو یہاں تک بڑھایا کہ وہ فلک کے منڈوے پے جا چڑھی ہے چنانچہ کہتا ہے۔

کیا میں بچن بیل کو یوں بڑی　　بڑی سو فلک کا چ منڈوا چڑھی

■

Asif Mubeen
Research Scholar, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi - 110007
Mob.:9990289656

عامر شیرازی

صنف رباعی کا آغاز و ارتقا

رباعی 'عربی' زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی چار چار کے ہیں۔ عربی میں اربع کے معنی چار کے ہیں۔ رباعی میں چار مصرعے ہوتے ہیں اس لیے چار مصرعوں والی اس نظم کا نام رباعی ہوگیا۔ شعری مصطلحات میں رباعی اس صنف سخن کا نام ہے جس میں مخصوص وزن کے چار مصرعوں میں ایک خیال ادا کیا جاتا ہے۔ گویا رباعی اردو کی وہ مختصر ترین صنف ہے جس میں مقررہ اوزان، وحدت خیال اور تسلسل بیان کی پابندی ازبس ضروری ہے۔ یہ اس صنف کا اعجاز ہے کہ معانی کا ایک دفتر صرف چار مصرعوں کے کوزے میں معانی کا دریا بن سما جاتا ہے۔ بقول سیّد وحید اشرف:

''فنی اعتبار سے رباعی ایک مشکل ترین صنف سخن ہے۔ اس کے قواعد وضوابط کا وقوف عام نہیں، یہ مخصوصین کا حصہ ہے۔ 24 بحروں کی قید، قافیہ وردیف کا التزام، ارکان میں ''سبب پے سبب وتد پے وتد'' کی پابندی، لطافت خیال کا پاس، علو فکر، پرواز خیال، مضمون کی ندرت، اور چوتھے مصرعے کی تیزی ورزش کہ کڑی کمان کا تیر معلوم ہو، آسان کام نہیں۔'' (رباعی، سیّد وحید اشرف، بشیر وانی پبلی کیشنز، حیدرآباد، 1987، ص 2)

رباعی میں تسلسل بیان اور خیال کے تدریجی ارتقا کے خوبصورت اظہار کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ رباعی کے چاروں مصرعے زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم مربوط ہوں۔ الفاظ وتراکیب کا انتخاب، موضوع کی مطابقت سے ایسا برمحل ہو کہ اس سے بہتر کا تصور ہی نہ ہو سکے۔ پہلے مصرع میں مناسب الفاظ کے ساتھ خیال کو روشناس کرایا جائے۔ دوسرے اور تیسرے مصرع میں اس کے خط وخال کچھ اور نمایاں کیے جائیں اور چوتھے مصرع میں مکمل خیال کو ایسی برجستگی اور شدت کے ساتھ سامنے لایا جائے کہ سننے والا مسحور ومتحیر ہو کر رہ جائے، یوں سمجھ لیجیے کہ رباعی کے پہلے تین مصرعے، رباعی کے مجموعی شاعرانہ حسن واثر کے لیے ایک ایسی لطیف اور سادہ فضا تیار کرتے ہیں جس سے سامع اکثر بے خبر رہتا ہے۔ لیکن یہی سادہ پرکار فضا جب چوتھے مصرع میں ڈرامائی انداز سے سامنے آتی ہے تو بڑی جرأت آزما بن جاتی ہے۔

فارسی کے مشہور غزل گو شاعر صائب نے رباعی کے چوتھے مصرعے کے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے۔

از رباعی بیت آخری زندنا خن بہ دل
خط پشت لب بہ چشم ماز ابرو خوشتراست

فراق گورکھپوری نے صائب کے خیال کو ایک اردو رباعی میں اس طرح منتقل کیا ہے۔

پہلے مصرعے میں حُسن کا خطِ جبین اور دوسرے مصرعے میں لٹوں کی تزئین
چوتھا ہو نکلتا ہوا یوں تیسرے سے جیسے بھیگی مسیں ہوں ابرو سے حسین

رباعی اپنی مستقل ومتعین ہیت کے اعتبار سے جملہ اصناف شعر سے مختلف ہے۔ یوں تو قصیدہ اور غزل کی طرح رباعی کے بھی پہلے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں یعنی رباعی میں بھی مطلع ہوتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ دو شعر سے آگے نہیں بڑھتی۔ معنوی اعتبار سے رباعی میں چونکہ قصیدہ اور غزل دونوں کے مضامین کی گنجائش ہوتی ہے اس لیے اسے مختصر ترین قصیدہ یا غزل بھی کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ قصیدہ اور غزل کے موضوعات اور ان کی وسعتوں کے باوجود کسی نہ کسی طور پر محدود ہیں لیکن رباعی کی معنوی وسعت کی حدود مقرر نہیں ہیں۔

جس طرح اردو ادب میں رشید احمد صدیقی نے 'غزل' کو 'اردو شاعری کی آبرو' کہا ہے اسی طرح سید وحید اشرف نے 'رباعی' کو 'عصمتِ شاعری' کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''غزل آبروے شاعری ہو تو ہو، عصمتِ شاعری رباعی ہے اور صرف رباعی۔ غزل ہی کی طرح رباعی بھی اردو میں فارسی سے آئی ہے اور پورے جلال وجمال کے ساتھ۔ خیام ہوں یا سرمد، بابا افضل کوہی ہوں یا بابا طاہر عریاں، ابوسعید ابی الخیر ہوں یا سعدی وجامی، صنف رباعی نے ان کے دم سے زندگی پائی اور ان کا نام رباعی گو کی حیثیت سے آسمان ادب پر درخشاں ہے۔ ان کی رباعیاں اخلاقی وروحانی اعتبار سے اتنی بلند پایہ ہوئیں کہ صوفیا ومشائخ نے انھیں مشاغل ووظائف میں داخل کرلیا اور ان کے اثرات وتصرفات کا برملا اظہار ہونے لگا۔ نتیجتاً ہر آئندہ رباعی گو رباعی کے اس معیار کو فراموش نہ کرسکا'' (ایضاً ص 2)

قواعد اور عروض کے ماہرین نے مختلف کتابوں میں رباعی کے مختلف نام مثلاً رباعی، چوبالا، ترانہ، دوبیتی، چہار مصراعی وغیرہ بتائے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ صنف دیگر

زبان میں بھی رائج ہوئی اور مختلف ناموں سے مشہور ہے۔ مثلاً 'ہندی' میں 'چوپائی'، 'پشتو' میں 'چاربیتہ'، 'سنسکرت' میں 'چار چرن'، 'انگریزی' میں 'کواٹرین' وغیرہ جیسے ناموں سے موسوم ہے۔ آغاز میں رباعی کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے تھے۔ بعد میں تیسرا مصرع غیر مقفیٰ ہوگیا تو اس نے رباعی خصی کا نام پایا۔ اگر چہ اس کے چاروں مصرعے ہی زوردار ہوتے ہیں مگر چوتھا مصرع تو گویا نقطۂ عروج کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

رباعی ایک ایرانی الاصل صنف ہے۔ اس کے اوزان ایرانی زا ہیں اور اہل فن نے بحر ہزج سالم۔

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

سے حسب ذیل دس ارکان نکالے ہیں اور رباعی کے وزن کے لیے مخصوص کر دیے ہیں۔ ان میں ایک رکن سالم ہے باقی نو زحافات کے ساتھ آتے ہیں۔ جیسے:

	رکن	نام	
1.	مفاعیلن	سالم	
2.	مفاعلن	مقبوض	
3.	مفاعیل	مکفوف	م کے پیش کے ساتھ
4.	مفعولن	اخرم	
5.	مفعول	اخرب	
6.	فعول	اتھم	لام کے وقف کے ساتھ
7.	مفاعلن	اشتر	
8.	فعل	مجبوب	لام کے سکون کے ساتھ
9.	فاع	ازل	عین کے وقف کے ساتھ
10.	فع	ابتر	

رباعی کے ہر مصرعے میں انھیں دس ارکان میں سے کوئی چار ضرور آئیں گے۔ علمائے عروض وقواعد اس امر پر متفق ہیں کہ رباعی کا ہر مصرع چار رکنی ہوتا ہے اور بحر ہزج مثمن اخرب واخرم کے چوبیس اوزان کے سوا رباعی میں کوئی اور وزن نہیں آتا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب 'اردو رباعی: فنی وتاریخی ارتقا' (صفحہ 47) میں لکھتے ہیں کہ:

''بعض نے چار رکنی مصرعے کی تخصیص کے سلسلے میں اس طور پر وضاحت بھی کر دی ہے۔''

''ایک اور بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ رباعی کے ہر مصرعے میں صرف چار ارکان ہوتے ہیں۔ نہ تین ہو سکتے ہیں نہ پانچ۔''

(امیر العروض از بزمی انصاری، مطبع لاہور، 1939، ص 55)

صاحب بحر الفصاحت بڑی وضاحت سے بطور تاکید تحریر فرماتے ہیں:

''الحاصل اس بحر کا نام بحر رباعی ہے کیونکہ رباعی اس بحر کے سوا کسی اور بحر میں نہیں کہی جا سکتی۔ جو لوگ ناواقف ہیں وہ عوام کی طرح ہر ایک وزن کے دو بیت قافیہ دار کو رباعی نہ کہیں گے۔'' (بحر الفصاحت)

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ مخصوص وزن کے سوا کسی وزن کے دو قطعہ بند شعروں کو رباعی نہیں کہہ سکتے۔ رباعی کے ہر مصرعے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقررہ وزن میں ہو اور چہار رکنی ہو۔

رباعی کے اوزان کی تفصیل کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب 'اردو رباعی: فنی وتاریخی ارتقا' میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''رباعی کے اوزان کے مخرج کے سلسلے میں جن ارکان کا ذکر کیا گیا ہے ان سے حسن بن قطان خراسانی نے چوبیس وزن اختراع کر کے دو دائرے اخرم واخرب نام کے ترتیب دیے ہیں اور ہر دائرے میں ذیل کے مطابق بارہ اوزان رکھے گئے ہیں۔ اخرب کے تمام اوزان مفعول سے اور اخرم کے تمام اوزان مفعولن سے شروع ہوئے ہیں۔

اخرب:

1. مفعول مفاعیلن مفعول فعول
2. مفعول مفاعیلن مفعول فعل
3. مفعول مفاعیلن مفعولن فاع
4. مفعول مفاعیلن مفعولن فع
5. مفعول مفاعلن مفاعیلُ فعول
6. مفعول مفاعلن مفاعیل فعل
7. مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع
8. مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع
9. مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع
10. مفعول مفاعیل مفاعیلن فع
11. مفعول مفاعیل مفاعیل فعول
12. مفعول مفاعیل مفاعیل فعل

اخرم:

1. مفعولن مفعولن مفعولن فاع
2. مفعولن مفعولن مفعولن فع
3. مفعولن مفعولن مفعول فعول
4. مفعولن مفعولن مفعول فعل
5. مفعولن مفعول مفاعیلن فاع
6. مفعولن مفعول مفاعیلن فع
7. مفعولن مفعول مفاعیلُ فعول
8. مفعولن مفعول مفاعیلُ فعل
9. مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع
10. مفعولن فاعلن مفاعیلن فع
11. مفعولن فاعلن مفاعیل فعول
12. مفعولن فاعلن مفاعیل فعل

ان چوبیس اوزان کو ایک دوسرے سے منسلک کرنا جائز ہے، یہ ضروری نہیں کہ چاروں مصرعے چوبیس وزن میں سے کسی ایک ہی وزن میں ہوں۔

رباعی کے اوزان کی فنی پابندی میں کبھی کبھی بڑے بڑے اساتذۂ فن اور علمائے ادب نے بھی دھوکہ کھایا ہے۔ حتیٰ کہ غالب جیسا محتاط استاد فن ذیل کی اردو رباعی میں ایک رکن زائد نظم کر گیا ہے۔

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب　　دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ شب کو نیند آتی ہی نہیں　　سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

اس رباعی کے دوسرے مصرعے میں ایک 'رک' بروزن فع زائد ہے۔ اس مثال سے رباعی کے وزن کی دشواری اور اس سے عہدہ براری کی مشکلات کا کم وبیش اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

رباعی کے تاریخی ارتقا کے مطالعے سے یہ بات آئینے کی طرح صاف ہو جاتی ہے کہ فارسی رباعی کو ابتداء میں صوفیا نے اپنے گلے کا ہار بنایا پھر اس کے بعد مفکرین و مصلحین اس طرف راغب ہوئے اور بعد ازاں رباعی فارسی کے عام شعرا کے اظہار خیال کا ذریعہ بن گئی۔ ابو سعید ابو الخیر، خیام اور سرمد نے اس صنف سخن کو چار چاند لگا دیے اور اس کی شہرت بیرون ایران تک پہونچی۔ رباعی کے ایجاد کے سلسلے میں اگر چہ عام طور پر رودکی متوفی 329ھ کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن اب تک کوئی ایسی رباعی دستیاب نہیں ہو سکی جسے وثوق کے ساتھ رودکی سے منسوب کیا جا سکے۔ رودکی کے نام سے جو رباعیاں ملتی ہیں ان کی زبان ایسی صاف اور عربی آمیز ہے کہ لسانی نقطۂ نگاہ سے وہ عہد سامانی کی فارسی سے بالکل بے تعلق سمجھی جاتی ہے۔ فارسی کے قدیم ترین مستند تذکرہ لباب الالباب مؤلفہ عوفی میں رودکی کی رباعیوں کا ذکر نہیں ملتا بلکہ ابو شکور بلخی متوفی 336ھ کی ایک رباعی اس تذکرے میں ملتی ہے اور آج تک کی تاریخی شہادت کی بنا پر ابو شکور بلخی ہی کو پہلا رباعی گو شاعر سمجھنا چاہیے۔

لباب الالباب کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آل سامانی کے عہد میں یعنی رودکی متوفی 339ھ سے لے کر آل غزنوی کے عہد تک رباعی گوئی کا رواج عام نہ ہوا

تھا۔ صرف عنصری اور فرخی کے یہاں کچھ رباعیاں ملتی ہیں۔ یہ رباعیاں زیادہ تر 'مصرع' ہیں یعنی ان کے چاروں مصرعوں میں قافیہ لایا گیا ہے۔ سلجوقی عہد البتہ فارسی شاعری کے لیے عموماً اور صنفِ رباعی کے لیے خصوصاً بڑا مبارک ثابت ہوا اور اس میں سلطان ابو سعید ابن الخیر، عمر خیام، طوسی سمرقندی، نظامی گنجوئی، خاقانی، انوری، سنائی اور عبداللہ انصاری وغیرہ چند ایسے مشاہیر ادب سامنے آئے جنھوں نے فارسی ادب کو صحیح معنوں میں ادب بنا دیا۔ رباعی کے لیے یہ دور خاص طور پر ممتاز ہے۔ یوں تو اس عہد کے ہر شاعر کے یہاں رباعیوں کی اچھی خاصی تعداد مل جائے گی لیکن اس عہد کے نمائندہ رباعی نگاروں میں صرف سلطان ابوسعید ابوالخیر اور عمر خیام کا شمار کیا جاتا ہے۔ عبداللہ انصاری کا نام بھی اس عہد میں رباعی نگار کی حیثیت سے اہم ہے لیکن وہ اوّل الذکر دو بڑے رباعی نگاروں کے مقابلے میں شہرت نہ پا سکے۔ سرمد تاریخ ادبیات فارسی کا آخری زبردست رباعی نگار ہے جسے ابوسعید ابوالخیر اور عمر خیام کا ہمسر کہا جا سکتا ہے۔

اردو میں رباعی کی ابتدا بھی دوسرے اصنافِ سخن۔ قصیدہ، غزل اور مثنوی کی طرح ہی فارسی سے اردو میں ہوئی۔ اردو نظم کے تاریخی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اردو شاعری کے بالکل ابتدائی دور میں بھی رباعیات کہی جاتی تھیں۔ چنانچہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں متعدد رباعیاں موجود ہیں۔ چونکہ محمد قلی قطب شاہ سے پہلے کے کسی شاعر کی رباعیاں دستیاب نہیں ہوئیں اس لیے محمد قلی قطب شاہ کو ہی اردو رباعی کا پہلا شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ ذیل میں محمد قلی قطب شاہ کی ایک رباعی بطور نمونہ نقل کی گئی ہے۔

تجھ حسن سے تازہ ہے سدا حسن و جمال   تجھ یار کی بستی سے ہے عشق کوں جال
تو ایک ہے تجھ سا نہیں دوجا کوئی   کیوں پاوے جگت صفحہ میں کوئی تیری مثال

ابھی تک دکن کے جتنے بھی شاعروں کا کلام دستیاب ہوا ہے تقریباً سبھی شاعروں کے یہاں رباعی کے نمونے موجود ہیں۔ دکن کے مسلمان اردو شعرا چونکہ فارسی شاعری کے زیر اثر تھے۔ اس لیے ان کے کلام میں وہی مضامین و مباحث ملتے ہیں جو فارسی شاعری میں مروّج تھے۔ اس دور میں محمد قلی قطب شاہ، ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی رباعی نگار کی حیثیت سے خصوصیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی شعراء کے یہاں اکا دُکا رباعیاں ملتی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور رباعی بھی کچھ شامل ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی زندگی چونکہ عشق بازی اور عیاشانہ رنگ رلیوں میں گزری۔ اس لیے ان کی غزلوں کی طرح ان کی رباعیات میں بھی حسن و عشق کے معاملات کی رنگارنگی زیادہ ہے۔ یوں تو قطب شاہ نے روا جا کئی موضوع پر رباعیاں کہی ہیں اور اس طرح اس کے یہاں تصوّف، اخلاق، نعت، حمد اور دنیا کی بے ثباتی وغیرہ پر بھی رباعیاں ملتی ہیں لیکن ان کی وہی رباعیاں قابلِ توجہ ہیں جن میں انھوں نے حسن و عشق کے معاملات کو نظم کیا ہے اور جن میں اس کی زندگی کے صحیح خد و خال منعکس ہوئے ہیں۔

اردو رباعی شمالی ہند میں سب سے زیادہ پھلی پھولی اور مقبول ہوئی۔ یہ دور غزل و قصیدہ کی طرح رباعی کا بھی بہترین دور رہا۔ اس دور میں درد، سودا، میر حسن، میر تقی میر وغیرہ ایسے باکمال شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے دوسری اصناف سخن کے ساتھ اردو رباعی کو بھی منزل عروج پر پہنچا دیا۔ اس عہد میں رباعی کا جو خزانہ ملتا ہے وہ ذخیرہ کثیر تو نہیں لیکن جو کچھ ہے وہ اپنی معنوی خصوصیات اور دوسرے کئی وجوہ سے رباعی کی تاریخ میں خاص اہمیت کی چیز ہے۔ درد، سودا اور میر نے اگرچہ ضمنی طور پر رباعیاں کہی ہیں پھر بھی ان میں سے بعض کے یہاں ایسے شعری محاسن جمع ہو گئے ہیں کہ رباعی کی صنف ہر طرح قابلِ توجہ ہو گئی ہے۔

خواجہ درد رباعی نگار کی حیثیت سے اپنے معاصر میں ممتاز ہیں۔ تعداد میں ان کی رباعیاں اگرچہ تیس یا چالیس کے قریب ہیں لیکن تمام کی تمام منتخب ہیں۔ جس طرح ان کی غزل میں مشکل سے کوئی شعر بھرتی کا ملے گا بالکل اسی طرح ان کی رباعیاں بھی ہر قسم کے رطب ویابس سے پاک ہیں۔

محمد حسین آزاد 'آب حیات' میں درد کی غزل گوئی کے متعلق لکھتے ہیں:

''خواجہ میر درد کی غزل سات یا نو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے تھے۔''

یہی حال درد کی رباعیوں کا ہے جس طرح درد کا مختصر دیوان بہت سے شاعروں کے ضخیم دیوان پر بھاری ہے۔ بالکل اسی طرح ان کی رباعیاں اگرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن پورے مجموعے کا حکم رکھتی ہیں۔ چند رباعیاں دیکھیے۔

ہم نے بھی کبھی جام و سبو دیکھا تھا   جو کچھ کہ نہیں ہے روبرو دیکھا تھا
ان باتوں کو جو غور کر کے اے درد   کچھ خواب سا تھا کہ وہ کبھو دیکھا تھا

پیری چلی اور گئی جوانی اپنی   اے درد کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیان کرے گا اس کو   کہتے ہیں اب آپ ہم کہانی اپنی

ہر چند کہ میر کا بھی اصل میدان غزل ہے۔ لیکن ان کی بیشتر رباعیوں میں وہی مٹھاس، سوز و گداز، کسک، نرمی، شیرینی اور اثر خیزی موجود ہے جو ان کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ نکات الشعرا کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ میر نے اپنی غزلوں کا انتخاب اچھا نہیں کیا لیکن اپنی رباعیات فی الواقع منتخب درج کی ہیں۔ میر حسن نے اپنے 'تذکرہ شعرائے اردو' میں بھی میر کی کئی عمدہ رباعیاں نقل کی ہیں۔ چند رباعیاں درج ذیل ہیں۔

کاہے کوئی خراب و خواری ہوتا   کاہے کو کسو پہ جان بھاری ہوتا
دل خواہ ملاپ ہوتا تو ملتے   اے کاش کہ عشق اختیاری ہوتا

کیا میر تجھے جان ہوئی تھی بھاری   جو اس بتِ سنگدل سے کی تھی یاری
بیمار کیا بھلا کوئی ہووے اس کا   پرہیز کرے جس سے خدائی ساری

سودا ہمہ گو تھے ان کے کلیات میں بھی رباعیاں موجود ہیں لیکن اس میں ان کے قصیدے یا غزل کا زور نہیں آتا۔ چنانچہ شیخ چاند مرحوم سودا کی رباعیوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''سودا کے کلیات میں تقریباً (80) رباعیاں ملتی ہیں جن کے موضوعات مختلف ہیں۔ مدح، ہجو، مذہب، اخلاق، عشق و محبت، شاعرانہ فخر و تعلّی اور ذاتی حالات وغیرہ پر سودا نے رباعیاں لکھی ہیں اس لیے ان کی رباعی کا کوئی خاص رنگ نہیں۔ جس طرح اس کے موضوعات مختلف ہیں اس طرح اس کی زبان و بیان میں بھی فرق ہے۔ رباعی میں خیال کی پختگی کے ساتھ زبان بھی نہایت صاف ستھری اور اسلوب بیان بھی نہایت برجستہ اور شستہ و رفتہ ہونا چاہیے تاکہ مضمون فوراً ذہن نشین ہو جائے یا قلب پر اثر کرے۔ سودا کی رباعیوں میں یہ اوصاف موجود ہیں لیکن ان کا مقابلہ ہم میر انیس یا دوسرے رباعی گو اساتذہ کی رباعیوں سے نہیں کر سکتے۔''

(سودا: از شیخ چاند مرحوم، انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی 1936 (اشاعت اوّل) 1963 اشاعت ثانی، ص 241)

سودا کی رباعیوں میں ایک رباعی اپنے تاریخی پس منظر کی وجہ سے بہت مشہور ہے بلکہ ضرب المثال کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ وہ رباعی یہ ہے۔

سودا پئے دنیا تو بہ ہر سو کب تک   آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے   بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

میر حسن نے 'تذکرہ شعرائے اردو' میں اپنی دو رباعیاں نقل کی ہیں جن کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر حسن اگر رباعی کی طرف توجہ کرتے تو 'سحرالبیان' کی طرح رباعی میں بھی عشقیہ شاعری کا ایک ابدی نقش چھوڑ جاتے۔ ان کے تذکرے سے ایک رباعی نقل کی جاتی ہے۔

ہر آن میں آپ کو دکھا جاتے تھے   مشتاق کو تسکین دلا جاتے تھے
کیوں دیر لگی ہے کس نے روکا تم کو   اب تک تو کئی بار تم آجاتے تھے

درد، میر، سودا اور حسن کے علاوہ ان کے تلامذہ اور دوسرے غیر معروف ہمعصر شعراء کے یہاں بھی رباعیاں ملتی ہیں۔ خصوصاً راسخ، وحشت، عبدالحیٔ، تاباں، سوز، مظہر، بیان، عزیز بھکاری وغیرہ نے بہت اچھی رباعیاں کہی ہیں۔ تاباں اور بیان کی ایک-ایک رباعی درج ذیل ہے۔

مے خانہ میں کیا پھرے ہے مٹکی مٹکی   زاہد عابد سے دور چھٹکی چھٹکی
قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے کافر   یہ دخترِ رز بھی جس سے اٹکی اٹکی

(تاباں)

دنیا سے یہاں چلا میں روتے روتے   گذری اپنی شب عمر تو سوتے سوتے
ظلمات میں تھا آب بقا پر افسوس   روشن یہ ہوا صبح کے ہوتے ہوتے

(خواجہ احسن اللہ بیان)

اس دور کے دوسرے شعراء کی بعض اچھی رباعیاں درج ذیل ہیں:

اے مرگ ہزار گھر اُجاڑے تونے   اچھے اچھے لباس پھاڑے تونے
جو نخل کہ بارود ہوا دنیا میں   جڑ پیڑ سے بس اُس کو اکھاڑے تونے

(سوز)

ہیں تو سنا کریں کہانی کب تک   پردے میں دوئی کی زندگانی کب تک
برقعے سے عبودیت کے باہر تو نکل   تعلیم خدا سے بدگمانی کب تک

(تسلیم)

ہر چند گرفتار غم و درد ہے دل   لیکن کسی کی کوشش میں جواں مرد ہے دل
پھرتا ہے زمانہ میں ہر چار طرف   مخدوم جہاں ہاں جہاں گرد ہے دل

(اسیر)

اہل لکھنؤ کو تصوف کے مسائل سے کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا اور چونکہ رباعی میں اس وقت تک بیشتر مذہب وتصوف اور عشق حقیقی کے لوازم ہی نظم کیے جاتے تھے اس لیے لکھنوی فضا میں رباعی کے پھلنے پھولنے کے آثار پیدا نہ ہوسکے۔ چنانچہ انیس و دبیر سے پہلے لکھنؤ میں جو رباعیاں کہی گئی ہیں ان میں فکروفن کی وہ بلندی نظر نہیں آتی جو دہلوی شعراء کے یہاں ملتی ہیں۔ ہاں آگے چل کر انیس و دبیر نے رباعی میں وہ کمال دکھایا کہ رباعی کے باب میں اہل لکھنؤ کی دین دہلوی شعرا کی دین سے کم نہ رہی۔ چنانچہ انیس و دبیر سے پہلے کے لکھنوی شعرا کے دواوین میں رباعیات بہت کم نظر آتی ہیں۔

میر ببر علی انیس کی رباعی ملاحظہ فرمایئے۔

افسوس زمانے کا عجب طور ہوا   کیوں چرخ کہن! نیا یہ کیا دور ہوا
گردش کب تک، نکل چلو جلد انیس   اب یاں کی زمیں اور فلک اور ہوا

'رباعیات مرزا دبیر' میں ان کی (دبیر) 186 رباعیات درج کی گئی ہیں۔ جس میں سے ایک رباعی پیش ہے۔

کعبہ ہی فقط نہ مولد حیدر ہے   مسجد مقتل ہے عرش حق مظہر ہے
ہر دل میں ہے یاد اس کی اللہ اللہ   جو گھر ہے خدا کا وہ علی کا گھر ہے

اگر ہم رباعی کے اہم دور کی بات کریں تو جس طرح غالب وانیس کا عہد ساری اردو شاعری کے لیے بابرکت اور خوشگوار تھا۔ رباعی کے لیے بھی مبارک ثابت ہوا۔

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''دہلی میں غالب، ذوق، مومن، ظفر اور لکھنؤ میں انیس و دبیر جیسے باکمال شعرا نے جہاں غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیے کو بام عروج پر پہنچایا وہاں رباعی جیسی پس افتادہ صنف سخن کو بھی ترقی کی نئی راہ پر لگایا۔ چنانچہ دہلی اور لکھنؤ دونوں ادبی مرکزوں میں رباعی کو فروغ نصیب ہوا۔''

(اردو رباعی: فنی وتاریخی ارتقا: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، الطاف رحیم پرنٹرز لاہور، 1982، ص 81)

مرزا اسداللہ خاں غالب، شیخ ابراہیم ذوق اور مومن خاں مومن کی ذیل میں ایک-ایک رباعی دیکھیے:

دل سخت نژند ہوگیا ہے گویا   اس سے گلہ مند ہوگیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں   غالب منھ بند ہوگیا ہے گویا

(مرزا اسداللہ خاں غالب)

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا   ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ ہوا ہوا کرم سے تیرے   جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

(شیخ ابراہیم ذوق)

ہے طرفہ ستم آن کے پھر گھر جانا   حسرت زدہ پر بھی ہے گو مر جانا
پر مجھ کو سحر تک نہ جینے دے گا   تیرا یہ شب بخیر کہہ کر جانا

(مومن خاں مومن)

دہلوی شعرا میں مومن بہ حیثیت رباعی نگار اپنے تمام معاصرین میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ مومن کی رباعیاں تقریباً ڈیڑھ سو (150) کے قریب ہیں۔ سب کی سب دلکش اسلوب بیان اور رنگارنگ مضامین کی وجہ سے رباعی کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مومن جید عالم اور شاعر تھے۔ ان کو تمام اصناف سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ہر فرع سخن میں ان کی انفرادی شان نمایاں ہے۔

اردو رباعی کے اہم دور کے بعد اگر ہم دور جدید کی بات کریں تو انیس ودبیر کی رباعیوں کی بڑھتی ہوئی شہرت ومقبولیت نے دوسرے شعراء کو اس طرف متوجہ کیا۔ اردو رباعی مجلس عزا کے حلقہ سے نکل کر عام ادبی جلسوں اور مشاعروں میں جگہ پانے لگی۔ چنانچہ انیس و دبیر کے فوراً بعد حالی، اکبر، اسمٰعیل میرٹھی، پیارے صاحب رشید اور شاد جیسے ممتاز رباعی نگار پیدا ہوگئے۔ حالی کے ادبی، اخلاقی اور اصلاحی کارناموں کا جائزہ لینا ہو تو رباعی کا ذکر کیے بغیر یہ جائزہ مکمل نہ ہوگا۔ مسدس حالی جو سرسید احمد خاں اور مولانا حالی کی اصلاحی تحریک کا بڑا منشور ہے۔ اس کے دیباچہ کے شروع و آخر کی یہ دو رباعیاں پورے مسدس کے خلاصے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی   بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تونے ہم کو چھوڑا   ہم نے بھی تیری رام کہانی چھوڑی

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے   اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی مد ہے جزر کے بعد   دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

حالی کی طرح اکبر کی رباعی نگاری کا مقصد بھی اصلاحی ہے۔ ان کے موضوعات میں بھی چنداں فرق نہیں ہے۔ جو چیز ان دونوں کے یہاں مابہ الامتیاز ہے وہ صرف ان کا اپنا انفرادی انداز بیان ہے۔ حالی نے جس کام کو انتہائی سنجیدگی، متانت، خاموشی اور سادگی

سے انجام دیا۔ اکبر نے اسے طنز، ظرافت، قہقہہ اور شوخی کی مدد سے پورا کیا۔ بلکہ انداز بیان کی قدرت کے لحاظ سے اکبر کا مرتبہ حالی سے بلند ہے۔ اکبر نے اپنی خوش طبعی کی مدد سے رباعی میں ایک نئے اسلوب کو جنم دیا اور اس کے لہجے میں ایک ایسا شائستہ چلبلا پن پیدا کر دیا جو اردو رباعی میں اب تک نایاب تھا۔ اکبر کی چند رباعیاں درج ذیل ہیں۔

آگاہ ہوں معنیٔ خوش اقبالی سے   واقف ہوں بنائے رتبہ عالی سے
شرطیں عزّت کی اور ہیں اکبر   چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے   بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی   یورپ کا تیری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

دورِ جدید کے شاعروں میں سے ایک اسمٰعیل میرٹھی کی رباعیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کچھ یوں رقمطراز ہیں:

"اسمٰعیل میرٹھی بھی حالی و اکبر کے ہم نوا تھے۔ ادب کوئی راہ پر لگانے میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔ حق یہ ہے کہ اسمٰعیل میرٹھی نے اردو کے نئے قصر ادب کی تعمیر میں بنیادیں بھرنے کا کام کیا ہے۔ حالی نے عمارت کھڑی کی اور اکبر نے اس عمارت کو نقش و نگار سے دلکش و نظر گیر بنا دیا یا یوں کہہ لیں کہ حالی زیادہ تر نئی نسل کے لیے کام کر رہے تھے، اکبر بوڑھوں کو سہارا دے رہے تھے اور اسمٰعیل بچوں کے مربی و رہنما بنے ہوئے تھے۔ چونکہ رباعی کا وزن ہندوستانی و پاکستانی لحنوں سے ذرا مختلف ہے اور بچوں کے لب و لہجہ کے لیے زیادہ مترنم نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے بچوں کے لیے رباعیاں نہیں کہیں۔ ان کے کلیات میں چالیس بیالیس رباعیاں ہیں جن میں حالی و اکبر کا مصلحانہ انداز نمایاں ہے۔ زندگی کے عام مسائل اور قومی و ملکی ضرورتوں کو بڑی سادگی سے نظم کر جاتے ہیں لیکن ان رباعیوں میں نہ تو حالی و اکبر کے مضامین کا سا تنوع ہے اور نہ اسلوب میں دلکشی ہے صرف ایک رباعی بطور نمونہ دیکھیے۔

پانی میں ہے آگ لگانا دشوار   بہتے ہوئے دریا کو پھیر لانا دشوار
دشوار ہے مگر نہ اتنا دشوار   بگڑی ہوئی قوم کو بنانا دشوار

(ایضاً ص 98)

غالب کے محبوب شاگرد مہدی مجروح بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ 'دیوانِ مہدی مجروح' میں کل بتّیس (32) رباعیاں ہیں۔ جن میں اہلِ بیت کی مدح و ثنا اور واقعاتِ کربلا کا ذکر کیا گیا ہے۔ چند ایک رباعیاں عشقیہ ہیں اور دہلوی رنگ کی یادگار ہیں۔ مثلاً یہ رباعی۔

ان کو کبھی ادھر کو آنا ہی نہیں   قسمت میں ہماری چین پانا ہی نہیں
ہر ایک کی بود و باش کی مقرر ہے جا   پر یار کے ظلم کا ٹھکانہ ہی نہیں

اس دور کے رباعی نگاروں میں شاد عظیم آبادی کا نام بھی شامل ہے۔ جن کی ایک رباعی ذیل میں دی گئی ہے۔

آنکھیں نہ کھلیں وہ کم نگاہی نہ گئی   وہ کینہ کش و کینہ خواہی نہ گئی
پیری نے تو بالوں کو کیا آ کے سفید   افسوس مگر دل کی سیاہی نہ گئی

اسی دور سے تعلق رکھنے والے امیر مینائی اور پیارے صاحب رشید میاں البتہ ایسے دو شاعر ہیں جو لکھنوی دبستانِ شاعری سے تعلق رکھتے ہیں اور جن پر حالی و اکبر کی قومی و ادبی اصلاحی تحریک کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ امیر مینائی کے دیوان 'محامد خاتم النبیین' میں جو رباعیاں ہیں وہ نعتیہ ہیں۔ 'صنم خانۂ عشق' میں عشقیہ اور رثائیہ رباعی بھی ہیں۔ امیر مینائی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نعتیہ رباعیوں میں بھی اکثر جگہ ادبی شان و شاعرانہ لطافت قائم رکھی ہے۔ مثال کے طور پر یہ رباعی۔

اعجاز بھری آنکھوں کا جلوہ دیکھوں   یا ناز بھرا قامتِ زیبا دیکھوں
سرتا بقدم حسن میں یکتا ہے   حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

پیارے صاحب رشید میاں لکھنؤ کی ادبی دنیا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے اور زبان کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ بڑھاپے کے موضوع پر ان کی جو رباعیاں ملتی ہیں وہ خاص طور پر دلکش و مؤثر ہیں۔ ان کے اس مخصوص موضوع سے دو رباعیاں دیکھیے۔

ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا   کب میری طرح شباب دیکھا ہوگا
کہتا ہوں جو میں کہ تھی جوانی میری   پیری کہتی ہے خواب دیکھا ہوگا

نامی ہوئے بے نشاں ہونے کے لیے   افسانہ ہوئے بیاں ہونے کے لیے
کی موت کی خواہش کہ چلیں جنت میں   ہم پیر ہوئے جواں ہونے کے لیے

داغ کے یہاں غزل کے مقابلے رُباعیوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ تصویر کے موضوع پر کہی گئی کئی رباعیوں میں سے ایک یہاں نقل کی جاتی ہے۔

ہر عیب سے خالی ہے تمھاری تصویر   دنیا سے نرالی ہے تمھاری تصویر
کیوں شکل، مصور سے یہ پوری کھنچتی   دل کھینچنے والی ہے تمھاری تصویر

ان سب رباعی نگاروں کے علاوہ کچھ اور بھی رباعی نگار ہیں جنھوں نے رباعیاں تو کہیں لیکن اس سے انصاف نہیں کر سکے۔ مثلاً سرور جہاں آبادی، نظم طباطبائی، چکبست، شوق قدوائی اور عزیز لکھنوی وغیرہ کے یہاں بھی رباعیاں ملتی ہیں لیکن ان کی رباعیوں میں کوئی خصوصیت ایسی نہیں ہے جو قابلِ ذکر ہو۔ پھر بھی بطور نمونہ چند رباعی درج ذیل ہیں۔

اس بحر میں سیکڑوں ہی لنگر ٹوٹے   بن بن کے حباب کاسۂ سر ٹوٹے
گرداب فنا سے کوئی بچ کر نکلا   شل ہوکے یہاں دست شنا ور ٹوٹے

(سرور جہاں آبادی)

دل کی حرکت کو اضطراری سمجھو   یا طائرِ جان کی بے قراری سمجھو
ہے عمرِ بشر چند نفس کی معمار   جینے کو فقط نفس شماری سمجھو

(نظم طباطبائی)

بیکار تعلی سے ہے نفرت مجھ کو   لوں دادِ سخن نہیں یہ عادت مجھ کو
کس واسطے جستجو کروں شہرت کی   اک دن خود ڈھونڈ لے گی شہرت مجھ کو

(پنڈت برج نرائن چکبست)

آیا تھا قمر شب کو نظر پانی میں   غیرت سے تیری گرا مگر پانی میں
سورج نے نکالا ہے اسے دن نکلے   ڈوبا رہا ہے ورنہ رات بھر پانی میں

(شوق قدوائی)

خاکی ہے مگر خاک سے بالا تر ہے   تو عقل میں افلاس سے بالا تر ہے
تحقیق میں اس کی ہے عبث سرگرداں   وہ راز جو ادراک سے بالا تر ہے

(عزیز لکھنوی)

آباد ہے اصل میں نہ ویرانہ ہے   شادی کا یہ گھر ہے نہ عزا خانہ ہے
واللہ نہ مبتدا اس کی نہ خبر   دنیا اک نا تمام افسانہ ہے

(پنڈت برج نرائن چکبست)

■

Mo Amir Sheerazi
Research Scholar,Department of Urdu
Shibli National College
Azamgarh-276001 (UP)
Mob:9839379041
Email : amirrafeeq01@gmail.com

وسیم عقیل شاہ

مشرقی خاندیش کے موجودہ نثر نگار

اگر چہ اردو میں مشرقی خاندیش (ضلع جلگاؤں) کا ادبی مقام اوسط درجے کا مانا جاتا ہے لیکن یہاں کی ادبی سرگرمیاں شروع سے ادبی حلقوں کو ملک گیر پیمانے پر متاثر کرتی رہی ہیں۔ بات بھساول کے تاریخی مشاعروں کی ہو یا جلگاؤں، راویر، یاول اور مارول کی شعری و نثری نشستوں کی یا پھر یہاں سے جاری ہونے والے 'کہکشاں' اور 'ساحل' جیسے معیاری ادبی رسائل کی۔ غرض کہ خاندیش کے ادبا و شعرا نے ہر طور، ہر وسیلے اس علاقے کو ادبی سطح پر اعلی معیار کے ساتھ گامزن رکھا۔ ایک طرف سلطان نقشبندی، اطہر جلگانوی، مجاہد جلگانوی، قمر بھساولی اور ذاکر عثمانی جیسے شعرا نے شاعری کی زمین کو چمن زار کیا تو دوسری طرف تحقیق وتنقید اور صحافت کے حوالے سے ناظر انصاری، اکبر رحمانی، شمس اعجاز، تنویر عالم اور رصابر زاہد جیسے نثاروں نے علم وادب اور آگہی کے دفتر کھولے۔ اسی طرح فکشن کے حوالے سے پی من باسی، سریا بشیر، خورشید نکہت اور رفیق عادل کے علاوہ بھی مزید چند نام برجستہ طور پر ذہن میں آتے ہیں، جن کے فن پارے اچھے موضوعات، مختلف اسالیب، زبان کی ندرت اور معنی و مفہوم کی اثر آفرینی سے مزین ہیں۔ خاندیش کا یہی تخلیقی وتنقیدی اختصاص موجودہ قلمکاروں میں فطری طور پر پایا جاتا ہے۔ لیکن خاندیش نے کبھی خود کو نہیں دہرایا۔ یہاں کے قلمکار نے ہر عہد میں نئے امکانات اور نئے اسالیب کے ساتھ قلم کو جنبش دی۔ اس ضمن میں بطور خاص نثر نگاروں نے اپنی قلمی صلاحیتوں کا مظاہرہ انھی خوبیوں سے کیا ہے جن خوبیوں نے ماضی میں اس علاقے کو جہان ادب سے متعارف کرایا تھا۔

یہاں مشرقی خاندیش کے انھی موجودہ نثر نگاروں کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

اردو ادب میں شہر عزیز (جلگاؤں) کے قاضی مشتاق کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اگر چہ موصوف اب پونہ میں سکونت پذیر ہیں تاہم ان کا دل جلگاؤں ہی میں بستا ہے۔ آپ کا شمار اردو کے نمایاں ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، ترجمہ اور تنقید وغیرہ مختلف الاصناف ادب میں آپ کی تقریباً چالیس کتابیں منظر عام پر آ کر مقبول عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ تین سو سے زائد افسانے ہندوپاک کے ادبی رسائل وجرائد کی زینت بنے۔ انھوں نے اپنی بیباک کالم نگاری سے بھی قارئین کے دلوں پر راج کیا۔ نیز سفرنامے، شخصی مضامین، خاکے اور بچوں کے لیے تحریر شدہ فن پارے ان کے گراں قدر کارنامے ہیں۔ موصوف کی ادبی خدمات کو دنیائے ادب نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور سراہا ہے۔ ہندوستان بھر میں سرکاری اور غیر سرکاری ادبی، سماجی اور فلاحی تنظیموں نے انھیں مختلف باوقار انعامات واعزازات سے نوازا۔ آج بھی ان کا قلم پوری آب وتاب سے قرطاس ادب پر جلوے بکھیر رہا ہے۔ ان کی مشہور کتابوں میں 'صحبت کی خوشبو'، 'درد کی زبان'، 'ایک دل ارمان بھرا' اور 'جس نے یوروپ نہیں دیکھا'، خاص اہمیت کی حامل ہے۔

جلگاؤں ہی سے فاروق اعظمی کا نام علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ سرزمین علم و ادب اعظم گڑھ سے تعلق ہونے کی بنا پر علمی وادبی ورثہ لے کر جلگاؤں وارد ہوئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنیاد پر اہل جلگاؤں کو علمی وادبی طور پر سرفراز کیا۔ انھوں نے دینی وعصری علوم اور ادب کے جس باب کو موضوع قلم بنایا اسے اپنی فکر اور دانشمندی سے جاودانی بخشی، جو آئندہ آنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا اور یقیناً آج بھی ان کی قلمی کاوشوں سے بے شمار تشنگان علم وادب سیراب ہو رہے ہیں۔ 'نقوش حرم (سفرنامہ حج)' اور سوانح پر مبنی 'یادوں کے چراغ' جیسی تصانیف لکھ کر علمی وادبی دنیا میں تہلکہ مچایا۔ موصوف گزشتہ پچاس برسوں سے فعال ہیں اور عمر کے آخری پڑاؤ پر ہونے کے باوجود آج بھی ان کا قلم دینی، علمی اور ادبی اعتبار سے مسلسل جاری ہے۔ حالیہ ان کی کتاب 'مسلمانوں کے تعلیمی مسائل' کو مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکیڈمی نے ایوارڈ سے نوازا ہے۔

دیار غیر میں رہنے کے باوجود جلگاؤں کا نام روشن کرنے والوں میں محسن جلگانوی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ موصوف عرصہ سے حیدرآباد میں مقیم ہیں اور وہیں سے اردو زبان و ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کرنے کے باوجود آپ نثری میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جادو جگاتے رہے۔ یہ انھی کا خاصہ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے نظم اور نثر دونوں میں انصاف کیا ہے۔ شاعری کی طرح نثر میں بھی ان کا قلم خاصا رواں اور اثر انگیز ہے۔ ادب میں ان کا نثری اثاثہ معیاری ادب کے خانے میں رکھا جاتا ہے، خاص طور سے نظمیہ شاعری پر ان کا تحقیقی مقالہ اردو ادب میں ایک نئے باب کو وا کرتا ہے۔

بھساول سے احمد کلیم فیض پوری کا نام افسانے کے حوالے سے بے حد اہم ہے بلکہ آپ کی شناخت اردو ادب میں خاندیش کے افسانے کے چہرے سے ہے۔ احمد کلیم فیض پوری کا شمار اردو کے ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے پچاس سالہ قلمی سفر میں اردو ادب کو صرف ایک ہی افسانوی مجموعہ دیا۔ ہر چند کہ ان کا تخلیقی عمل ادب کی دوسری اصناف میں بھی جاری ہے لیکن افسانے کے حوالے سے ان کی پہچان زیادہ مستحکم ہے۔ آپ نے جس صنف میں طبع آزمائی کی وہاں اپنی

صلاحیتوں کا سکہ جمایا خواہ طنز ومزاح ہو یا منی کہانیاں یا پھر نثری نظمیں، غرض کہ ہر طور انھوں نے خاندیش کی ادبی روایتوں کی پاسداری کی۔ احمد کلیم فیض پوری کا افسانوی مجموعہ 'ساگوان کی چھاؤں میں' سنہ 2012 میں شائع ہو کر خوب داد وتحسین حاصل کر چکا ہے۔

ایف۔ایم۔ پرویز پونہ میں مقیم ہیں اور سردست خاندیش کے سب سے سینئر افسانہ نگار ہیں۔وہ علاقے کے ایسے واحد قلم کار بھی ہیں جن کے تمام تر افسانوی فن پارے شہرۂ آفاق رسالہ 'بیسویں صدی' میں شائع ہوئے۔ پرویز صاحب کے طرز واسلوب میں رومانیت کی فضا قائم ہے تاہم ایک قسم کی فکر بھی متن کی زیریں لہروں میں چلتی ہے اور قاری پر غیر محسوس طریقے سے اپنا کامیاب تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ان کا افسانوی مجموعہ 'ڈوبتی شام' اسباق پبلکیشن پونہ نے شائع کیا تھا اور اسی برس بہار اردو اکیڈمی کے انعام کا حق دار بنا۔

رشید قاسمی خاندیش کے سنجیدہ قلمکار ہیں اور اردو ادب میں معیاری افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ومقبول ہیں۔ شستہ ودلکش زبان سے سجا ان کا معنویت سے پر اور تہہ دار افسانوی اثاثہ نہ صرف جلگاؤں اور پورے خاندیش کے لیے باعث افتخار ہے بلکہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ بھی ہے۔ اگرچہ انھوں نے کم کم ہی لکھا لیکن کم لکھ کر بھی اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ آج خاندیش کا ادب ان کی تحریروں سے مالا مال تصور کیا جاتا ہے۔ 'کمپیوٹر مین' اور 'بلڈوزر' خاندیش کی جانب سے جدید طرز کی اولین کہانیاں ہیں جسے آپ ہی نے خلق کی تھیں۔ اسی لیے انھیں خاندیش کے جدید طرز کے اولین افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آج بھی ان کا قلم بلا کسی صلے وستائش کے قرطاس ادب پر جادو بکھیر رہا ہے۔ انھوں نے مقالات ومضامین رقم کرتے ہوئے بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا نیز اردو سے مراٹھی اور مراٹھی سے اردو ترجمہ نگاری پر بھی ان کی گرفت مضبوط رہی ہے۔ قاضی مشتاق کا مشہور اردو ناول 'فٹ پاتھ کی رانی' کا مراٹھی ترجمہ کرنے کے ساتھ ہی انھوں نے درجنوں صحافتی مضامین کا اردو سے مراٹھی اور مراٹھی سے اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ موصوف کو مہاراشٹر ساہتیہ اکادمی نے سنہ 2012 کا صحافتی ایوارڈ تفویض کیا تھا۔

بھساول سے تعلق رکھنے والے بزرگ ادیب رشید عباس کا طنز ومزاح میں خاندیش کی سطح پر کوئی ثانی نہیں ہے۔ موصوف بہت کم لکھتے ہیں مگر جو بھی لکھتے ہیں وہ دنیائے ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے تخلیقی اظہاریے میں کاٹ دار لہجے کے ساتھ معاشرے کی کج روی پر طنز کے ساتھ گدگدانے کا سامان بھی بڑے پیمانے پر برآمد ہوا ہے۔ قیوم راز مارولوی یاول تحصیل کے ادبی دیہات مارول سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کا شمار خاندیش کے استاد شعرا میں سرفہرست ہے۔ شاعری سے غیر معمولی واقفیت کے ساتھ ہی مبادیات نثر اور اس کی سلیقہ مندی کے بھی علیم ہیں۔ ان کے تبصرے، تاثرات اور تقریظ کے نمونے ہندوستان بھر کے شعرا کے مجموعوں پر بطور سند ثبت ہیں۔ آپ کی تنقیدی بصیرت موجودہ شاعری کے حوالے سے اہم مانی جاتی ہے۔

اردو میں خاندیش کی ادبی ترجمانی کرنے والوں میں جلگاؤں کے معین الدین عثمانی کو خاص مقام حاصل ہے۔ ہر مہینے دو مہینے میں ملک و بیرون کے متعدد ادبی رسالوں اور مجلوں میں معین الدین عثمانی کے مضامین یا تخلیقات پڑھ کر یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ فی العصر ادبی حوالے سے آپ خطہ خاندیش کی عمدہ نمائندگی کر رہے ہیں۔ موصوف بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، ترجمہ سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ ادھر دو تین برسوں میں ان کے قلم سے درجن بھر سے زائد تبصرے، تجزیے اور شخصی وتنقیدی مضامین برآمد ہوئے ہیں۔ 'نجات'، 'متحرک منظر کی فریم' وغیرہ آپ کی اہم تصانیف مانی جاتی ہیں۔ معین الدین عثمانی کا شمار خاندیش کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھیں مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی نے اعزاز سے نوازا ہے۔ صغیر احمد سر جلگاؤں سے ہیں اور خاندیش کے صاحب علم اور خوب سلجھے ہوئے قلمکار ہیں۔ موصوف کی فکر اور حساسیت صنف افسانہ کے توسط سے ادبی حلقوں میں گزشتہ تین دہوں سے آشکار ہوتی رہی ہے۔ ان کے حیطہ اظہار میں اصلاحی وسماجی موضوعات بے حد اہم ہیں تو نفسیاتی سطح پر انھوں نے اپنی افسانوی دنیا کو طرح طرح کے رنگوں سے سجایا ہے۔ صغیر سر نے کم لکھا ہے لیکن بروقت اور برمحل لکھا ہے۔

شاہد لطیف کا تعلق مشاعروں کی سرزمین بھساول سے ہے لیکن ان کی زندگی کے ادبی شب وروز ممبئی میں گزر رہے ہیں۔ ادب میں ان کی شناخت ایک معیاری شاعر کی ہے جبکہ اردو صحافت میں شاہد لطیف کی شخصیت سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ مشہور روزنامہ اخبار 'انقلاب' کے مدیر اعلی ہیں۔ انقلاب میں روزانہ شائع ہو رہے آپ کے اداریوں کو بلا مبالغہ اخبار کی روح کہا جا سکتا ہے۔ اردو ادب پڑھنے لکھنے والوں میں مشہور علمی، سماجی و سیاسی شخصیت ڈاکٹر عبدالکریم سالار کا نام نیا نہیں ہے البتہ ان کی گرانقدر تالیف 'خاندیش کے بے لوث سپاہی' ان دنوں ان کی ادبی شہرت کا سبب ہے۔ تاہم انھوں نے بھی نثری میدان میں اپنے قلمی جوہر دکھائے ہیں، ان کے تحریر کردہ تعلیمی مضامین اخبارات میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ متذکرہ تالیف جو مرحوم اکبر رحمانی کی 'خاندیش کی ادبی تاریخ' کے بعد کئی حوالوں سے سب سے زیادہ اہم اور مستند گردانی جا رہی ہے۔

میر ساجد علی قادری، جلگاؤں سے ایک کہنہ مشق قلمکار ہیں وہ فی الوقت ممبئی میں سکونت پذیر ہیں۔ سوانحی کتاب 'متاع سفر' ان کی اہم تصنیف ہے۔ اسی طرح عزیز رحیمی بھی عرصہ دراز سے ممبئی میں مقیم ہیں۔ ان کا شمار خاندیش کے ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جن کے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'رات کا آخری پہر' عزیز رحیمی کا افسانوی مجموعہ ہے جو سنہ 2015 میں شائع ہوا تھا۔ اسی طرح جلگاؤں سے قیوم اثر میدان علم وادب کے بے لوث قلمکار ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے تو کیا تھا لیکن جلد ہی اپنے قلم کو موڑ کر افسانہ نگاری کے حوالے کر دیا اور اپنے تخیل اور فنی چابکدستی سے خاندیش کے لازوال تخلیق پاروں میں قابل قدر اضافہ کیا۔ افسانچہ نگاری میں ان کی کاوشیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

عبدالروف شیخ یاول سے علمی وادبی سطح پر سرگرم رہنے والوں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنی واحد کتاب 'اجالے اپنی یادوں کے' لکھ کر نثر لکھنے والوں میں اپنا مقام محفوظ کر لیا ہے۔ یاول سے ایک اور اہم نام ایم رفیق کا ہے جو علاقہ خاندیش کے خاص قلمکاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے قلمی اظہار میں نثری اصناف خاص طور سے شامل ہیں۔ ان کی کئی تصنیفات اور تالیفات شائع ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ افسانے کے حوالے سے ان کی ہر طرح کی کاوشیں قابل قدر ہیں، خاص کر موصوف کی تازہ تالیف 'خاندیش کے افسانہ نگار' دستاویزی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی مزید مشہور کتابیں 'تذکرہ شعرائے خاندیش' اور 'ذہنی آزمائش' بھی اہم اور علمی و ادبی ضرورتوں کے عین مطابق ہیں۔ راغب بیاولی خاندیش کے بلکہ مہاراشٹر کے نمائندہ شاعر ہیں۔ شاعری کی طرح ان کے قلم سے نثر پارے بھی پوری ستھرائی سے ظاہر ہوئے ہیں۔ انھوں نے کم وبیش پچاس افسانچے لکھ کر خود کو کہانی کاروں کی صف میں شمار کروایا ہے۔ اسی طرح رفیق احمد نے حکایات شیخ سعدی کے ذریعے نثری ادب میں اپنے آپ کو منوالیا ہے۔ مالیگاؤں کے جاوید انصاری فی الوقت جلگاؤں آکاشوانی میں اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے ہیں۔ شاعری کی طرح نثری ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں اور تحریری طور پر فعال رہتے ہیں۔ انھوں

نے درجنوں علمی وادبی مضامین لکھے۔ خاص طور سے شگفتہ تحریروں سے سجے ان کے شخصی وتنقیدی مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

فیض پور سے سلیم خان خاندیش کے جانے مانے افسانہ نگار ہیں۔ موصوف اپنے تخیل کے سلجھے ہوئے خطوط قرطاس پر اتارنے کا فن احسن طریقے سے جانتے ہیں، وہ عرصے سے اس صنف میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ بچوں کے ادب پر ان کی تحریریں لازوال ہیں۔ 'نیم چندن اور کوئل' بچوں کی کہانیوں کا مقبول عام مجموعہ ہے تو ان کا اولین افسانوی مجموعہ 'لہولہو منظر' بھی منظر عام پر آچکا ہے اور فی الحال اردو حلقے میں خوب خوب بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ ان کے ساتھ ہی راویر سے سید شیر افگن، عبدالقدیر عشرت، نصرت راویری تو یاول سے شکیل احمد، خلیق بسم اللہ وغیرہ قلمکار بھی میانہ روی سے لکھ رہے ہیں البتہ کسی زمانے میں ان کی قلمی طبیعت میں تیزی وشور انگیزی رہی ہے۔ بہرکیف جو بھی تحریریں ان صاحبان کی منظر عام پر آئیں وہ قابل قدر ہیں۔ شکیل سعید کی کتاب 'ادھوری نظم' کا ذکر یہاں ضروری ہے جس کے بعد اس قبیل کے قلمکاروں سے مزید امکانات روشن ہوتے ہیں۔ شکیل انجم نے بھی اردو نثر میں اپنی بساط بھر طبع آزمائی کی۔ اس کے علاوہ سید لیاقت، صالحہ قادری، صبیحہ قادری، شیخ غفار، لیلی خالد، عارف شیخ، ساحر فاروقی بھی قلمی طور پر اپنے آپ کو پیش کر چکے ہیں نیز اب بھی نثری حوالوں سے سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔

خاندیش کے ادبی خطے یاول سے رحیم رضا کا نام خاندیش کے صاف گو قلمکاروں میں لیا جاتا ہے۔ رحیم رضا گزشتہ تین دہوں سے اردو ادب میں پوری کامیابی سے طبع آزمائی کرتے آ رہے ہیں۔ افسانوی رنگ ان کے قلم کی ندرت ہے، بچوں کے ادب پر بھی ان کی نظر گہری اور گرفت مضبوط ہے۔ ان کے نثری تخلیقی مجموعوں کی مجموعی تعداد پانچ ہے جن میں افسانوی مجموعہ 'رنجش ہی سہی' نے ان کو استحکام بخشا۔ ان کی ایک اہم تالیف جو حالیہ منظر عام پر آئی 'افسانے کی تلاش میں' ہے جسے حلقہ ادب میں خوب خوب سراہا جا رہا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی کہانیوں کی کتاب 'سواری بادل کی' پر انھیں مہاراشٹر ساہتیہ اکیڈمی نے انعام سے سرفراز کیا ہے۔ مشتاق کریمی صحافی کی حیثیت سے پورے مہاراشٹر میں شہرت رکھتے ہیں، وہ ایک طرح سے جلگاؤں کی صحافتی نمائندگی کر رہے ہیں۔ مگر انھوں نے مختصر افسانہ نگاری کا دامن بھی ہاتھوں سے چھوٹنے نہیں دیا۔ وہ خاص طور سے منی افسانے تواتر لکھ رہے ہیں۔ موصوف نے بچوں کے ادب میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ 'اپنی مٹی' بچوں کے لیے لکھی گئیں ان کی کہانیوں کا مجموعہ ہے جس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کو مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکیڈمی نے انعام تفویض کیا۔ 'بتائیے نہ بنے' مشتاق کریمی کے صحافتی واصلاحی مضامین کا مجموعہ بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ سید ذاکر حسین ایرنڈول سے اپنا قلمی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ افسانوی طرز ان کے خانوادے کا اختصاص ہے اس لیے صنف افسانہ میں تندی سے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ وہ تقریباً پینتیس برسوں سے سرگرم ہیں اور تواتر سے معروف ادبی رسائل میں شائع ہو رہے ہیں۔ 'راستے بند ہیں' ان کا فسانوی مجموعہ سنہ 2013 میں شائع ہوا تھا جسے ادبی گلیاروں میں خاصا سراہا گیا۔ جلگاؤں سے مزید ایک نام وحید امام سرکا ہے۔ وحید امام سرگزشتہ تیں پینتیس برسوں سے ادب میں سرگرم ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے خوب لکھا مگر بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں پر مشتمل کتاب 'لخت لخت زندگی' کے عنوان سے شائع ہوئی اور داد وتحسین کی مستحق قرار پائی۔ اسی طرح بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی کہانیوں کی کتاب 'معصوم احتجاج' نے بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔

اسی طرح سے مزید کچھ نام جو اردو ادب وصحافت میں نثر نگار کی حیثیت سے فعال ہیں، ان میں جلگاؤں سے آفاق انجم نے مقالہ نگاری پر توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔ گاہے گاہے ان کے مضامین مختلف سیمناروں اور رسالوں میں سننے پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ شفیق ناظم شاعری کے حوالے سے شہر جلگاؤں اور خاندیش کا نمائندہ نام ہے اور افسانہ نگاری میں بھی ان کی شناخت بہت پہلے ہی قائم ہو چکی ہے، آپ نے کئی سارے یادگار افسانے خلق کیے۔ شاہ ایاز کا تعلق بنیادی طور پر انشائیہ نگاری سے ہے، انھوں نے اچھے انشائیوں کے علاوہ اچھی کہانیاں بھی لکھیں۔ صحافت کے میدان میں جلگاؤں سے انجم رضوی کا بے باک قلم اپنی مثال آپ ہے۔ موصوف اپنی قلمی ابتدا ہی سے سماجی مسائل کے ساتھ علمی موضوعات پر بھی قلم طراز رہے نیز افسانہ نگاری میں بھی اپنے کاٹ دار قلم کے جوہر دکھائے۔ سعید پٹیل بھی جلگاؤں سے متعلق ہیں اور سینئر صحافیوں کی فہرست میں شمار کیے جاتے ہیں۔ سنجیدہ ادب کے اچھے قاری ہونے کے ساتھ ہی موصوف اچھے قلمکار بھی ہیں۔ انھوں نے افسانہ نگاری اور بطور خاص افسانچہ نگاری میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ عقیل خان بیاولی ایک عرصے سے صحافتی خدمات انجام دے رہے ہیں، اسی طرح ادبی حوالوں سے بھی ان کے قلم میں کسی طرح جنبش رہی ہے۔ انھیں بھی شہر جلگاؤں کے سینئر لکھنے والوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ سہیل رحمانی نثری ادب میں اپنی لازوال وراثت کے امین ہیں لیکن انھوں نے بہت کم لکھا ہے تاہم جو لکھا ہے اچھا ہی لکھا ہے۔ عارف خان تدریسی میدان کے سرکردہ سپاہی ہیں، مختلف درسی مضامین کے علاوہ اصلاحی، مذہبی اور سماجی موضوعات پر ان کی تقریباً 30 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ 'قرآن اور سائنس'، 'مسلم سائنسدانوں کے کارنامے'، 'ایسا کیوں ہوتا ہے؟' جلگاؤں سے عارف خان کی مشہور کتابیں ہیں۔ شیخ احمد حسین جلگاؤں کے ماہر اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ انگریزی کے استاد ہیں لیکن اردو نثر نگاری میں انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ سید احمد حسین نے درجنوں مذہبی، اصلاحی اور تعلیمی مضامین لکھے۔ 'دعوت' جیسے صحافتی ترجمان میں شائع ہونے کا شرف انھیں بھی حاصل ہے۔ بھساول سے ایک نام حاجی انصار کا بھی ہے وہ رسالہ تزئین ادب کے اعزازی مدیر ہیں اور ان کا بھی قلمی سفر کسی طور جاری ہے۔ نوجوانوں کی جانب سے سجاد حیدر عمدہ نمائندگی کر رہے ہیں۔ وہ اپنی خاص تنقیدی بصیرت اور شگفتہ تحریروں کے لیے جانے جاتے ہیں اور معیاری رسائل میں مسلسل چھپ کر وطن عزیز جلگاؤں کا نام روشن کر رہے ہیں۔ ارتکاز صابر نے مغل شہنشاہ شاہجہاں کو موضوع بنا کر ایک دلچسپ کتاب ترتیب دے کر اپنے ادبی ورثے کی پاسداری کی لیکن خاندیش کو ان سے مزید توقعات ہیں۔

اس کے علاوہ مشرقی خاندیش کے موجودہ نثر نگاروں میں زبیر علی تابش، سرفراز خان، ڈاکٹر انیس خان، زیان شیخ، شرجیل، صدام اشرف، ایم صدام، عروج فاروقی، ساجد مرزا، اسید گلاب، شاہ سروش اور راقم الحروف کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں۔ جو کسی طور نثری اصناف میں مشق کر رہے ہیں اور چند ایک گاہے گاہے اردو رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ کچھ مہینوں سے زیان شیخ کی تحریک پر قلمدان فاؤنڈیشن کے ممبران نے ماہانہ نثری محفلیں سجانا شروع کی ہیں، جن میں ہر ماہ مشترکہ طور پر طے شدہ عنوان کے تحت قلمی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ان نثری محفلوں میں حصہ لینے والے نئے قلم کاروں کی تعداد دس کے قریب ہے۔

■

Wasim Aqueel Shah
15 Shahkar, Salar Nagar
Jalgaon - 425001 (MS)

نورالہدیٰ

آئنسٹائن

ایک انسان، ایک سائنس داں

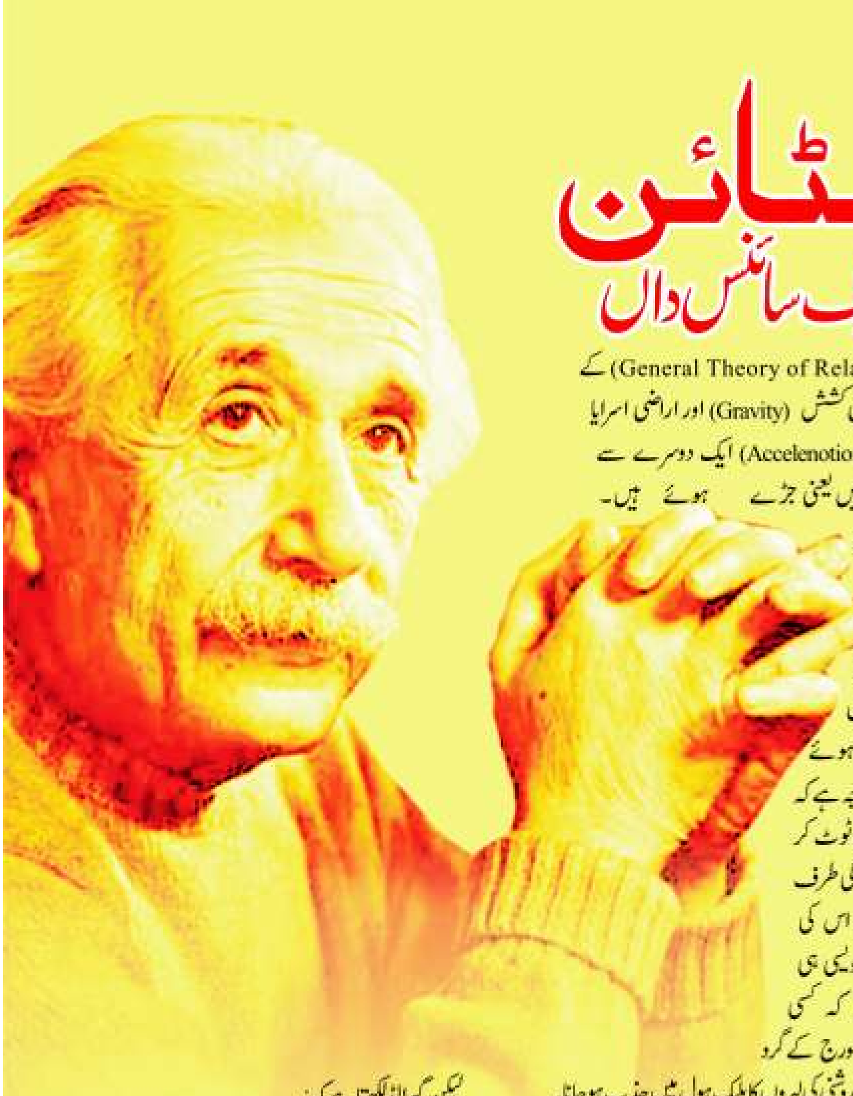

آئنسٹائن کو لوگ ایک مافوق الفطرت جینئس تصور کرتے ہیں جو زمان و مکان کی گتھیوں کو سلجھانے میں الجھا رہا۔ اس کے باوجود وہ ایک دردمند انسان تھا اور نسل آدم کا اقتدار و احترام چاہتا تھا۔ امن و سلامتی اس کا مسلک حیات رہا۔ یہ ستم ظریفی تھی یا وقت کا المیہ کہ ایٹم بم کی تیاری میں اس کا اہم کردار رہا۔

ابتدا میں اس کے سائنسی کارناموں کا جزوی تذکرہ پیش کیا جاتا ہے اس کے بعد اس کی نجی زندگی اور فلاحی کاموں کا جائزہ لیا جائے گا۔

آئنسٹائن نے تقریباً 300 سائنٹفک پیپرس شائع کیے لیکن ان میں چار ایسے ہیں جس نے سائنس کی دنیا میں بڑا انقلاب برپا کیا۔ 1905 میں تین پیپرس اور 1916 میں ایک۔ ان کا ماحصل یا لب لباب کچھ اس طرح ہے:

* ''روشنی دراصل ذرات کا بہاؤ یا روانی ہے۔ یہ ذرات فوٹون (Photons) کہلاتے ہیں اس کی رفتار مشاہدہ کرنے والوں کی ذاتی رفتار سے متاثر نہیں ہوتی۔

* کمیت (Mass) اور توانائی (Energy) باہم متبادل ہیں، یعنی کمیت توانائی میں اور توانائی کمیت میں تبدیل ہوسکتی ہے جیسا کہ حسب ذیل مساوات سے ظاہر ہے:

$$E = \frac{mc^2}{\sqrt{1 - \frac{g^2}{c^2}}}$$

(یا صرف E=mce)

اس مساوات میں E= توانائی، C= روشنی کی رفتار، m= کمیات اور g= ثقل ارضی کی سرعت۔

یہ ماورائی مساوات 1905 میں پیش کی گئی جسے اسپیشل تھیوری آف ریلیٹی ویٹی کہتے ہیں۔

* چہارالابعادی (Four Dimension) چوتھے میں زمان و مکان ایک دوسرے میں پیوست ہیں جب کوئی اکیلا شخص زمان و مکان کا محاسبہ کرتا ہے تو طبعیات کے قوانین اس کے لیے نہیں بدلتے، لیکن دو مشاہدین اگر روشنی کی رفتار سے ایک دوسرے کی مخالف سمت میں سفر کریں تو ایک شخص کا مشاہدہ یہ ہوگا کہ وقت کی رفتار دھیمی پڑگئی ہے اور دوسرا یہ محسوس کرے گا کہ رفتار بڑھ گئی ہے۔ یہ 1905 کی تھیوری آف ریلیٹی ویٹی کا ماحصل ہی ہے۔

1916 کی جنرل تھیوری آف ریلیٹی ویٹی (General Theory of Relativity) کے مطابق ارضی کشش (Gravity) اور اراضی اسرایا سرعت (Accelenotion) ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں یعنی جڑے ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر زماں و مکاں ایک گرہ (Knot) میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ درخت سے ٹوٹ کر سیب زمین کی طرف گرتا ہے۔ اس کی مثال ٹھیک ویسی ہی ہے جیسا کہ کسی سیارے کا سورج کے گرد گردش کرنا یا روشنی کی لہروں کا بلیک ہول میں جذب ہوجانا۔

آئنسٹائن کے یہ مفروضات بعید از فہم تھے۔ تجرباتی شہادتوں کا فقدان تھا۔ لوگ اسے خردماغ خیال کرتے تھے لیکن 1919 میں سورج گرہن کے دوران سائنس دانوں نے مشاہدہ کیا کہ دور افتادہ ستاروں سے آنے والی روشنی کی لہریں سورج کی طاقتور کشش سے مڑجاتی ہیں۔ اس دریافت سے آئنسٹائن کی جنرل تھیوری کے بنیادی نکتے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس انکشاف سے آئنسٹائن کی شہرت عالمگیر طور پر پھیل گئی۔ اس کی تھیوری کی شہادت میں اگلے برسوں میں متعدد مشاہدات سامنے آئے۔ 1971 میں سائنس دانوں نے اس امر کی تصدیق کی کہ وقت کوئی جامد شے نہیں ہے بلکہ یہ پھیلتا اور سکڑتا ہے (Time delution)۔

آئنسٹائن کے سائنسی کارناموں کی طرح اس کی زندگی کے ادوار بھی عجیب و غریب تھے۔ اس نے اپنے سوانح نگار گیرالڈ ہالٹن (Gerad Holton) کو بتایا:

''مجھ میں کوئی غیر معمولی ہنر نہیں ہے۔ میں بھی ایک عام انسان کی طرح ہوں لیکن ایک عوامی کی طرح بھی کائنات کے رموز کو جاننا چاہتا ہوں۔ مجھ میں حد سے زیادہ جذبہ تحقیق و تلاش ہے اور بس۔''

لیکن گیرالڈ لکھتا ہے کہ:

''آئنسٹائن کی غیر معمولی ذہانت پر بڑی حیرت ہوئی۔ سائنس میں ایجاد و انکشاف کا روایتی طریقہ یہ ہے کہ لوگ ابتداً کسی مظہر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس کو بنیاد بنا کر کوئی مفروضہ وضع کرتے ہیں اور اس مفروضے کی تصدیق سائنسی تجربات سے ہوتی ہے تو قانون بنتا ہے لیکن آئنسٹائن کا کمال یہ ہے کہ اس کے قوانین ماورائی تصورات کے مرہون منت ہیں۔''

آئنسٹائن کی ہمشیرہ محترمہ ماجا (Maga) اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتی ہیں کہ:

''اس کی (آئنسٹائن کی) جسمانی نشو و نما بہت آہستہ ہوئی۔ ڈھائی سال کی عمر ہوئی تو کچھ کچھ بولنے لگا۔ بچپن میں کوئی ایسے آثار نہیں ملتے جس سے یہ اندازہ ہو کہ آگے چل کر ایک عظیم سائنس داں بنے گا۔ البتہ تاش کے پتوں سے اسے عمارت بنانے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تو میری ماں یہ دیکھ کر بہت گھبرائی کہ اس کے سر کا پچھلا حصہ بہت بڑا تھا اور اس کی شکل مخروطی تھی۔''

آئنسٹائن کی غیر معمولی ذہانت کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر اس نے اپنی ماں سے

''دودھ کی شکایت کی کہ یہ بہت گرم ہے۔''

ماں نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا ''قبل تم نے کیوں نہیں بتایا۔''

''پہلے سب کچھ ٹھیک تھا'' اس نے جواب دیا۔

بہرحال اس طرح کی ماورائے عقل داستانوں سے قطع نظر اگر یہ دریافت کیا جائے کہ آئنسٹائن کیا واقعی غیر معمولی ذہانت کا مالک تھا تو اس کا جواب اثبات میں ہوگا۔ شروع میں جب کہ وہ ایک فرم میں پیٹنٹ کلرک (Patent Clerk) تھا اس نے اہم سائنسی دستاویزات شائع کیں۔ اس کی اکیڈمک تعلیم مکمل نہیں کی تھی اس لیے اسے کسی تعلیمی شعبے میں نوکری نہیں مل سکی۔ اس کے پروفیسر اس کی تلون مزاجی سے نالاں رہتے تھے۔ اس نے سوئزرلینڈ کے ''فیڈرل پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ'' میں بھی داخلہ لیا تھا جو پورے یورپ میں سائنس کی مشہور ترین یونیورسٹی تھی۔ اس کی پہلی منکوحہ (بیوی) میلی وامیرک (Meliva Meric) اس کی کلاس فیلو تھی اور علم طبعیات کی ماہر تھی۔ دونوں کا معاشقہ یونیورسٹی کے زمانے میں شروع ہوا۔ ہیلن ڈوکاس (Helen Dukas) جو برسوں آئنسٹائن کی پرسنل سکریٹری رہی اس کی وفات کے بعد دونوں کے خطوط 'The Love Letters' کے عنوان سے شائع کیا۔ ان عاشقانہ خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آئنسٹائن کے والدین کو میلی وامیرک کے بارے میں شکوک وشبہات تھے۔ اس کے باوجود دونوں کی شادی 1903 میں ہوئی۔ لیکن بہت دنوں تک نباہ نہیں ہوسکا۔ میرک سائبیریا چلی گئی۔ وہاں اس نے ایک ناجائز بچے کو جنم دیا۔

آئنسٹائن کے بعض سوانح نگار اسے 'زن بیزار' (Misogynest) خیال کرتے تھے۔ اس کے کچھ معترض اس شک کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ اسپیشل تھیوری آف ریلیٹی ویٹی دراصل اور آئنسٹائن نے میلیوا چرالیا ہے۔ یہ بدگمانی غالباً اس خط سے ہوئی جس میں لکھا تھا کہ:

"How happy and proud I will be when we two of us togather have brought our work on relative motion to a triumphant end."

یہ خط 1901 کی تحریر ہے۔ آئنسٹائن پر کام کرنے والے معروف اسکالر رابرٹ شلمیں (Rolbert Schulman) لکھتا ہے کہ ایسے کوئی شواہد موجود نہیں جس سے اندازہ ہو کہ 1905 کی تحقیق میں میلی وا کا کوئی تعاون ہے۔ آئنسٹائن کے ایک دوسرے سوانح نگار اسٹاشیل (Stachel) بھی اس کی نفی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ میلی وا یونیورسٹی امتحانات میں دوبار فیل کرچکی تھی اس لیے کہ ریاضی میں بہت کمزور تھی۔

آئنسٹائن شخصیت پرستی کا قائل نہیں تھا۔ صاحبان اقتدار کے لیے اس کے دل میں شدید نفرت تھی۔ 18 ستمبر 1930 کو ایک خط میں لکھتا ہے:

''صاحبانِ اقتدار کے لیے ہمارے دل میں جو نفرت تھی قدرت نے اس کا انتقام اس طرح لیا کہ مجھے بھی مقتدر بنادیا۔''

ہر بڑے دماغ کے اندر تھوڑی سی انا ہوتی ہے۔ اس کے اندر بھی تھی لیکن مثل مشہور ہے کہ:

"All great men lack in Common sence."

آئنسٹائن کی شخصیت بھی اس سے خالی نہیں تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہر مافوق الفطرت انسان میں تفنن طبع کے جوہر بھی ہوتے ہیں۔

مثلاً امریکہ کے سفر کے دوران کسی نامہ نگار نے سوال کیا:

''پروفیسر آئنسٹائن! کیا آپ امریکہ آکر مسرت محسوس کررہے ہیں۔''

''بلاشبہ! آپ کو امریکہ میں دیکھ کر'' اس کا جواب تھا۔

اس طرح لانگ آئی لینڈ (Long Island) کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''وہاں نامہ نگاروں نے نہایت مہمل اور بے تکا سوالات کیے۔ اس کے جواب ہم نے بھی اسی انداز میں دیے۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے۔''

آئنسٹائن نے اپنے اعلیٰ رتبے اور غیر معمولی شہرت کو سماجی اور سیاسی اصلاحات کے لیے استعمال کیا۔ نازی جرمنی سے جان بچا کر بھاگنے والے ریفوجیوں کی بھرپور مدد کی۔ یروشلم میں یہودی عالموں کے لیے اس نے Hebrew University قائم کی۔ فلسطین میں یہودی حکومت (اسرائیل) کے قیام میں اس نے نہایت اہم رول ادا کیا۔ اس کے باوجود اس میں عصبیت اور فرقہ پرستی کے عناصر نہیں تھے۔ وہ عرب اور یہودی کے درمیان برابری اور مساوات کا حامی تھا۔ خود اس کے الفاظ یہ ہیں:

"The most inprotant aspect of our policy must be our every present manifest desire to institute complete equality for Arab citizen in hour midst."

وہ ایک مکمل اور بااصول سوشلسٹ تھا۔ کمیونزم اور کیپٹلزم دونوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ان سے متنفر تھا۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ ایک آفاقی حکومت کا قیام ہی نیوکلیائی ہتھیاروں پر کنٹرول رکھ سکتا ہے۔ حقوق انسانی کا زبردست حامی تھا۔

مساوات پر اسے یقین کامل تھا۔ وہ سزائے موت کا زبردست مخالف تھا۔ اکثر و بیشتر سیاہ فام لوگوں کے درمیان وقت گزارتا اور دوسری طرف بلجیم کی ملکہ الزبیتھ کے ساتھ بیٹھ کر وائلین بجاتا۔

مارٹن اینڈرسن اپنے زمانہ کی مشہور اوپیرا سنگر تھی۔ اس کے سیاہ فام ہونے پر ہوٹل والوں نے اپنے یہاں کمرہ دینے سے انکار کیا تو آئنسٹائن نے خود اپنی رہائش گاہ میں کمرہ دینے کی پیش کش کی۔

سیاست اور سائنس ہردو شعبے میں آئنسٹائن کے مجتہدانہ اور مجادلانہ طریقہ عمل سے اس کے بہت سے دشمن ہوگئے۔ نازیوں کے ہٹ لسٹ (1922) میں اس کا نام بھی تھا۔ جرمن سائنس دانوں نے اس کے کارناموں کو 'Jewish Physics' سے منسوب کیا اور اس کی تضحیک کی۔ ان حالات سے تنگ آکر 1933 میں جرمنی سے فرار اختیار کی اور پرنسٹن شہر میں پناہ لی۔ یہاں بھی اسے سکون نہیں ملا اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن (FbI) نے اس کے خلاف اٹھارہ سو صفحات پر مبنی دستاویز تیار کیا تاکہ اسے مجرم ثابت کرکے شہر بدر کیا جاسکے۔ ایف بی آئی کے علاوہ دوسرے سات تفتیشی ادارے اس کے خلاف ثبوت تلاش کرتے رہے لیکن ناکام رہے۔ سائنس کے مجتہدانہ انکشافات کا ورثہ یا میراث جو ہم تک پہنچی ہے وہ نہایت مستحکم اور مضبوط ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اسپیشل تھیوری آف ریلیٹی ویٹی (Special Theory of Relativity) کی اصلاح ممکن ہو لیکن عام نظریہ اضافیت (Quneral Theory of Relatively) میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔

عصر حاضر میں سائنس داں ایک ایسے قانون صدر (Theory of Every thing) کی تلاش میں ہیں جو ارضی کشش (Gravity) کو قدرت کی دوسری قوتوں کے ساتھ ہم آہنگ کرسکیں۔ ایسے قانون کی تلاش خود آئنسٹائن کو بھی تھی لیکن وہ ناکام رہا۔ اس سلسلے میں کوششیں جاری ہیں۔ یہ بذاتِ خود آئنسٹائن کے لیے ایک قسم کی عقیدت ہے۔ بڑھتے ہوئے وقت کے ساتھ اس کی نیک نامی میں کمی نہیں ہوگی۔ انسانوں کی آبادی جیسے جیسے مطمئن اور آسودہ حال ہوگی اس کا احترام بڑھتا جائے گا۔ مستقبل کے انسانوں میں آئنسٹائن کے لیے ویسی ہی ہمدردی اور عقیدت ہوگی جو آج موزارٹ (Mozart) اور گاندھی کے لیے ہے۔

■

Noorul Hoda
9H/5, Alimuddin Street
Kolkata - 700016 (WB)
Mob.:9903778757

انیس الحسن صدیقی

خلا تک پہنچنے والی لفٹ

آپ بھی سوچیں گے کہ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے؟ یہ تو من گھڑت بات معلوم ہوتی ہے۔ ایسا بالکل بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ زمین کی سطح کے ہر طرف 100 کلومیٹر کی اونچائی سے خلا (Space)[1] شروع ہوتی ہے۔ زمین کے ہر طرف 96 کلو میٹر اونچائی تک فضا کا کرہ (Atmosphere) ہے۔ لفٹ[3] تو کئی منزلہ عمارتوں میں بنتی ہے۔ زمین سے آسمان تک لفٹ بنانا ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی لفٹ بنانے کے لیے 36,000 کلومیٹر اونچائی تک ایک مینار بنانا ہوگا۔ پھر اس مینار میں بہت ہی موٹے مضبوط اور لمبے تاروں کو لپیٹنے کے لیے کئی پُلیاں (Pullies) بنانی ہوں گی۔ پھر ان مضبوط تاروں سے بندھے ہوئے لفٹ والے کمرہ کو 36,000 کلومیٹر اونچائی تک اوپر اٹھانے کے لیے بہت ہی زیادہ ہارس پاور کے انجن لگانے ہوں گے اور حفاظتی طریقے اپنانے ہوں گے تاکہ لفٹ کا تار ٹوٹ نہ جائے یا اس کے انجن میں خرابی نہ آ جائے۔ مستقل بجلی کی سپلائی دینی ہوگی جیسا کہ کئی منزلہ عمارتوں کی لفٹوں میں عام طور پر دیکھا گیا ہے۔

بھلا بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا والی مثال سامنے آتی ہے یا نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ذرا آپ سوچیں کہ بیسویں صدی میں جو ہمیں جدید سائنس کے ذریعے سہولیات مثلاً موبائل، ٹی وی، کمپیوٹر، جی پی ایس، دور دراز کی حساسی (Remote sensing)، خلا میں پروازیں وغیرہ ہمیں مُیسر ہوئی ہیں جن کے ذریعے جدید زندگی کا طرز ہی بدل گیا ہے۔ ان کے ذریعے تکنیک نے بھی ترقی کی ہے۔ تکنیک کے ذریعے سو منزلہ سے بھی زیادہ اونچی اونچی عمارتیں مثلاً امریکہ میں 104 منزلہ عمارت امپائر اسٹیٹ بلڈنگ، جڑواں ٹاورز، دبئی میں خلیفہ بُرج اور ملیشیا اور سنگاپور میں بزنس ٹاورز وجود میں آئے ہیں۔ جاپان اور کئی ملکوں میں مقناطیسی ریل گاڑیاں (Magnetic Trains)[4] چلائی جا رہی ہیں جن کی رفتار بہت ہی زیادہ ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ایسی ریل گاڑی گجرات صوبہ میں چلنے والی ہے۔ یہی نہیں بیسویں صدی میں خلائی جہاز (Spacecraft)[5] وائیجر۔ اول اور دوم نظام شمسی (Solar systen)[6] کے دوسرے سیاروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے داغے گئے تھے اور جو آج اکیسویں صدی میں ہماری زمین سے اربوں کلومیٹر کا سفر کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی خلائی جہاز نیو ہورائزن، کیپلر اور پائنیر۔ اول اور دوم بھی داغے گئے جن کے ذریعہ نظام شمسی کے تمام سیاروں اور ان کے چاندوں کے متعلق تمام طبعی معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ یہی نہیں خلا میں دوربینیں (Space telescopes)[7] نصب ہوئی ہیں۔ خلا میں عالمی خلائی اسٹیشن (International space station)[8] بھی معلق کیا گیا ہے جس میں خلاباز چھ چھ ماہ رہ کر اور اپنے اپنے تجربات کر کے واپس زمین پر آ رہے ہیں۔ اکیسویں صدی سائنس اور تکنیک کی صدی کہلائی جانے لگی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام ناممکن کام اب سارے ممکن کام ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمام افسانوی تصورات جن کو مصنفوں نے اپنے افسانوں میں ایک خیال کے طور پر تصور کیا تھا وہ آج حقیقت میں بدل رہے ہیں۔ آج سے چار سو سال پہلے کی دنیا کے حالات کو آج کے حالات سے اگر موازنہ کیا جائے تو آج کی زندگی اور پچھلے سو سال کی زندگی میں

زمین آسمان کا فرق ملے گا۔ یہ تمام چیزیں اور جدید سہولیات جو آج سائنس اور تکنیک کے ذریعے ہمیں میسر ہیں ان سب کو مصنفوں نے ڈیڑھ سو اور دو سو سال پہلے اپنے افسانوں میں تصور کیا تھا۔ مثال کے طور پر انگریزی زبان میں سائنس سے متعلق کہانیوں اور افسانوں کے انگریزی زبان میں مشہور مصنفین جولیس ورنے (Jules Verne) اور ایچ جی ویلز نے اپنی کہانیوں اور افسانوں میں خلائی جہاز (Spaceships)، پن ڈبی (Submarine)، کمپیوٹر (Computer) کا تصور کیا تھا۔ یہ تمام چیزیں آج ایک عرصے سے استعمال میں ہیں۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ پہلے کسی انہونی چیز کا تصور کیا جائے اور اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سائنس اور تکنیک کی مدد سے کوشش کی جائے تو وہ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک یا دو یا تین اور چار مرتبہ فیل ہو جائیں گے لیکن اس فیل میں ہمارا پاس ہونا ممکن ہے۔ مندرجہ بالا سائنس کے تجربات میں تو کئی کئی مرتبہ سائنسداں اور تکنیکی ماہر فیل ہوئے ہیں۔ ہر مرتبہ کے فیل ہونے کے بعد ان کو ان کی کمی کے بارے میں پتہ چلا تو انھوں نے اس کمی کو دور کیا۔ دوسری مرتبہ اور کمی کو دور کیا۔ غرض کہ کئی کمیاں دور کرنے کے بعد کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ کبھی بھی اپنی کمی پر کسی بھی کام کو ختم نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کمیوں کو دور کرنے کی کوشش میں کامیابی ہے۔ اکیسویں صدی میں یعنی جس میں آج ہم رہ رہے ہیں اس میں تمام خیالی چیزوں کا بنانا سائنس اور تکنیک کی مدد سے آسان ہو گیا ہے۔ اسی لیے کچھ اسکولوں میں بچوں کو پروجیکٹ دیے جاتے ہیں کہ وہ ان کو بنا کر لائیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بچے بہت ہی ہوشیاری سے ان پروجیکٹ پر کام کر کے انعام حاصل کر رہے ہیں۔

اس لیے بچکانہ تصور کو سائنس اور تکنیک کی مدد سے حقیقت میں بدلا جا سکتا ہے۔

انگریزی زبان میں مصنف آرتھر سی کلارک نے 1979 میں اپنے ایک ناول، جس کا عنوان 'جنت کے فوارے' لکھا تھا، اس میں خلا تک پہنچنے والی لفٹ کا ذکر کیا تھا۔

خلا تک پہنچنے والی لفٹ ایک تصور ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے سوچا جا رہا ہے کہ کس طرح خلا تک پہنچے اور وہاں سے واپسی کے لیے ایک نلی (ٹیوب) بنائی جائے اور اس میں لفٹ لگائی جائے۔ ایسی نلی جو زمین کی سطح کو خلا سے ملا سکے تاکہ اس کے ذریعے خلا تک پہنچا جا سکے اور اسی نلی کے ذریعے وہاں سے پھر زمین پر واپس آنے کا سفر کیا جا سکے۔ اگر ایسا منصوبہ بنایا جائے تو کم خرچ پر بغیر ماحولیاتی آلودگی (Environmental Pollution)[9] کے حفاظت سے زمین اور خلا کے درمیان آسانی سے سفر کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔

آپ ایسا سوچ سکتے ہیں کہ خلا سے زمین تک ایک نلی لٹک رہی ہو۔ دوسری طرح سے اس کو ایسا بھی سوچا جا سکتا ہے کہ زمین کی سطح پر ایک دیو قامت مینار بنایا جائے جس کی اونچائی خلا تک ہو۔ ایک چھوٹے پھلی دار پودہ کی ڈنڈی والی کہانی کی طرح جس میں جیک پھلی دار پودہ کی ڈنڈی کے ذریعے بادلوں میں چڑھ گیا تھا۔

آپ ایسی لفٹ کے ذریعے ایک ساکت بالائے زمین (Geostationary) مصنوعی سیارچہ (Satellite) تک جا سکتے ہیں یعنی جو آسمان میں زمین کی سطح سے 36,000 کلومیٹر کی بلندی پر معلق دکھائی دیتا ہے۔ ایسے سیارچے کی زمین کے گرد اپنے مدار میں طواف کرنے کی رفتار زمین کے اپنے محور پر گھومنے کی رفتار جتنی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ آپ کو آسمان میں معلق دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ جیسے جیسے زمین گھومتی ہے ویسے ویسے وہ بھی زمین کے گھومنے کی رفتار سے زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ ایسے مصنوعی سیارچے زمین کی سطح سے ننھے ننھے ستارے جتنے رات میں اکثر دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستان کی خلائی تنظیم اسرو (ISRO)[10] نے ایسے مصنوعی سیارچے، موبائل، ٹی وی پروگرام نشر کرنے، جی پی ایس (GPS)، انٹرنیٹ اور موسم کی دیکھ بھال کرنے کے لیے خلا میں معلق کیے ہیں۔ تبھی آپ کو یہ تمام سہولتیں بہت ہی سستے داموں مل رہی ہیں۔

خلا تک پہنچنے کے لیے لفٹ زمین کی سطح اور خلا کو ملانے کے لیے بنائی جائے گی۔ اس کو بہت ہی احتیاط سے بنایا جائے گا تاکہ لفٹ کی کشش (Gravity)[11] کا مرکز ساکت بالائے زمین کے مدار سے ہٹ نہ جائے۔ ایک نلی ساکت بالائے زمین مصنوعی سیارچہ سے باہر کی طرف لٹکائی جائے گی اور کشش و مرکز گریز قوت (Centrigugal force)[12] کا توازن بنانے کے لیے اس پر مناسب وزن لٹکایا جائے گا۔ عملاً یہ مرکز گریز وزن اور زمینی کشش کی طاقتیں اس نلی پر بہت ہی زیادہ دباؤ (Tension) بنائیں گے اور اسی دباؤ کی مُناسبت سے اس نلی کے ڈھانچے میں مال لگایا جائے گا تاکہ وہ ٹیوب قائم رہ سکے۔ ایک دوسری عملی مشکل اس کے اوپر بہت ہی زیادہ خرچ کی بھی ہے۔ اس لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ فی الحال ایسے پروجیکٹ کا کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ امریکہ کی خلائی تنظیم ناسا (NASA)[13] کی انٹرنیٹ کی ویب سائٹ پر جا کر ہوم (Home) صفحے پر آرٹسٹ کے ذریعے بنائے گئی تصویر خلا تک پہنچنے والی لفٹ کا خاکہ دیکھ سکتے ہیں۔ سائنسداں اس پر غور کر رہے ہیں کہ آیا ایسا خیال کیا نظریہ (Theory)[14] کے ذریعے ممکن بھی ہے کہ نہیں۔

زمین کی کشش (Gravity) کیا ہے؟

سترھویں صدی کے روایتی قصے میں دنیا کے مشہور و معروف سائنسداں اسحاق نیوٹن نے ایک سیب کو پیڑ پر سے زمین پر گرتے ہوئے دیکھا اور غور کیا اور کائناتی کشش ثقل (Universal Gravitation) دریافت کی۔ کائناتی کشش ثقل ایک بنیادی قانون ہے جو کائنات میں ہر چیز پر لاگو ہوتا ہے۔ ان کے مطابق ہر وہ چیز جو مادہ (خام مال) رکھتی ہے اس میں اپنی طرف کھینچنے کی طاقت ہوتی ہے۔ اس چیز میں جتنا زیادہ مادہ ہوگا اس میں اتنی ہی زیادہ اپنی طرف کھینچنے کی طاقت ہوگی۔ اس لیے ہر چیز اپنے مادہ کے حساب سے دوسری چیز کو کھینچتی ہے۔ یہی کھینچنے کی طاقت سورج، زمین، چاند اور دوسری آسمانی چیزوں میں بھی ہے۔

اس لیے کائناتی کشش ثقل چاند، زمین اور سورج کے درمیان حرکت کرتی ہے۔ زمین اور پینسل کے

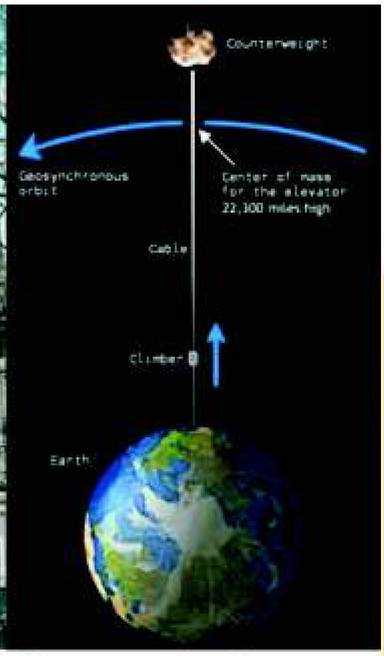

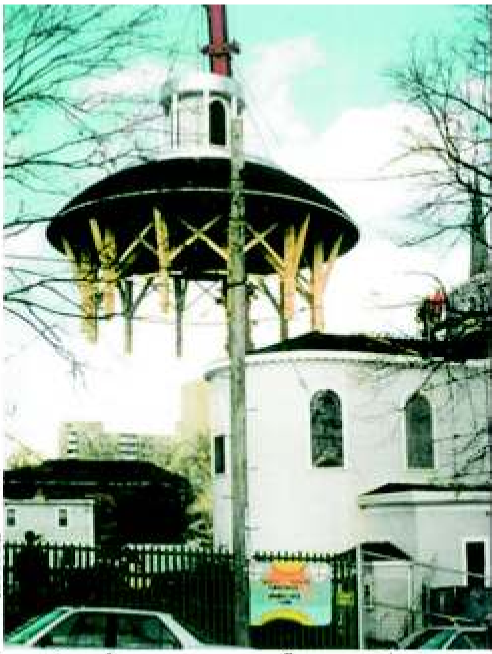

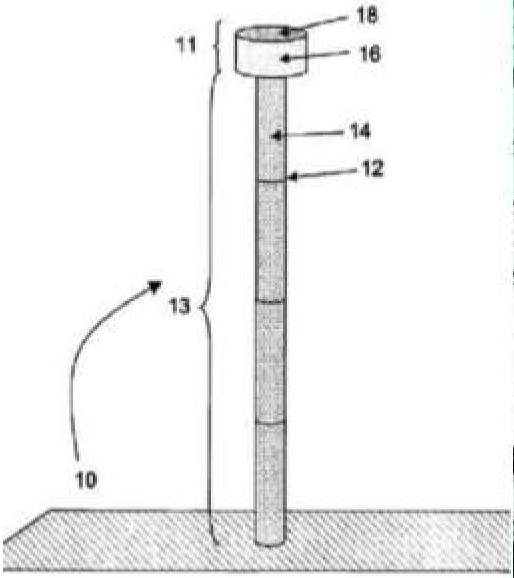

درمیان اور ربڑ اور کتاب کے درمیان اور یہاں تک کہ آپ میں اور کتاب کے درمیان بھی۔

جس نقطۂ نظر سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ تمام چیزیں ایک ساتھ زمین کی طرف کھنچ رہی ہیں۔ اس لیے زمین اور تمام چیزوں کے درمیان کشش بہت ہی زیادہ زمین کے بہت ہی زیادہ مادّہ کی وجہ سے ہے۔ اس لیے ان تمام چیزوں اور زمین کے درمیان کھنچاؤ کی طاقت کو زمین کی کشش کہا جاتا ہے۔ جتنا آپ زمین کے نزدیک ہوتے ہیں اتنی ہی زیادہ زمین کی کشش زیادہ مضبوط ہوتی جاتی ہے اور جتنا آپ زمین سے دور ہوتے جاتے ہیں اتنی ہی زمین کی کشش کمزور ہوتی جاتی ہے۔ سورج کا مادّہ زمین کے مادّہ سے بہت ہی زیادہ ہے اس لیے سورج کی کشش کی وجہ سے زمین اس کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ چاند کا مادّہ زمین کے مادّہ کا تقریباً ایک چوتھائی ہے اس لیے زمین کی کشش کی وجہ سے چاند زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے۔

یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ایسا کیوں ہے کہ ایک خلائی اسٹیشن میں خلا باز اور چیزیں تیرتی ہیں؟ کیا یہ اس وجہ سے کہ خلا باز اور خلائی اسٹیشن میں چیزیں زمین سے بہت دور ہیں اور وہاں زمین کی کشش نہیں ہے۔

یہ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اگر خلا میں خلائی اسٹیشن زمین سے 400 کلو میٹر دور ہوگا تب بھی زمین کی اپنی طرف کھینچنے کی طاقت یعنی کشش تقریباً 90 فی صد بمقابلہ زمین کی سطح کے ہے۔ اگر وہ چیزیں اور خلا باز زمین سے 400 کلو میٹر دور خلا میں ہونے کے باوجود تب بھی زمین کی طرف گریں گی۔ خلائی اسٹیشن میں خلا باز اور چیزیں اس لیے تیر رہی ہیں کیونکہ خلائی اسٹیشن حقیقت میں مستقل زمین کی طرف گر رہا ہے اور خلائی جہاز اسی وقت زمین کی مخالف سمت میں بہت ہی تیز رفتار سے آگے کی طرف اڑ رہا ہے جس سے اس کی اڑان زمین کے گرد ایک چکر میں ہو جاتی ہے۔ یہ آزادانہ طور پر گرنے کی حالت ایک متواتر خلائی اسٹیشن میں خلا باز اور ان کی چیزوں پر اثر کرتی ہے جسے کشش صفر (Zeero gravity) کہا جاتا ہے۔ ایسی کشش کی صفر حالت میں خلا باز اور ان کی چیزیں خلائی اسٹیشن میں تیرتی ہیں۔ خلا باز اپنی تمام چیزوں کو خلائی اسٹیشن میں باندھ کر رکھتے ہیں۔

اب آپ اپنے آپ کو ایک لفٹ (Elevator) میں سفر کرتے ہوئے خیال کریں۔ جب یہ اچانک نیچے کی طرف آتی ہے تو آپ اپنے آپ کو تیرتا ہوا اپنے پیٹ میں محسوس کرتے ہیں۔ اگر آپ لفٹ میں عمارت کی سب سے اونچی منزل میں ہوں اور اچانک لفٹ کے تار کاٹ دیے جائیں تو لفٹ اچانک بہت ہی تیزی سے نیچے کی طرف گرے گی اور تیزی سے گرتے وقت جب تک یہ نیچے نہیں پہنچتی ہے تب تک آپ کشش صفر کی حالت میں ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ہوا میں لفٹ کے اندر تیر رہے ہوں گے۔

اسی طرح بنجی چھلانگ (Bungee-jumping) لگاتے ہوئے بھی آپ کشش صفر محسوس کرتے ہیں۔

خلائی اسٹیشن جو خلا میں زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے وہ بھی ایک لفٹ کی طرح ہے جو کہ مستقل زمین کی کشش کے اثر سے زمین کی طرف گر رہا ہے اور اور ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی تیز رفتار سے زمین کی مخالف سمت میں جا رہا ہے۔ لہٰذا اس کے اندر مضبوط کشش صفر کی حالت (یعنی میکرو کشش (Micro gravity) کی حالت) ہے۔ خلائی اسٹیشن کے ایسے بے مثل ماحول میں سائنسداں علم حیات (Biology) اور ادویات (Medicine) کے نئے مادوں کی نشو و نما اور تحقیق پر کام کر رہے ہیں۔

زمین کی کشش خلا میں پہنچتی ہے۔ زمین کی کشش میں آزادانہ طور پر گرنے سے آپ کشش صفر محسوس کرتے ہیں۔

مرکز گریز قوت (Centrifugal force) کیا ہے؟

آپ نے اکثر پارکوں میں خود سے چلانے والا گول چکر ضرور دیکھا ہوگا۔ اس کا زنجیر سے بندھا ہوا ہینڈل پکڑ کر خوب ہوا میں لٹک کر گھومے ہوں گے یا پھر میلے میں زنجیر سے بندھے ہوئے گول دائرے میں لکڑی کے بنے ہوئے خوبصورت گھوڑے پر بیٹھ کر ہوا میں گھومتے ہوئے ٹیڑھے ہوئے ہوں گے۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ آپ گھومتے وقت ہوا میں ٹیڑھے کیوں ہوتے ہیں؟ اور ایسا لگتا کہ آپ باہر کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں۔ کوئی قوت ہے جو آپ کو باہر کی طرف دھکیل رہی ہے۔ وہ ہی مرکز گریز قوت ہے۔ اس قوت کا ہم حساب بھی لگا سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اس کی زاویائی رفتار فی سیکنڈ معلوم کرنی ہوگی اور آپ کے گھومنے کا نصف قطر (Radius) بھی۔ جتنی زیادہ زاویائی رفتار ہوگی اتنا ہی زیادہ مرکز گریز قوت ہوگی۔ اسی زاویائی رفتار میں اگر گھومنے کا نصف قطر زیادہ ہوگا تو بھی مرکز گریز قوت زیادہ ہوگی۔

زمین ایک دن اور ایک رات یعنی 24 گھنٹوں میں ایک مرتبہ گھومتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی آدمی زمین کے خط استوا پر کھڑا ہوا ہے تو اس کو بہت ہی زیادہ مرکز گریز قوت کا دھکا باہر کی طرف محسوس ہوگا کیونکہ خطِ استوا زمین کا سب سے لمبے نصف قطر کا نقطہ ہے۔ جاپان، ہندوستان یا یو ایس اے یا دوسرے درمیانی عرض البلد والے ملکوں کے رہنے والے درمیانہ مرکزی گریز قوت کا دھکا باہر کی طرف محسوس کریں گے۔ اگر کوئی قطب شمالی یا قطب جنوبی پر کھڑا ہوا ہے تو اس کو مرکزی گریز قوت کا دھکا بالکل بھی محسوس نہیں ہوگا۔ ایک آدمی جو زمین کے خط استوا پر کھڑا ہوا ہے تو وہ 470 میٹر فی سیکنڈ کے حساب سے

زمین کے ساتھ ساتھ گھوم رہا ہے (یہ رفتار آواز کی رفتار سے بھی تیز ہے)۔ ایک آدمی جو جاپان، ہندوستان یا یو ایس اے میں کھڑا ہوا ہے وہ زمین کے ساتھ ساتھ 300 میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے گھوم رہا ہے۔ حالانکہ یہ بہت ہی تیز رفتار ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کو زمین کی کشش (Gravity) زمین کی طرف کھینچ رہی ہے جو کہ مرکزی گریز قوت سے بھی زیادہ ہے۔ اسی لیے، وہ لوگ جو خط استوا یا درمیانی عرض البلد والے ملکوں میں رہ رہے ہیں وہ باہر کی طرف دھکیلے نہیں جا رہے ہیں۔ خطِ استوا پر زمین کی کشش 290 گنا زیادہ ہے بہ نسبت مرکزی گریز قوت کے۔ جاپان، ہندوستان اور یو ایس اے میں 440 گنا زیادہ ہے۔

آپ سوال کر سکتے ہیں کہ اگر زمین زیادہ تیزی سے گھومے گی تب کیا ہوگا؟ کیا واقعی لوگ زمین سے خلا کی طرف اڑ جائیں گے؟ اگر زمین 24 گھنٹوں میں ایک مرتبہ نہیں گھومتی ہے بلکہ مثال کے طور پر 84 منٹ میں ایک مرتبہ گھومتی ہے تو ایک آدمی جو خطِ استوا پر کھڑا ہوا ہے تو وہ زمین کے ساتھ ساتھ 7.9 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے گھوم رہا ہوگا۔ اس صورت میں مرکزی گریز قوت اور زمین کی کشش دونوں بالکل برابر ہوں گے۔ لیکن اگر اس سے بھی زیادہ تیز رفتار سے زمین گھومے گی تو ضرور یہ آدمی زمین سے خلا کی طرف اڑ جائے گا۔ 7.9 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار ان راکٹوں کے لیے بنیادی رفتار ہے جن کو خلا کے لیے داغا جاتا ہے۔ اس رفتار کو 'پہلی کائناتی رفتار' بھی کہا جاتا ہے۔ یہی رفتار ان مصنوعی سیارچوں کی بھی ہے جو زمین کے گرد اپنے مدار میں چکر لگا رہے ہیں۔

آپ اس وقت 1000 فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کے ساتھ ساتھ گھوم رہے ہیں جس کا آپ کو زمین کی کشش کی وجہ سے پتہ بھی نہیں چلتا ہے۔

ناسا کے انٹرنیٹ کی ویب سائٹ کے ہوم صفحے پر یہ لکھا ہوا پایا گیا ہے:

خلا تک پہنچانے والی لفٹ خلا تک پہنچنے کے منصوبہ کا ایک نظام ہے جو خلا تک پہنچنے کے لیے موجودہ نظام کی کایا پلٹ کرسکتا ہے یعنی راکٹ کی بجائے بجلی سے چلنے والی گاڑیاں زمین کی سطح سے خلا تک ساکت بالائے زمین پر نصب اسٹیل کے تاروں کی بٹی ہوئی رسی پر چلیں گی۔

یہ پروگرام اب چوتھے سال میں ہے۔ خلا تک پہنچنے والی لفٹ کے کھیلوں کا مقابلہ ہر سال زیادہ کارگر ہو گیا ہے۔ حالانکہ مقابلہ میں حصہ لینے والوں نے ابھی تک انعام کی رقم نہیں جیتی ہے۔ اس سال 20 لاکھ امریکی ڈالر کا انعام اس کو ملے گا جو اسٹیل کے تاروں کی بٹی ہوئی رسی (Cable) پر لیزر کے ذریعے طاقت فراہم کی گئی اپنی گاڑی کو 5 میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے اوپر کی طرف چڑھائے گا۔

تمام بچوں کے والدین کے لیے کو راقم الحروف کا مشورہ ہے کہ ایسا پروجیکٹ اپنے بچوں سے بنوا کر ان کے اسکولوں میں بچوں سے پیش کروائیں تا کہ ان کے سالانہ امتحان میں زیادہ سے زیادہ نمبر آسکیں اور وہ بچے مستقبل میں سائنس داں یا تکنیکی ماہر بن کر اپنے ملک کا نام روشن کریں۔

> خلا تک پہنچانے والی لفٹ خلا تک پہنچنے کے منصوبہ کا ایک نظام ہے جو خلا تک پہنچنے کے لیے موجودہ نظام کی کایا پلٹ کر سکتا ہے یعنی راکٹ کی بجائے بجلی سے چلنے والی گاڑیاں زمین کی سطح سے خلا تک ساکت بالائے زمین پر نصب اسٹیل کے تاروں کی بٹی ہوئی رسی پر چلیں گی۔

حواشی

(1) خلا (Space) یعنی خالی جگہ جہاں کوئی چیز واقع ہو یا نہ ہو۔ زمین کے کرۂ ہوائی یا کرۂ باد سے باہر کی جگہ اور کرۂ ہوائی زمین کی سطح سے ہر طرف 100 کلومیٹر کی اونچائی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ یہاں سے ہوا کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہوا بالکل بھی نہیں ہوتی ہے۔

(2) فضائی کرہ یا کرۂ فضائی یا کرۂ باد (Atmosphere) یعنی زمین کے گرد ہر طرف زمین کی سطح سے 100 کلومیٹر کی اونچائی تک فضا موجود ہے۔

(3) لفٹ (Elevator) اونچائی پر لے جانے والی، رافع مشین۔ یہ مشین کئی منزلہ عماتوں میں لگی ہوتی ہے اور لوگوں کو اس عمارت کی کسی بھی منزل تک پہنچانے اور اوپر سے نچلی منزل تک لانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

(4) مقناطیسی ریل گاڑی (Magnetic Train) مقناطیس کے ذریعے چلنے والی گاڑی۔

(5) خلائی جہاز (Spacecraft) یعنی خلا میں سفر کرنے والا مصنوعی سیارچہ جو بغیر ہوا کے سفر کرتا ہے کیونکہ خلا میں ہوا نہیں ہوتی ہے۔ جبکہ ہوائی جہاز صرف ہوا میں ہی اڑ سکتا ہے۔

(6) نظامِ شمسی (Solar system) یعنی سورج اور اس کے گرد گھومنے والے سیاروں و دیگر اجرامِ فلکی کا نظام۔

(7) خلائی دوربینیں (Space Telescopes) یعنی خلا میں مصنوعی سیارچہ پر نصب کی گئی دوربین جس کے ذریعہ خلا میں دور دراز کے خلائی اجرام کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ یہ زمین پر نصب رصد گاہ کو خلائی اجرام کی تصویریں فراہم کرتی ہیں۔ زمین کی سطح پر نصب دوربین کے ذریعے خلائی اجرام کی تصویریں کرۂ فضا کی وجہ سے صاف نہیں آتی ہیں۔

(8) عالمی خلائی اسٹیشن (International Space station) یعنی خلائی کارروائیوں کے لیے خلا میں چھوڑا جانے والا مصنوعی سیارہ۔ اس میں تمام ملکوں کے خلا باز سائنسداں اس میں اپنے اپنے تجربات کر کے زمین پر واپس آتے ہیں۔ یہ ایک مکمل خلا میں زمین کے گرد چکر لگاتی ہوئی لیباریٹری اور رصد گاہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

(9) ماحولیاتی آلودگی (Environmental Pollution) کلورو فلورو کاربن گیس، کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس، میتھین گیس اور نائیٹرس آکسائیڈ گیس، سلفر ڈائی آکسائیڈ گیسوں کی ہوا میں زیادتی کی وجہ سے ہماری فضا میں آلودگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ تمام گیسیں صنعتی فیکٹریاں اور کوئلہ، ڈیزل اور پیٹرول کے انجنوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں جس سے سانس لینے میں دقت ہوتی ہے۔ صرف بجلی کے استعمال سے ماحولیاتی آلودگی سے بچا جا سکتا ہے۔

(10) اسرو (Indian Space & Research Organisation - ISRO) ہندوستان کی ایک تنظیم جو خلا اور خلائی اجرام کے بارے میں تحقیق کرتی ہے۔

(11) کشش (Gravity) ہر وہ چیز جو مادّہ (خام مال) رکھتی ہو اس میں اپنی طرف کھینچنے کی طاقت ہوتی ہے۔ اس میں جتنا زیادہ مادّہ ہوگا اتنی ہی اس میں اپنی طرف کھینچنے کی طاقت ہوگی۔

(12) مرکز گریز قوت یا مرکزی قوتِ دافعہ (Centrifugal force) یعنی کسی مرکز کے گرد گھومتی ہوئی شے کو باہر کی طرف کھینچنے والی ظاہری قوت۔

(13) ناسا (National Aeronautics & Space Administration - NASA) یعنی امریکہ کی خلائی تنظیم۔

(14) نظریہ (Theory) یعنی اصولی مسئلہ۔ اصولی غور و فکر کا میدان۔

■

A.H. Siddiqui
679, Sector - 22B
Gurugram- 122015 (Haryana)
M:9654949434
aneessiddiqui2003@gmail.com

محمد آصف

انسانی زندگی میں کیمیائی ٹیکنالوجی کا دخل

جدید سائنس نے 1650 تا 1700 کے دوران بے پناہ ترقی کی۔ اس زمانے میں فلکیات، طبعیات، کیمیا اور حیاتیات کے شعبوں میں نمایاں کام انجام دیے گئے۔ علم کیمیا کی یہ خوبی ہے کہ اس نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جہاں کیمیا کا کچھ نہ کچھ استعمال نہ ہوا ہو۔ ہم غذا کھاتے ہیں، کپڑا، جس سے ہم اپنا لباس بناتے ہیں، اشیا جو مکان کی تعمیر میں استعمال ہوتی ہیں، دوائیں جو ہماری صحت کے لیے ضروری ہیں، الغرض ہر وہ شے جسے ہم استعمال کرتے ہیں علم کیمیا کی وسعت کا پتہ دیتی ہے۔

علم کیمیا ہماری زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کرتا ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ ہم عام استعمال ہونے والے کیمیائی مرکبات کا علم رکھیں تا کہ ہم اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو اس سے ہونے والے مضر اثرات سے بچا سکیں۔ ہمارے ملک میں ایسے بہت سارے کیمیائی حادثات ہوتے ہیں، جس میں بھوپال گیس حادثہ سب سے نمایاں ہے۔ یہ حادثہ ہماری ریاست مدھیہ پردیش کی راجدھانی اور صنعتی شہر بھوپال میں 2 دسمبر 1984 کی رات میں ہوا۔ اس حادثے کی وجہ ایک انتہائی زہریلی گیس Methyl iso-cynide تھی جو ایک امریکن کارخانے Union Carbide Corporation سے خارج ہوئی اور چند منٹوں میں لاکھوں لوگوں کو اپنا شکار بنا دیا۔

اس طرح بہت زیادہ مرتکز گندھک کا تیزاب (Oleum) جو مٹی کے تیل کی طرح دکھائی دیتا ہے، لوگوں کی لاعلمی کے سبب کئی لوگوں کی موت کی وجہ بنا۔ دنیا میں ایسے بہت سارے واقعات ہوئے ہیں جس میں Oleum ٹینکر کے حادثے میں لوگ اُسے مٹی کا تیل سمجھ کر جمع کرنے لگے اور موت کا شکار ہوگئے۔ ہماری معلومات ہمیں ان جیسے حادثوں سے بچا سکتی ہے۔

حیوانات اور نباتات کی حیات میں تبدیلی اور تغیر بیحد ضروری ہے اور یہ تبدیلی کیمیائی تغیرات کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ فطرت خود ایک بڑا کیمیائی تجربہ خانہ ہے جس میں ہزارہا سادہ اور پیچیدہ نوعیت کے تعاملات ہر لمحہ واقع ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے ایسے مرکبات پیدا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے زندگی چلتی ہے۔

حیوانات اور نباتات کی حیات میں تبدیلی اور تغیر بیحد ضروری ہے اور یہ تبدیلی کیمیائی تغیرات کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ فطرت خود ایک بڑا کیمیائی تجربہ خانہ ہے جس میں ہزارہا سادہ اور پیچیدہ نوعیت کے تعاملات ہر لحہ واقع ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے ایسے مرکبات پیدا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے زندگی چلتی ہے۔

ٹیکنالوجی سائنس کا ایک عملی پہلو ہے۔ دنیا میں انسان کی ترقی دراصل ٹیکنالوجی کی ترقی کی داستان ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ انسانی تاریخ کو جن مختلف زمانوں میں تقسیم کرتے ہیں' ان میں ہر زمانے یا دور کی شناخت اس دور کے انسانوں کی بنائی ہوئی ٹیکنالوجی پر ہی رکھی گئی ہے۔ ٹیکنالوجی کا انسانی تہذیب کے ارتقا میں اساسی رول رہا ہے۔ ٹیکنالوجی کی مدد سے ہی انسان ہر دور میں اپنی نشوونما اور زندگی کی بقاء کے لیے ماحول سے نبرد آزما رہا۔ خاص طور پر طبعی اور حیاتیاتی وسائل کو اپنی ضرورتوں کے مطابق اپنانے میں اس نے ہمیشہ سے ہی ٹیکنالوجی سے مدد حاصل کی۔ ٹیکنالوجی کی مدد سے انسان کی یہ جدوجہد آج بھی جاری ہے۔ ٹیکنالوجی کو انسانی جسم سے ماورا ایک اور عضو انسانی سمجھا جاتا ہے۔ ٹیکنالوجی کے بغیر ہم جدید سائنس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

علم کیمیا کا عملی استعمال کیمیائی ٹیکنالوجی کہلاتا ہے جس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ کیمیائی ٹیکنالوجی کو کئی شاخوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس کی وہ شاخ جو دھاتوں کے مرکبات یا کچ دھاتوں کے حصول اور ان کی تخلیص پر عمل کرتی ہے' دھات سازی (Metallurgy) کہلاتی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں فوٹو نمبر1)

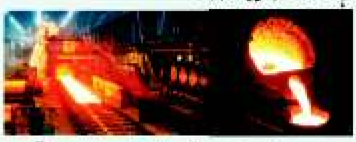

اس طرح مصنوعی طریقے سے نامیاتی اور غیر نامیاتی مرکبات کی مدد سے دھاگے کا بنانا پالیمر ٹیکنالوجی کہلاتا ہے۔ اسی پالیمر ٹیکنالوجی سے پلاسٹک اور اس سے منسلک چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ استعمال اور کیمیائی آمیزش کی بنیاد پر ریشے کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

(1) آرام دہ اور ملائم ریشہ
(2) حفاظتی ریشہ
(3) صنعتی ریشہ

(1) آرام دہ اور ملائم ریشہ :

اس میں مضبوطی کے ساتھ ساتھ کپڑا ملائم اور خوشنما ہو، اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ آرام دہ اور ملائم ریشہ بنانے میں مختلف کیمیا جیسے پالی ایسٹر (Polyester)' اکریلکس (Acrylic)' ٹیری لین (Terelene)' ایسی ٹیٹ (Acetate) اور وسکوس ریان (Viscose Rayan) خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا استعمال ہمارے لباس تیار کرنے میں ہوتا ہے۔ ان ریشوں کی خصوصیت الگ الگ ہوتی ہے۔ قیمت اور استعمال کی بنیاد پر ان ریشوں کو قدرتی ریشہ کے ساتھ ملا کر کپڑا تیار کیا جاتا ہے۔

(2) حفاظتی ریشہ

اس ریشہ کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے۔ اس ریشہ کے بنانے میں نائیلون (Nylon)' اکرلکس (Acrylics)' پالی پروپلین (Polypropylene)' پالی اتھیلین (Poly-ethylene) اور پالی ونیل کلورائڈ (Poly-vinyle cholride) خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا استعمال سیٹ کوور (Seat Cover)' ٹاٹ پٹری (Tarpaulin)' پردے اور مختلف حفاظتی کپڑے تیار کرنے میں ہوتا ہے۔

(3) صنعتی ریشہ

جو بہت ہی زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے۔ جس میں گھساؤ (Wear & Tear) بہت کم ہوتا ہے۔ پانی اور حرارت کا بھی خاص اثر نہیں ہوتا۔ بہت زیادہ ہوا کے دباؤ کو بھی برداشت کرلیتا ہے۔ ان ریشوں کا استعمال خاص طور پر ٹائرس' مضبوط اور لچکدار پائپ' یکساں مضبوط' کم وزن کی کاریں' موٹر سائیکلیں بنانے میں اور ساتھ ہی مختلف چیزوں کے بنانے میں ہوتا ہے۔ نائیلون (Nylon)' پالی پروپلین (Poly Propylene)' کاربن فائبرس (Carbon Fibres)' سیلیکون فائبر (Silicon fibre)' گلاس فائبر (Glass Fibres)' صنعتی ریشہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

ریشہ بنانے کے طریقے کو Spining کہتے ہیں۔ مصنوعی طریقے سے ریشہ بنانے کے تین طریقے ہیں۔ (ملاحظہ فرمائیں فوٹو نمبر2)

(1) Wet Spinning
(2) Dry Spinning
(3) Melt Spining

تینوں طریقوں میں پالیمر یا تو پگھلی ہوئی شکل میں یا محلول (Solution) کی شکل میں استعمال ہوتے ہیں۔ پالیمر کے اس مائع کو مخصوص دباؤ (Pressure) پر باریک سوراخوں میں سے گزارا جاتا ہے۔ ان باریک سوراخوں کو (Spinneret) کہتے ہیں۔ پالیمر ان باریک سوراخوں میں سے گزرتے ہوئے ریشوں کی شکل اختیار کرتا ہے۔ ان ریشوں کو ایک بڑی چرخی پر لپٹا جاتا ہے۔

Wet Spinning کے طریقے سے اکرلکس (Acrylics)' وسکوس ریان (Viscose Ryan) اور اسپانڈکس (Spandex) کے ریشے تیار کیے جاتے ہیں۔ Dry spinning کے طریقے سے Poly Vinyle chloride, Poly acrylonitrite اور Cellulose acetate کے ریشے تیار کیے جاتے ہیں۔

حرارت کے اثر کی بنیاد پر پلاسٹک کو دو قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔

(1) Thermoplastic
(2) Thermosetting

Thermoplastic اس قسم کے پالیمر کو بار بار

پگھلایا اور ڈھالا جاسکتا ہے۔ گرم کرنے پر پالیمر پگھل جاتا ہے اور ٹھنڈا کرنے پر یہ سانچے کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ اس کی مثال روزمرہ زندگی میں آنے والے پلاسٹک کی چیزیں ہیں جو Poly Ethylene، Poly Propylene، Poly vinyl Chloride، Polystyrene، Xylene اور Teflon جیسے پالیمر سے بنائی جاتی ہیں۔

Thermosetting وہ پالیمر ہے جسے ایک بار ڈھالنے یا شکل دینے کے بعد دوبارہ پگھلایا نہیں جاسکتا۔ اُس کی شکل نہیں بدلی جاسکتی۔ اگر Thermosetting پالیمر کو ڈھالا جارہا ہے تو اُسے گرم حالت میں ہی سانچے سے باہر نکالا جاسکتا ہے۔ اُس کی شکل نہیں بدلتی۔ لیکن Thermoplastic پالیمر کو سانچے میں ہی اچھی طرح ٹھنڈا ہونے دینا چاہیے نہیں تو اُس کی شکل بدل جاتی ہے۔

پلاسٹک کی ان گنت چیزوں کو بنانے کے لیے جدید اور خودکار طریقہ استعمال کیا جاتا ہے جسے انجکشن مولڈنگ کہا جاتا ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں فوٹو نمبر 3)

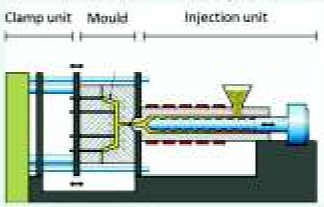

کیمیائی ٹیکنالوجی کی اگلی اہم ترین شکل انجکشن مولڈنگ (Injection Moulding) ہے۔ یہ جدید اور خودکار طریقہ کار ہے جس سے پلاسٹک کے مصنوعات تیار کیے جاتے ہیں تاکہ روز بہ روز کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کرسکیں۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ پلاسٹک دانوں یا پاؤڈر کی شکل میں مشین میں ڈالا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر مشین کے تین حصے ہوتے ہیں۔ ایک سانچہ، دوسرا برقی حرارت سے گرم کیا گیا حصہ اور تیسرا ہوتا ہے ہائیڈرولک (Hydrolic) پسٹن۔ جیسے ہی پاؤڈر کو مشین میں ڈالا جاتا ہے وہ گرم حصے میں آکر پگھلتا ہے۔ ہائیڈرولک پسٹن جس کا دباؤ تقریباً 1500 kg/cm ہوتا ہے، پگھلے ہوئے پلاسٹک کو بھرپور دباؤ سے سانچے میں ڈھکیلتا ہے۔ سانچے میں پگھلا ہوا پلاسٹک شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس طریقے سے ایک منٹ میں ہزاروں کی تعداد میں چیزیں تیار کی جاسکتی ہیں۔

اس طرح قدرتی تیل سے پٹرول، ڈیزل اور لاتعداد مرکبات کا حاصل کرنا پیٹرو ٹیکنالوجی کہلاتا ہے۔

(ملاحظہ فرمائیں فوٹو نمبر 4)۔

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ پیٹرول اور ڈیزل مرکبات میں چند تبدیلیاں لاکر اُسے بھارت۔ 4 (BS-4) اور بھارت۔ 6 (BS-6) کے پیمانے پر لایا جارہا ہے تاکہ گاڑیوں سے دھواں اور آواز کم نکلے اور بہتر Milage ملے۔

BSES یہ بھارت اسٹیج ایمیشن اسٹینڈرڈ ہے جسے حکومت ہند نے نافذ کیا ہے تاکہ ملک میں استعمال ہونے والے کیمیائی ایندھن جیسے پیٹرول اور ڈیزل کو بہتر سے بہتر بنایا جائے اور ساتھ ہی ساتھ موٹروں اور گاڑیوں میں استعمال ہونے والے انجن Internal Combushion Engines اور Spark ingnition Engines عالمی پیمانے کے ہوں جس سے ہم فضائی آلودگی کو کم کرسکیں۔

پانی کا صاف کرنا اور اُسے پینے اور استعمال کے قابل بنانا واٹر ٹیکنالوجی (Water Technology) کہلاتا ہے۔ پینے کا صاف پانی صحت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ گاؤں میں جو پانی پینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس میں بہت سارے جراثیم اور کثافتیں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ہم طرح طرح کی بیماریوں میں گھرے رہتے ہیں اور ہماری صحت ہروقت خطرے میں رہتی ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں پینے کا صاف پانی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ہم مختلف قسم کی کیمیائی ٹیکنالوجی کی مدد سے پانی کو پینے کے قابل بناسکتے ہیں۔

لکڑی اور دوسرے کیمیائی مرکبات کی مدد سے کاغذ (Paper) کا بنانا پیپر اور پلپ (Paper and Pulp) ٹیکنالوجی کہلاتا ہے۔

ربر کا ربر کے درختوں سے حاصل کرنا اور اُس میں مختلف کیمیائی مرکبات کی مدد سے ہمہ قسم کی خصوصیات کا پیدا کرنا ربر ٹیکنالوجی کہلاتا ہے۔ اُن میں خاص کر نائٹرائل ربر، بیوٹل ربر اور سلیکون ربر شامل ہیں۔

قدرتی اور مصنوعی طریقوں سے ادویات کا حاصل کرنا اور اُس سے مختلف مرکبات بنانا Medicinal اور Pharmaceutical ٹیکنالوجی کہلاتی ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ سرطان جیسے مہلک مرض کی تشخیص اور اُس کے علاج میں کیمیائی ٹیکنالوجی ایک اہم رول ادا کررہی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں فوٹو نمبر 5)۔

خوردبینی ذی حیات جیسے وائرس (Virus)، بیکٹیریا (Bacteria) اور فنگس (Fungus) کا مطالعہ اور اُن سے حاصل ہونے والے کیمیائی مرکبات کا استعمال حیاتی کیمیائی ٹیکنالوجی کہلاتا ہے۔

کیمیائی اور حیاتی کیمیائی طریقوں کے استعمال سے انسان میں امراض کے مطالعہ کرنے کا نام کلینیکی حیاتی کیمیا ہے۔ اس سے امراض کا پتہ لگانے، تشخیص، علاج اور روک تھام (انسداد) میں مدد ملتی ہے۔

خون، پیشاب، دماغی نخاعی مائع اور چند بافتوں (Tissues) کو کیمیائی تجزیہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پیشاب میں گلوکوز کا پایا جانا ذیابیطس کی نشاندہی کرتا ہے۔ خون کی چربی کا تجزیہ اور خون میں پروٹین کی علاحدگی قلب کی چند بیماریوں اور گٹھیا کی تشخیص میں مددگار ہوتی ہے۔ پیشاب کا تجزیہ گردوں کی حالت کو ظاہر کرتا ہے۔

خون اور پیشاب میں خامروں کا تعین کلینیکی حیاتی کیمیا کا ایک اہم جز بن گیا ہے۔ پولیو میلائٹس اور عضلاتی نقص سے متاثرہ اشخاص میں مرتکز حالت میں الڈولس (Aldolase) خامرہ پایا جاتا ہے۔ ٹیکنالوجی کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر دور میں بدلتی رہتی ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہماری زندگی میں کیمیائی ٹیکنالوجی کا بہت بڑا دخل ہے جس سے ہم دانستہ یا غیر دانستہ طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ اس کیمیائی ٹیکنالوجی نے کیمیات کا استعمال کرکے ٹیکنالوجی کی مدد سے ہمارے لیے وہ آسانیاں پیدا کیں جس سے نہ صرف ہماری زندگی آسائش سے پر ہوگئی بلکہ بہت سی آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ لیکن ہمیں اس بات کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے کہ ان کیمیات کا استعمال ہم صحیح طریقے سے کریں ورنہ بھوپال گیس سانحہ کو دوبارہ وقوع پذیر ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ اللہ تعالٰی کی عطا کردہ اس نعمت یعنی کیمیائی ٹیکنالوجی کو صحیح طور پر استعمال کرکے معیاری، کفایت شعار، آسان، صحت مند اور مسائل سے پاک زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

■

Dr. Mohammad Asif
(Dept. of Chemistry)
Maulana Azad College of Science, Commerce & Arts, Dr. Rafiq Zakaria Campus,
Aurangabad 431001 (M.S.)
Mobile: 9960417576
E-mail : asif67.k@gmail.com

ریویو اور ویو
(Review and View)

کسی لفظ کا غیر ملکی زبان میں ترجمہ دیکھنے کا ایک دوسرا دلچسپ متبادل بھی ہے۔ Research بٹن کے بغل میں دیے گئے Translation Screen Tip بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے اور مطلوبہ زبان چنیے۔ ایسا کرنے کے بعد آپ اپنی دستاویز کے

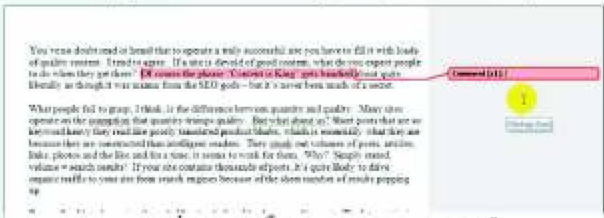

تصویر WD-9.9: لفظ 'Direction' کا انگریزی سے فرنچ میں ترجمہ

جس لفظ پر بھی ماؤس پوائنٹر لا کر ایک لمحہ کے لیے رکیں گے، اس کا مطلوبہ غیر ملکی زبان میں ترجمہ فوراً اسکرین پر نمایاں ہو جائے گا۔ تصویر WD-9.9 میں لفظ 'Direction' کا فرانسیسی (فرنچ) زبان میں ترجمہ دکھایا گیا ہے۔

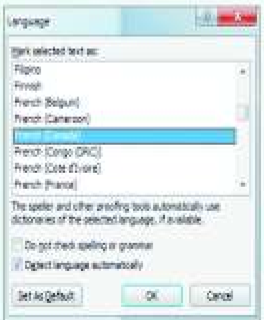

تصویر WD-9.10: زبان سیٹ کرنے کے لیے ڈائیلاگ باکس

(v) زبان سیٹ کرنا (Setting Language):
ایم ایس-ورڈ میں آپ اپنی دستاویز کی زبان بھی سیٹ کر سکتے ہیں۔ ورڈ کی دستاویزوں کی ڈیفالٹ زبان English (U.S)، یعنی امریکی انگریزی ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں عموماً English (UK)، یعنی برطانوی انگریزی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ دونوں زبانوں میں معمولی فرق ہوتا ہے، اس لیے ورڈ کبھی کبھی آپ کی صحیح اسپیلنگ کو بھی غلط بتاتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ نے 'کلر' لفظ کی اسپیلنگ 'Colour' ٹائپ کی ہے، تو ورڈ اسے غلط مانے گا، کیونکہ امریکی انگریزی میں 'کلر' کی صحیح اسپیلنگ 'Color' ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ایم-ایس ورڈ زبان سیٹ کرنا مفید رہتا ہے۔

زبان سیٹ کرنے کے لیے Thesaurus بٹن کے بغل میں دیے گئے Set Language بٹن پر کلک کیجیے۔ اس سے Language ڈائیلاگ باکس تصویر WD-9.10 کی طرح کھلتا ہے۔ آپ ڈائیلاگ باکس میں دی گئی زبانوں میں سے پسندیدہ زبان پر کلک کیجیے اور اس کے بعد OK بٹن پر کلک کیجیے۔ زبان سیٹ ہو جائے گی۔ اگر آپ ورڈ کی ڈیفالٹ زبان چاہتے ہیں، یعنی پسندیدہ زبان ورڈ کی سبھی دستاویزوں کے لیے سیٹ کرنا چاہتے ہیں، تو Language ڈائیلاگ باکس میں پسندیدہ زبان چن کر OK بٹن کے بائیں طرف دیے گئے Default بٹن پر کلک کیجیے۔ ڈیفالٹ زبان بدلنے سے پہلے کمپیوٹر آپ سے اجازت مانگے گا۔ Yes بٹن پر کلک کیجیے اور پھر OK بٹن پر کلک کیجیے ڈیفالٹ زبان بدل جائے گی۔

(vi) لفظوں کا شمار (Word Count):
اپنی دستاویز میں الفاظ کی کل تعداد جاننے کے لیے صرف Set Language بٹن کے نیچے دیے گئے Word Count بٹن پر کلک کیجیے۔ اس سے ایک چھوٹا ڈائیلاگ باکس تصویر WD-9.11 کی طرح کھل جائے گا، جس میں دستاویز کے کل صفحات، الفاظ، کل حروف (اسپیس سمیت)، کل پیراگراف اور کل سطریں دی ہوں گی۔ اس ڈائیلاگ باکس کو بند کرنے کے لیے Close بٹن پر کلک کیجیے۔

تصویر WD-9.11: لفظوں کے شمار کا ڈائیلاگ باکس

دستاویز کے ویو (Views of the Document)

ایم ایس-ورڈ میں آپ کی دستاویز کو اسکرین پر کئی طرح سے دکھایا جاتا ہے، جس سے آپ کو اپنا کام دیکھنے اور تیزی سے کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اس کے لیے ربن میں دیے گئے ویو (View) ٹیب کا استعمال کیا جاتا ہے۔ View ٹیب تصویر WD-9.12 کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

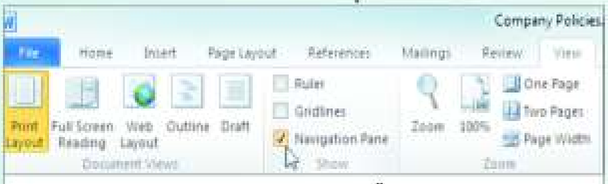

تصویر WD-9.12: ویو ٹیب

اس ٹیب میں دیے گئے بٹنوں اور آپشنز کے ذریعے آپ متعدد کام کر سکتے ہیں، جیسے دستاویز کے الگ الگ ویو دیکھنا، ونڈو میں مختلف عناصر (Elements) کو دیکھنا، دستاویز کو زوم کرنا، دو یا زیادہ ورڈ ونڈو کو الگ الگ طریقے سے دیکھنا وغیرہ۔ ان سبھی بٹنوں کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(i) دستاویز کے الگ الگ ویو (Different Views): ایم ایس-ورڈ میں درج ذیل ویو دستیاب ہیں:

- **پرنٹ لے آؤٹ ویو (Print Layout View)**
- **فل اسکرین ریڈنگ (Full Screen Reading)**
- **ویب لے آؤٹ ویو (Web Layout View)**
- **آؤٹ لائن ویو (Outline View)**
- **ڈرافٹ ویو (Draft View)**

پرنٹ لے آؤٹ میں اسکرین کاغذ کی طرح دکھائی دیتی ہے، یعنی ٹھیک ویسی ہی دکھائی دیتی ہے، جیسی چھاپنے پر دستاویز دکھائی دے گی۔ فل اسکرین ریڈنگ ویو میں آپ کی دستاویز پوری اسکرین پر دکھائی دیتی ہے اور اس میں آپ کو پڑھنے کے لیے زیادہ جگہ ملتی ہے۔

ویب لے آؤٹ ویو میں اسکرین ویب سائٹ کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ اس میں آپ کے ذریعے ٹائپ کیا گیا مواد، تصویر وغیرہ ٹھیک اسی طرح دکھائی دیتے ہیں، جیسے کہ آپ نے تیار کیے تھے لیکن ضروری نہیں ہے کہ وہ اسی طرح چھاپے بھی جائیں۔

آؤٹ لائن ویو میں آپ تمام دستاویز یا صرف ابواب یا ذیلی ابواب وغیرہ کے نام دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں کسی کتاب یا دستاویز کا خاکہ آسانی سے بنایا جا سکتا ہے۔ ڈرافٹ ویو میں دستاویز ایک ڈرافٹ کی شکل میں دکھائی دیتی ہے، جسے آپ تیزی سے پڑھ اور ایڈٹ کر سکتے ہیں۔ اس میں دستاویز کے کچھ عنصر، جیسے ہیڈر-فوٹر وغیرہ دکھائی نہیں دیتے۔

اوپر بتائے گئے سبھی ویو آپشن View ٹیب کے Document Views حصہ میں موجود ہیں۔ ویسے ان کے لیے اسکرین کے نچلے دائیں کونے پر بٹن بھی بنے ہوتے ہیں۔ اس میں کسی پر بھی کلک کر کے آپ دستاویز کا اپنی خواہش کے مطابق ویو دیکھ سکتے ہیں۔

(ii) ونڈو کے عناصر (Elements of Window): View ٹیب کے show/Hide حصہ میں متعدد چیک باکس ہوتے ہیں، جنھیں چیک یا اَن چیک کر کے آپ ونڈو کے مختلف عناصر دیکھ سکتے ہیں یا غائب کر سکتے ہیں۔ دستیاب عناصر درج ذیل ہیں:

- **رولر (Ruler)**
- **جالی دار لکیریں (Gridlines)**
- **دستاویز نقشہ (Document Map)**
- **تھمبنیل (بہت چھوٹی علامتی تصویر) (Thumbnails)**

Rulers چیک باکس میں کلک کرنے سے ونڈو میں رولر نمودار ہو جاتے ہیں، جن

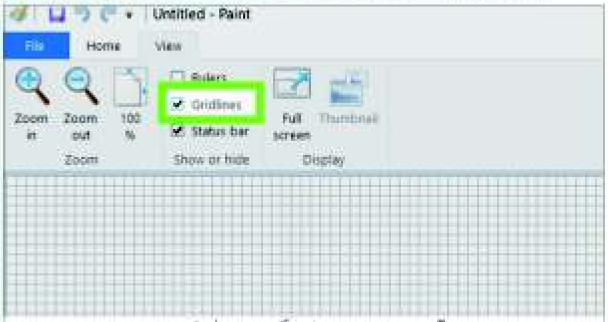

تصویر WD-9.13: جالی دار لکیریں ڈالنے کے بعد دستاویز

کی مدد سے آپ دستاویز میں ٹیب، حاشیہ، انڈینٹ وغیرہ سیٹ کر سکتے ہیں۔

Gridlines چیک-باکس میں کلک کرنے سے پوری دستاویز میں جالی دار لکیریں تصویر WD-9.13 کی طرح آ جاتی ہیں۔ آپ اپنی دستاویز میں جوڑے ہوئے عنصر، جیسے تصویر، جدول وغیرہ کو ان لکیروں کی سیدھ میں لا سکتے ہیں۔

Document Map چیک-باکس میں کلک کرنے پر آپ کی دستاویز یا نقشہ تصویر WD-9.14 کی طرح آپ کی ورڈ ونڈو میں بائیں جانب دکھائی دیتا ہے۔ اس نقشہ سے دستاویز کی سرخی، ذیلی سرخی وغیرہ ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے آپ فوراً دستاویز کے موضوع کے بارے میں جان سکتے ہیں۔

تصویر WD-9.14: دستاویز کا نقشہ

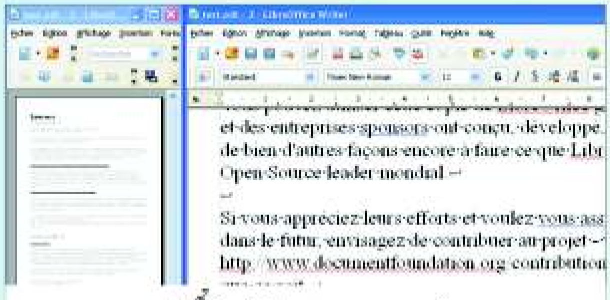

تصویر WD-9.15: دستاویز میں صفحات کے تھمبنیل

Thumbnails چیک باکس میں کلک کرنے پر آپ کی دستاویز کے سبھی صفحات کے خاکہ کہ ونڈو میں بائیں طرف دکھائی دیتے ہیں۔ ان پورنا کے ذریعے آپ سبھی صفحات کا خاکہ دیکھ سکتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر کسی بھی خاکہ کو کلک کر کے وہ صفحہ کھول سکتے ہیں۔

(iii) زومنگ (Zooming): ربن کے ویو ٹیب میں Zoom حصہ آپ کو دستاویز اسکرین پر چھوٹا یا بڑا کر کے دیکھنے کی سہولت عطا کرتا ہے۔ زومنگ کرنے سے دستاویز کی چھپائی کے سائز پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، یہ صرف اسکرین پر دکھانے کی سہولت کے لیے ہے۔

تصویر WD-9.16: ویو ٹیب میں زوم آپشن

View ٹیب کے Zoom حصہ میں Zoom بٹن پر کلک کرنے سے زوم ڈائیلاگ باکس کھلتا ہے، جس میں آپ کو زومنگ کے کئی آپشن دکھائی دیتے ہیں۔ زوم ڈائیلاگ باکس کے بارے میں ہم باب-2 میں تفصیلی معلومات فراہم کر چکے ہیں۔

اگر آپ کو اپنی دستاویز اصل سائز سے بڑی یا چھوٹی دکھائی دے رہی ہے اور آپ اسے اصل سائز (100%) میں دیکھنا چاہتے ہیں، تو Zoom بٹن کے بغل میں دیے گئے

100%) بٹن پر کلک کریں۔ دستاویز فوراً 100% سائز میں دکھائی دے گی۔

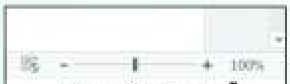

تصویر WD-9.17: زوم سلائڈر

100% بٹن کے بغل میں تین چھوٹے بٹن دیے گئے ہیں۔ Two Pages, One Page اور Page Width، جن پر کلک کرکے آپ دستاویز کا بالترتیب ایک صفحہ، ساتھ ساتھ دو صفحات اور ایک پورا صفحہ بائیں اور دائیں کناروں سمیت دیکھ سکتے ہیں۔

زومنگ کے لیے آپ اپنی اسکرین میں دائیں کونے پر دیے گئے زوم سلائڈر کا بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ سلائڈر کے درمیان کے کانٹے کو ماؤس پوائنٹر کے ذریعے پکڑیے اور اسے دائیں یا بائیں طرف کھینچیے۔ دائیں طرف کھینچنے پر دستاویز کا سائز حقیقی سائز سے بڑا اور بائیں طرف کھینچنے پر چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔

(iv) متعدد ونڈوز (Multiple Windows): آپ کمپیوٹر میں متعدد دستاویز کھول سکتے ہیں، لیکن ایک بار میں صرف ایک پر ہی کام کرسکتے ہیں۔ آپ جس دستاویز کا کام کرتے ہیں، وہی آپ کی اسکرین پر کھلا ہوتا ہے، دیگر سبھی دستاویز ٹاسک بار میں Minimize ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ آپ ایک بار میں صرف ایک دستاویز پر کام کرسکتے ہیں۔ ربن کے View ٹیب میں Window حصہ میں دیے گئے بٹنوں کے ذریعے آپ ورڈ ونڈوز کو الگ الگ طرح سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس حصہ میں دیے گئے New Window بٹن پر کلک کرکے آپ کھلی ہوئی دستاویز کو ایک نئی ونڈو میں دیکھ سکتے ہیں۔ New Window کے نیچے دیے Arrange All بٹن پر کلک کرکے آپ کمپیوٹر میں کھلی ہوئی سبھی دستاویزوں کو اسکرین پر ارینج کیا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ اس بٹن پر کلک کرنے سے اسکرین تصویر WD-9.18 کی طرح دکھائی دیتی ہے۔

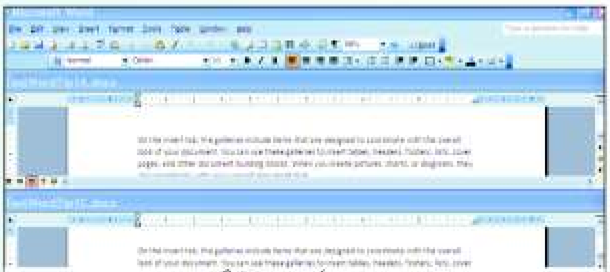
تصویر WD-9.18: اسکرین پر ارینج کی گئی دستاویز

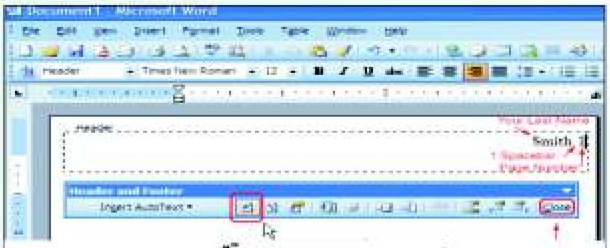

تصویر WD-9.19: دو آزاد ونڈوز میں تقسیم دستاویز

Split بٹن پر کلک کرنے سے آپ کا ماؤس پوائنٹر ایک لمبی لائن (Split) میں بدل جاتا ہے۔ آپ پوری دستاویز جہاں بھی کلک کریں گے، دستاویز اسی جگہ سے دو آزاد ونڈوز میں تقسیم ہوجائے گی۔ اس کے ذریعے آپ دستاویز کے دو حصے ایک ساتھ الگ الگ ونڈو میں تصویر WD-9.19 کی طرح دیکھ سکتے ہیں۔

دستاویز میں لسٹ ڈالنے پر View ٹیب میں Window حصہ کے Split بٹن کی جگہ پر Remove Split بٹن آجاتا ہے، جس پر کلک کرکے آپ دستاویز سے اسپلٹ ہٹا سکتے ہیں۔

اگر آپ دو دستاویزوں کو ساتھ ساتھ دیکھنا چاہیں، تو New Window بٹن کے بغل میں دیے گئے چھوٹے View Side by Side بٹن پر کلک کریں۔ اس سے کھلی ہوئی دستاویز آپ کی اسکرین پر تصویر WD-9.20 کی طرح ساتھ ساتھ دکھائی دے گی۔

تصویر WD-9.20: ایک ساتھ دو دستاویز کھولنا

جیسا کہ آپ تصویر میں دیکھ سکتے ہیں، ایسا کرنے پر ٹیب کے سبھی اہم حصے سکڑ جاتے ہیں۔ ان میں چھپے کسی بٹن پر کلک کرنے کے لیے آپ کو اس حصہ کے تیر کے نشان پر کلک کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر آپ اپنی اسکرین کو اسکرول کرتے ہیں، تو آپ کی ساتھ ساتھ کھلی ہوئی دستاویز ایک ساتھ ہی اسکرول ہوتی ہیں۔ دستاویز کو الگ الگ اسکرول کرانے کے لیے کھلی ہوئی کسی بھی دستاویز کے Window بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے۔ اس سے ایک چھوٹا مینو، جس میں Window حصہ کے آپشن ہیں، تصویر WD-9.21 کی طرح کھلتا ہے۔ ان آپشنز میں سے Synchronous Scrolling بٹن پر کلک کیجیے۔ اب آپ دستاویزوں کو الگ الگ اسکرول کرسکتے ہیں۔

Window بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کرنے پر کھلنے والے مینو میں Rest Window Position آپشن پر کلک کرنے سے کھلی ہوئی دو ورڈ ونڈوز اسکرین پر ری سیٹ ہوجاتی ہیں، یعنی بائیں طرف کھلی ہوئی ونڈو دائیں طرف، اور دائیں کھلی ہوئی ونڈو بائیں طرف چلی جاتی ہے۔

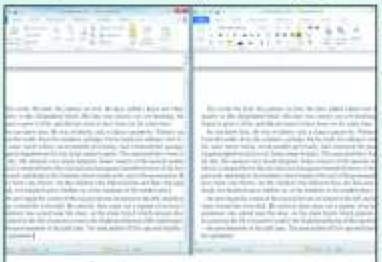
تصویر WD-9.20: ایک ساتھ دو دستاویز کھولنا

اگر آپ دستاویز کو پہلے کی طرح پوری اسکرین پر دیکھنا چاہیں، تو ٹائٹل بار کے دائیں کونے میں دیے گئے X بٹن کے بائیں طرف دیے گئے Maximize بٹن پر کلک کیجیے۔

مان لیجیے، آپ کے کمپیوٹر میں تین دستاویز کھلی ہوئی ہیں اور ایک ایکٹو ہے، یعنی آپ کی اسکرین پر دکھائی دے رہی ہے اور بقیہ دو ٹاسک بار میں Minimized ہیں۔ ان Minimized دستاویزوں میں سے کس کو ایکٹو کرنے کے لیے ربن میں View ٹیب کے Window حصہ میں Switch Windows کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے۔ اس سے ایک چھوٹا مینو تصویر WD-9.22 کی طرح کھلتا ہے، جس میں کمپیوٹر میں کھلی ہوئی دستاویزوں کی فہرست دکھائی جاتی ہے۔ آپ فہرست میں سے مطلوبہ دستاویز کے نام پر کلک کرکے اسے ایکٹو کرسکتے ہیں۔

تصویر WD-9.22: ایک دستاویز سے دوسری دستاویز میں جانا

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس، F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

جوامع الحکایات و لوامع الروایات (جلد اوّل)

مؤلف: سدیدالدین محمد عوفی، مترجم: غلام سرور
صفحات: 275، قیمت: 155 روپے
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال
N-93، ٹاپ فلور، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ 110025

پیش نظر کتاب 'جوامع الحکایات ولوامع الروایات' فارسی ادب کی ایک بے مثال اور منفرد وشاہکار تصنیف ہے۔ اس کے مؤلف سدیدالدین محمد عوفی ہیں۔ عوفی کثیر الجہات اور معتبر مصنفین و مؤلفین کی صف میں اپنا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی چار معرکہ آرا کتابیں ہر زمانے میں اہل علم کی پسند رہی ہیں۔ وہ 'لباب الالباب'، 'الفرج بعد الشدۃ'، 'جوامع الحکایات ولوامع الروایات' اور 'مدائے السلطان' ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے مختلف شہرۂ آفاق کتابوں سے حکایتیں منتخب کرکے جمع کی ہیں اور پھر موضوع کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی کے بعد کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے بعض حکایات کے ماخذ بھی قلم بند کیے ہیں، جن سے ان کی اہمیت مزید دو چند ہوگئی ہے۔ انھوں نے مختلف پیغمبروں، صحابۂ کرامؓ، بزرگوں اور بادشاہوں، وزیروں اور امیروں کے تذکرے حکایات کے پیکر میں اُتار کر اس طرح پیش کیے ہیں کہ ان سے ایک سبق بھی ملتا ہے۔ ان حکایات میں جگہ جگہ تاریخی شواہد بھی مل جاتے ہیں، جن سے ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

یہ کتاب اگر ایک جانب سیرت پر مبنی ہے تو دوسری جانب تاریخ اور اخلاق سے بھی مزین ہے۔ اس کتاب میں اگر ایک جانب سیاسیات پر روشنی ڈالی گئی ہے تو دوسری جانب عمرانیات کے پہلو کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی فلسفہ بھی اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ اسی لیے اس کتاب کو ایک صحتمند اور خوشحال معاشرہ کی تشکیل کے لیے اہم قرار دیا گیا ہے۔

اس کتاب کے مترجم ڈاکٹر غلام سرور ہیں، جو مولانا آزاد کالج کولکاتا کے شعبۂ فارسی میں درس وتدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کے ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اردو کا حسن برقرار رکھتے ہوئے، چھوٹے چھوٹے سادہ جملوں اور عام فہم زبان کے ذریعے حکایات کو ایسا جامہ پہنایا ہے جو دلوں کو اپنی جانب راغب کرنے میں کامیاب ہے۔ مترجم کا یہی انداز ہے جو ترجمہ کو صرف ترجمہ نہیں رہنے دیتا، بلکہ ایک باقاعدہ تصنیف کی شکل فراہم کرتا ہے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں معرفت الٰہی کا بیان ہے، جس کے تحت دنیا میں بت پرستی کا آغاز، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان مناظرہ، فرعون کی حماقت اور ابلیس کی سرزنش، خدا کی ہستی کا بین ثبوت، انسان کی بے بسی اور فہم قرآن اور ہدایت وغیرہ حکایتیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ دوسرے باب میں "معجزات انبیا علیہم السلام کا بیان ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ کے معجزات، حضرت عیسیٰ کی فراست، چاہ زمزم کی کھدائی، چھپکلی کا کلمۂ شہادت پڑھنا، سراقہ کے گھوڑے کا زمین میں دھنسنا اور غیبی آندھی سے اہل کفار میں افراتفری مضامین متوجہ کرتے ہیں۔ تیسرے باب میں کرامت اولیا کا بیان ہے۔ اس باب میں حضرت عمرؓ کا خط دریائے نیل کے نام، لقمۂ حلال کی تاثیر، عیب پوشیدہ رکھنے پر خدا کا انعام اور دیگر صحابہ اور بزرگوں کی سبق آموز حکایتیں ہیں۔

چوتھے باب میں ممالک عرب وعجم کے حکمرانوں کا بیان ہے۔ اس باب میں طہمورث کا عہد اور اقتصادی ترقی، ضحاک کے ہاتھوں جمشید کی شکست، ضحاک اور اس کے دوناگوں کا قہر ہندوستان پر سکندر کا تسلط اور اس کی موت، نوشیرواں کا عہد زریں اور پرویز کے عہد میں مال ومتاع کی فراوانی وغیرہ نے متاثر کیا۔

ان سب واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب صرف حکایتوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ بے شمار تاریخی واقعات وحادثات کا ایک آئینہ بھی ہے۔ اس کتاب کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ عوفی نے کئی جگہوں پر اپنی زندگی کے مختلف گوشوں کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ یہ فارسی ادب کا ایک بے مثل اور منفرد تجربہ ہے، جس کو غلام سرور نے اپنے دلنشیں ترجمہ سے مزید کارآمد بنادیا ہے۔

یقین ہے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی یہ پیشکش نہ صرف اہل علم کے یہاں قبولیت سے نوازی جائے گی، بلکہ عام قارئین کے لیے بھی مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔

علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات

مصنف: خوشتر نورانی

صفحات: 248، قیمت: 110 روپے، دوسری طباعت: 2019

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر غلام اشرف قادری (صدر شعبۂ فارسی)

جی ایف کالج، شاہجہاں پور۔ 242001 (یوپی)

'علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات' خوشتر نورانی کی غیر معمولی تحقیق اور سادہ تنقید کا نتیجہ ہے جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے طبع کیا ہے اور میرے سامنے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن موجود ہے جسے 2019 میں شائع کیا گیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن 2013 میں اسی ادارہ یعنی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہوا تھا۔ 248 صفحات پر مبنی اس کتاب میں ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا پیش لفظ فہرست مندرجات سے قبل شامل ہوا ہے۔ فہرست کے بعد خوشتر نورانی کی اپنی بات 'اظہاریہ' کے عنوان سے درج ہے جس میں 1857 کے حالات اور سیاسی سرگرمیوں کا تعارف کراتے ہوئے معاونین کا تفصیل سے شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ معین الدین عقیل، صدر شعبۂ اردو انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد نے مقدمہ لکھا ہے۔ 'تاثرات و جائزے' کے عنوان سے اردو کے کئی نامور محققین اور ناقدین کی آرا مختصر طور پر شامل کتاب ہے۔ ساتھ ہی دو معروف رسالوں میں شائع شدہ تبصروں کو بھی اختصار کے ساتھ جگہ دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد ہی یہ آرا قارئین تک آئی ہوں گی۔ پھر باضابطہ طور پر علامہ فضل حق خیرآبادی کے حالات زندگی، آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں علمی وادبی، شرعی شراکت اور تاریخی اتھل پتھل کے ساتھ قید و بند کی صعوبتوں کا بیان غرض مہد سے لحد تک کی تفصیلات کو بڑے معتبر اور مستند طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ پھر دونوں قصائد رائیہ اور نونیہ کو جگہ دی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ:

''حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی اور 1857 کے معرکے میں ان کے کردار کے بارے میں آپ نے حرف آخر لکھ دیا ہے۔''

حکیم سید محمد احمد برکاتی نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''میں نے بار بار پڑھا ہے اور خوشتر صاحب کی سعی بلیغ پر جھوم گیا ہوں۔''

خواجہ رضی احمد، سابق ڈائریکٹر قائداعظم اکیڈمی، کراچی نے خوشتر نورانی کی اس کتاب کو زبردست کارنامہ گردانتے ہوئے ایک طویل جملہ لکھا ''..... محترم خوشتر نورانی نے جدید تحقیقی اصولوں کی روشنی میں مستند تاریخی مواد، دستاویزی ذخائر، بنیادی تفصیلات اور غیر مظاہر اندرجات کا نہایت نکتہ سنجی اور تاریخی بصیرت سے تجزیہ اور تعاقب کر کے پیش نظر کتاب میں علامہ خیرآبادی کی جو سچی اور حقیقی تصویر پیش کی ہے وہ یقیناً ان کا شاندار کارنامہ ہے۔''

علامہ فضل حق خیرآبادی ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ 1857 میں تحریک آزادی کی باضابطہ شروعات ہوئی۔ اس معرکۂ ستاون میں عملی اور فکری طور پر دوسرے آزادی خواہاں کے ساتھ مولانا کی شرکت سے تحریک میں جوش و سرعت آئی۔ نمایاں کردار ادا کرنے کی وجہ اور انگریزوں کی نظر میں کھٹکنے کے سبب بارہا ایک شہر سے دوسرے شہر کا رخ کرنا پڑا اور کئی بار قید و بند کی صعوبتوں کے بعد جزیرۂ انڈمان میں قید کر دیے گیے جہاں ان کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ تحریک آزادی کے حوالے سے مورخین نے مولانا فضل حق خیرآبادی کو بہت اچھی جگہ نہیں دی۔ ان کے ادبی وشعری کارناموں کو محققین و ناقدین نے سراہا تو لیکن جس طرح تلاش اور دیدہ ریزی کی ضرورت تھی اس میں سستی اور صرف نظری سے کام لیا گیا۔ بعض محققین و ناقدین نے مولانا خیرآبادی کی تصویر کشی میں بعض معتبر رنگوں کا استعمال نہیں کیا اور بعض جگہ شک و شبہات کی اس قدر لکیریں کھینچ دی گئیں کہ وہ تصویر غیر واضح رہ گئی بعد میں خوشتر نورانی جیسے مصوروں نے صحیح تصویر پیش کی۔

اس کتاب میں 'قصیدۂ رائیہ اور نونیہ چند حقائق' کے عنوان سے ایک باب شامل ہے۔ ان دونوں قصائد کی فراہمی سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق خیرآبادی اپنی شروعاتی زندگی سے ہی انگریزوں سے متنفر رہے اور کسی بھی قیمت پر انہیں ہندوستان میں ان کا وجود قابل قبول نہ تھا۔ قصیدہ نونیہ مولانا کی جدوجہد اور جنگ آزادی میں پرجوش شرکت کی تفصیل ہے۔ اس قصیدہ میں تحریک آزادی سے متعلق جو تاریخی اطلاعات کی جمع آوری ہے وہ بہت اہم ہے۔ بطور باغی اسی قصیدہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کی گرفتاری کے لیے انگریزوں نے انعام کا اعلان کیا تھا۔ خوشتر نورانی کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ موصوف کے دونوں قصائد جو عربی میں ہیں ان میں رائیہ کو عربی میں اور نونیہ کو مع اردو ترجمہ اس کتاب میں جگہ دی ہے۔ اس ترجمہ سے پہلے ان قصائد پر روشنی ڈالتے ہوئے بے شمار تاریخی شواہد کو اجاگر کیا ہے۔ واضح رہے کہ مولانا ایک زبردست شاعر تھے، ان کے عربی میں چودہ قصائد ہیں۔ یہ سوا سال کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

خوشتر نورانی نے 'مرکز علم وفن خیرآباد کی سیر' کے عنوان سے ایک باب شامل کیا ہے جس میں مولانا کی تصانیف اور ان کے نام پر خیرآباد و دیگر اماکن میں موجود چوک چوراہوں کی تفصیل ہے۔ الغرض یہ کتاب 'علامہ فضل حق خیرآبادی چند عنوانات' یقیناً اردو تحقیق کا شاہکار ہے اور اس شاہکار نے علامہ فضل حق خیرآبادی کے حالات زندگی اور فکری و قلمی آثار کے بیانات میں صداقت سے کام لیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہ کتاب اس موضوع پر حرف آخر ہے مگر تحقیق و تنقید میں حرف آخر کی کوئی گنجائش نہیں۔ ■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، قانون، فنون لطیفہ، فلسفہ، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

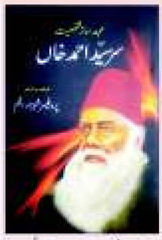

عہد ساز شخصیت: سر سید احمد خاں

مرتب: پروفیسر شہزاد انجم

صفحات: 784، قیمت: 800 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ثاقب عمران، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

سر سید احمد خاں کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں اور نہ ہی ان کی شخصیت اور علمی، ادبی، سیاسی نیز معاشرتی کارناموں کا احاطہ کرنے والی تحریروں کا کوئی حساب ہے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری وساری ہے۔ سرسید پر موجود متعدد کتابوں اور تحریروں کے درمیان نومبر 2019 میں زیرِ تبصرہ کتاب منظر عام پر آئی ہے۔ مضامین کی فہرست پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کتاب کے تیسرے صفحے پر عنوان کی سرخی سے پہلے یہ تحریر درج ہے۔ ''مدبر، مفکر، مصلح اور بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ/ سرسید کی دوسوویں یوم پیدائش پر خصوصی پیش کش۔'' جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب 2017 میں ہی شائع ہونی تھی۔ مرتب نے اس کے متعلق اپنے مقدمے میں بھی ذکر کیا ہے۔ بعض وجوہات کی بنا پر کتاب ذرا دیر سے شائع ضرور ہوئی ہے لیکن کتاب کا مطالعہ تمام طرح کے گلے شکوے دور کرنے کے لیے کافی ہے۔ کہنے کو تو ترتیب کے کام کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی ہے لیکن یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ کام کس نوعیت کا ہے۔ زیرِ تبصرہ جیسی کتاب تیار کرنے میں کس عرق ریزی اور جگر کاوی کی ضرورت پڑتی ہے، اس کا اندازہ ان لوگوں کو ضرور ہوگا جو اس طرح کا کام انجام دینے کی ہمت رکھتے ہیں۔ برسوں کی ریاضت کے بعد اس طرح کی کتاب سامنے آتی ہے جسے بلا چوں چرا ایسی کتابوں کے سامنے رکھا جا سکتا ہے جنھیں اول درجے کی کتاب ہونے کا شرف بخشا گیا ہو۔

کتاب میں شامل پچاس مضامین کو چھ عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے جو اس طرح ہیں (1) سرسید احمد خاں: سوانح اور شخصیت (2) علمی، ادبی اور دینی خدمات (3) افکار و نظریات (4) سرسید احمد خاں اور علی گڑھ (5) تعلیم، تاریخ، تہذیب، ثقافت (6) سرسید احمد خاں کی معنویت اور ضرورت۔ ان چھ عنوانات کے علاوہ 'باب نظم' مستزاد ہے جس میں سترہ نظمیں اور ایک قطعہ شامل ہے۔

کتاب کے مرتب پروفیسر شہزاد انجم نے ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا جو 35 صفحات پر محیط ہے۔ درج بالا عنوانات کے مطالعے سے یہ بات تو سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ان عنوانات کے تحت کس طرح کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ سرسید پر لکھی گئی ہزارہا تحریروں میں سے ان تحریروں کا انتخاب کس طرح کیا۔ مرتب نے بھی مقدمہ میں اس جانب اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''میرے لیے یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا کہ اتنے اچھے مضامین کے درمیان، چند مضامین کا انتخاب کیسے کروں؟'' وہ مزید لکھتے ہیں کہ ''سرسید پر جہاں کہیں جو کچھ فراہم ہوا میں نے اسے سمجھنے کی کوشش کی۔ میں نے اندازہ یہ کیا کہ سرسید کے تعلق سے ایک ایسی مربوط کتاب کی ضرورت ہے جس کے مطالعے سے سرسید کی زندگی اور ان کے کارناموں کے مختلف گوشے عیاں ہو جائیں۔'' یہاں کتاب میں شامل تمام مضامین پر گفتگو کرنے کے بجائے صرف ایک دو مضمون کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ کتاب کا پہلا مضمون 'توقیت سرسیدؒ' کے عنوان سے ہے جس کے مصنف ڈاکٹر سلطان احمد ہیں۔ اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے سرسید کی سوانح قلم بند کرنے کے لیے سنین کو ذیلی سرخی بنا کر مضمون کی عمارت قائم کی ہے۔ اسی طرح اگر سرسید کا ذکر آئے اور الطاف حسین حالی کی کتاب 'حیات جاوید' کا ذکر نہ ہو، ممکن نہیں۔ کتاب میں شامل دوسرا مضمون 'حیات جاوید' کا مقدمہ ہے۔ حالی کی اس تحریر سے سرسید سے ان کی محبت پھوٹی پڑتی ہے۔ مرتب نے اس تعلق سے لکھا ہے کہ 'حالی کے دیباچے کا ایک ایک جملہ فکر انگیز، معنی خیز اور سرسید شناسی کے تعلق سے بے حد اہم ہے۔ 'فلیپ پر موجود سرسید کی تحریر ''میں نے یہ درس گاہ کیوں قائم کی؟'' بہت اہم ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلق سے اُٹھنے والے بہت سے سوالات کا جواب سرسید کی اس تحریر میں موجود ہے۔ انھوں ہندوستان میں رہنے والے ہندو اور مسلمانوں کو دو بھائیوں کی شکل میں دیکھا اور ان کی تعلیم وتربیت کے لیے نہ صرف سعی کی بلکہ فکر مند بھی رہے۔

بہر حال کتاب میں درج بالا مضامین کے علاوہ جواہر لال نہرو، محمد اسماعیل پانی پتی، خلیق احمد نظامی، شبلی نعمانی، سید عبداللہ، فرمان فتح پوری، غلام رسول مہر، مولوی عبدالحق، سید عابد حسین، رشید احمد صدیقی، سید احتشام حسین کی تحریروں کے علاوہ دورِ حاضر کے اہم محقق اور نقادوں کی تحریریں شامل ہیں جو کتاب کی زینت بڑھاتی ہیں۔

مختصراً صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ زیرِ تبصرہ کتاب مرتب کے خواب کی تعبیر ہے جس کے لیے وہ ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس اہم کتاب کے منظر عام پر آنے سے نہ صرف سرسید کے چاہنے والوں کو ایک جگہ اتنی اہم تحریریں پڑھنے کو مل جائیں گی بلکہ اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبا وغیرہ کے لیے بھی یہ کتاب سود مند ثابت ہوگی۔ کتاب کی طباعت دیدہ زیب اور اس کی قیمت مناسب ہے۔ امید ہے کہ علمی حلقوں میں اس کی پذیرائی بھی ہوگی اور اسے حوالے کی کتاب کی شکل میں بھی دیکھا جائے گا۔

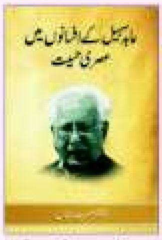

عابد سہیل کے افسانوں میں عصری حسیّت

مصنفہ: ڈاکٹر مسرت جہاں

صفحات: 300، قیمت: 194 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

مبصر: ڈاکٹر اسد رضا 21/37-3 ای سی روڈ دہرہ دون -248001

زیرِ نظر کتاب میں اردو کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر مسرت جہاں نے ممتاز افسانہ نگار عابد سہیل مرحوم کے افسانوں میں عصری حسیّت کا معروضی طور پر ناقدانہ ومحققانہ جائزہ لیا ہے۔ مصنفہ نے اس کتاب کو اپنے شریک حیات پروفیسر محمد ظفر الدین صاحب کے نام منسوب کیا ہے۔ اس کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر مسرت جہاں اور عابد سہیل مرحوم کے بارے میں ممتاز ترقی پسند ناقد پروفیسر شارب ردولوی اور پروفیسر عتیق اللہ نے پُر فکر اور پُر مغز مضامین تحریر فرمائے ہیں۔ پیش لفظ کے بعد عابد سہیل کی سوانح اور شخصیت پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعد ازاں ان کی علمی، صحافتی اور ادبی خدمات کا جامع الفاظ میں تذکرہ ہے۔ چونکہ عابد سہیل ایک کثیر الجہات قلم کار تھے۔ لہٰذا بطور افسانہ نگار، بحیثیت خاکہ نگار، بحیثیت صحافی، بطور نقاد، بحیثیت خود نوشت نگار اور بحیثیت مترجم ان کی خدمات کا احاطہ بھی اس کتاب میں بہ حسن وخوبی کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مسرت صاحبہ نے عابد سہیل کے افسانوں میں عصری حسیت کا بہ تفصیل ناقدانہ وعالمانہ تجزیہ کیا ہے۔ بقول مصنفہ ''عابد سہیل کے افسانے عصری حسیت کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے افسانوں میں معاشرہ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ سماج کے مسائل اور واقعات سے عابد سہیل پوری طرح واقف نظر آتے ہیں بلکہ بیشتر جگہ اس کا حصہ نظر آتے ہیں۔'' مسرت صاحبہ نے عابد مرحوم کے افسانوں میں فسادات اور مذہب ومسلک، انسانی بے حسی اور تہذیبی اقدار کے زوال، نسوانی کرداروں کی نفسیات اور خواب کے حوالوں سے افسانہ نگار کی عصری حسیّت کا معروضی طور پر تجزیہ کیا ہے۔ مصنفہ کے الفاظ میں ''انھوں نے اپنی زندگی کے تجربات ومشاہدات اور قلبی واردات کو افسانے کے سانچے

میں ڈھالا ہے۔'' اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے مسرت جہاں نے جہاں ٹھوس دلائل، اہم ناقدین و محققین اور اسکالرس کے اقوال پیش کیے ہیں، وہیں عابد سہیل کے افسانوں کے پلاٹ، مکالموں اور بیانیہ کی مثالیں بھی دی ہیں اور تاریخی حوالوں سے بھی اس کتاب کو آراستہ کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر صاحبہ نے عابد سہیل کے افسانوں 'شرطیں'، 'سوا نیزے پر سورج'، 'روح سے لپٹی ہوئی آگ' اور 'دستک کس دروازے پر' وغیرہ سے ثابت کیا ہے کہ افسانہ نگار ہندو مسلم اور شیعہ سنی فسادات کی عکاسی نہایت دردمندانہ انداز سے کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ نے افسانوں کے کرداروں، مکالموں اور واقعات کی مثالوں اور دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ افسانہ نگار عابد سہیل ایک انتہائی حساس انسان تھے اور اپنے قلم سے انہوں نے عصری حسیت کی عکاسی کی ہے۔ ان کے افسانہ نہ صرف قاری کو محظوظ کرتے ہیں بلکہ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مصنفہ نے عابد سہیل کے افسانہ 'نوحہ گر' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے افسانے کردار اجمل اور رخشی ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں لیکن اجمل معاشی مجبوریوں کی وجہ سے خوش حال گھرانے کی رخشی کو اپنا نہیں پاتا ہے۔ اپنے گہرے تجزیے اور ناقدانہ زاویے کے بعد ڈاکٹر مسرت نے بجا طور پر عابد سہیل کے افسانوں کے بارے میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''اپنے معاشرے کے تمام پہلوؤں کو، اپنے معاشرے کے احساس کو انھوں نے اپنے افسانوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اسی لیے ان کی کہانیاں عصری حسیت سے بھرپور نظر آتی ہیں۔''

ڈاکٹر مسرت جہاں صاحبہ اور اس کتاب کے بارے میں اردو کے مستند اور معروف دانشوروں نے بھی ستائشی کلمات تحریر کیے ہیں۔ مثلاً پروفیسر شارب ردولوی رقمطراز ہیں۔ ''ڈاکٹر مسرت جہاں نے ان عناصر کا بھی جائزہ لیا ہے جن سے کسی عصری حسیت مرتب ہوتی ہے وہ عقائد ہوں، مذہب ہو، سماجی بے چینی ہو، بے حسی ہو، فساد ہوں یا محبت، عصری حسیت متضاد عناصر سے مل کر بنتی ہے اور یہ بنتی تو خارجی اثرات سے ہے لیکن یہ ہوتی ذاتی ہے۔ اس لیے ایک عہد اور ایک ہی شہر میں فروغ پانے والے عابد سہیل، رتن سنگھ، اقبال مجید کی عصری حسیت ایک ہو یہ ضروری نہیں۔ اس لیے مسرت جہاں نے بڑی احتیاط سے عصری حسیت کو بنانے والے اثرات، مذہب، مسلک، تہذیبی اقدار، سیاسی اور تہذیبی صورت حال، انقلاب، تحریکیں اور اقدار کے زوال کا ذکر کیا ہے۔'' اس طرح پروفیسر عتیق اللہ لکھتے ہیں۔ ''ڈاکٹر مسرت جہاں کے تجزیوں میں بھی ضبط کی کیفیت ہے۔ انہوں نے ہر سطح پر اختصار و اجمال کو ترجیح دی ہے اور اپنے قاریوں کو کچھ تشنگی کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔ کوئی بھی تنقید پوری طرح سیراب نہیں کرتی۔ اسے بہت کچھ دوسروں کو سوچنے کے لیے بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔''

اپنی کتاب کے آخری حصے میں مصنفہ نے عابد سہیل کے دس ایسے منتخب افسانے شائع کیے ہیں جو افسانہ نگار کی عصری حسیت کے آئینہ دار ہیں۔ توقع ہے کہ اردو دنیا بالخصوص افسانوں کے شائقین، عابد سہیل کے شیدائی اور مستقبل کے اردو ریسرچ اسکالر اس کتاب کا پرتپاک خیر مقدم کریں گے۔

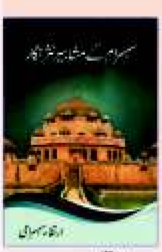

سہسرام کے مشاہیر نثر نگار

مصنف: ارتقاء سہسرامی

ضخامت: 264، قیمت: 250 روپے

ناشر: ضیا پبلی کیشنز، نورن گنج، سہسرام، بہار

مبصر: ابراہیم افسر، وارڈ نمبر۔ 1، مہپا چوراہا

نگر پنچایت سیوال خاص، ضلع میرٹھ (یوپی) 250501

مغلیہ عہد کے ابتدائی دور میں ہندوستان میں جن علاقوں نے تیغ و قلم کے ذریعے اپنی منفرد شناخت قائم کی ان میں ایک علاقہ سہسرام کا رہا ہے۔ ویسے سہسرام کو عروج اُس وقت حاصل ہوا جب شیر شاہ سوری نے مغل تاج دار ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان کی بادشاہت حاصل کی۔ اپنی مختصر حکمرانی میں شیر شاہ سوری نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے انھیں رہتی دنیا تک یاد کیا جاتا رہے گا۔ شیر شاہ سوری کے بعض کارنامے تو دور حاضر میں بھی عوام کے سامنے موجود ہیں۔ جنھیں دیکھ کر تاریخ عہد وسطیٰ کی سنہری یادیں عوام کے اذہان میں تازہ ہو جاتی ہیں۔ ارتقا سہسرامی نے قلم کے مجاہدوں بالخصوص سہسرام کے نثر نگاروں کے کارہائے نمایاں کا تذکرہ 'سہسرام کے مشاہیر نثر نگار' میں پیش کرنے کی سعی پیہم کی ہے۔ موصوف نے بڑی ہی عرق ریزی اور تلاش بسیار کے بعد اس کتاب کو قارئین کے سامنے پیش کیا۔ ارتقاء سہسرامی کا تعلق، سہسرام کے مشہور علمی و ادبی شخصیت اور 'رجال سہسرام' کے مصنف مرحوم حاذق ضیائی سہسرامی کے خانوادے سے ہے۔ علاقائی ادب کے فروغ میں ادبی تذکرے چاہے نثری ہوں یا منظوم بڑے ہی کارآمد اور مفید ہوتے ہیں۔ ان تذکروں میں بیک وقت ہمیں اُن ادبی لوگوں کی سوانح اور ادبی کارگزاریاں معلوم ہو جاتی ہیں جن کی جانب عرصۂ دراز سے اہل قلم نے توجہ مبذول نہیں کی۔ کسی خاص علاقے یا خطے کی ادبی تاریخ کو دریافت یا بازیافت کرنے میں بھی یہ تذکرے معاون و مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ اُردو ادب میں بیسویں صدی کے آغاز سے علاقائی ادب کو جاننے کا رجحان بہت تیزی سے بڑھا ہے۔ البتہ جتنا کام اس جانب ہونا چاہیے تھا وہ ابھی نہیں ہو پایا ہے۔ بہر حال، ارتقاء سہسرامی نے بہار کے مردم خیز علاقے سہسرام کی نثر نگاری کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر اس باب میں خاطر خواہ کام کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'سہسرام کے مشاہیر نثر نگار' میں ارتقا سہسرامی نے تین باب قائم کیے ہیں۔ پہلے باب کا عنوان 'سہسرام میں اُردو نثر نگاری: تاریخی پس منظر' کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ اس باب میں ارتقاء سہسرامی نے سہسرام کی تاریخی اہمیت اور اس علاقے کے قیام سے متعلق تفصیلات کو تاریخی اعتبار سے درج کرتے ہوئے مشاہیر کی کتابوں کے حوالے اور ان کے فن پر عالمانہ انداز میں بحث کی ہے۔ اس باب میں ارتقا سہسرامی نے جن 37 مشاہیر نثر نگاروں کی تفصیلات پیش کی ان میں معین انصاری، شاہد انور، ڈاکٹر واجد علی، ڈاکٹر قاسم فریدی، پروفیسر انعام ناظمی، شاہد جمیل، ڈاکٹر عالم سہسرامی، شمیم قاسمی، ڈاکٹر ایس کے جبیں، ڈاکٹر مبین تابش، اشتیاق ایوبی، پرویز اشرفی، منصور عالم، شکیل اختر، ساحل سہسرامی، ڈاکٹر منیر شیدائی، ڈاکٹر شہلا رضا، ڈاکٹر سرور عالم ندوی، مولانا ملک الظفر سہسرامی، ڈاکٹر حافظ مختار عالم علیگ، ڈاکٹر شاہین سلطانہ، ڈاکٹر تبسم نگار، ڈاکٹر شاہد اختر، ایس جمشید احمد، حافظ رضوان عالم، رابعہ خاتون، فرزانہ پروین، فیضان ضیائی اور قدسیہ عظمت علیگ کے نام اور نثری ادب کے نمونے بطور مثال پیش کیے ہیں۔ باب دوم 'سہسرام کے مشاہیر نثر نگار' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس باب میں ارتقاء سہسرامی نے جن 18 مشاہیر نثر نگاروں کو شامل کیا ان میں مرزا عبدالستار بیگ، مولانا رکن الدین دانا، مولانا فرخند علی فرحت، مولانا ابوصالح ظہیر الدین سہسرامی، مولانا غیاث الدین حسن شرفی، زاہدہ حنا وغیرہ ہیں۔ ان مشاہیر کی تصنیفات میں سے نثری نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ باب سوم 'سہسرام کے چند اہم نثر نگار' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ اس باب میں ارتقاء سہسرامی نے 11 مشاہیر نثر نگاروں کو شامل کیا ان میں حکیم مولانا حسن علی حسن سہسرامی، مولانا محمد قادر بخش، مولانا ابو محمد مصلح سہسرامی، مولانا محمد انوار الحق شہودی، مولانا ناظم میواتی سہسرامی، مولانا محمد ارتضاء الدین حاذق ضیائی سہسرامی، ڈاکٹر حسن آرزو، پروفیسر شفیق احمد شفق، پروفیسر حسین الحق، ڈاکٹر محمد مظفر حسن عالی اور پروفیسر (ڈاکٹر) انعام ناظمی شامل ہیں۔

ارتقا سہسرامی نے اس کتاب میں سہسرام کی مایہ ناز علمی و ادبی شخصیات کے فن پر

تحقیقی و تنقیدی گفتگو کرتے ہوئے ان کا اُردو ادب میں کیا مقام و مرتبہ ہے، پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس موقع پر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ارتقا سہرامی اپنے ابواب کو سائنٹفک انداز میں قائم کرتے تو کتاب کے معیار، وقار اور افتخار میں مزید اضافہ ہوتا۔ ارتقا سہرامی صرف نثر نگاری کے حوالے سے ہی نثری اصناف بالخصوص افسانہ، ناول، ڈرامہ پر بھی بات کرتے تو زیادہ بہتر تھا۔ باب اول میں موصوف نے اس بارے میں بہتر کاوشیں کی ہیں کہ نئے اور پرانے لکھنے والوں کو ایک جگہ رکھا ہے لیکن یہ کاوش کافی نہیں۔ سہرام میں نثر نگاری کی تاریخ بیان کرنے کے بعد موصوف نے اس بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی کہ اب اُن نثر نگاروں اور ان کی تخلیقات پر شرف نگاہ ڈالی جائے گی جن کی وجہ سے سہرام کے ادبی وقار کو افتخار حاصل ہوا۔ باب سوم باب دوم کی توسیع معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ باب دوم میں جب 'سہرام کے مشاہیر نثر نگار' کو شامل کرلیا گیا تو باب سوم 'سہرام کے چند اہم نثر نگار' لکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ باب دوم میں ہی باب سوم کو شامل کیا جاسکتا تھا۔ باب سوم میں کئی نثر نگاروں کا تذکرہ تیس سے چالیس صفحات کو محیط ہے اور بعض کا چار پانچ صفحات پر۔ بہرکیف! ارتقا سہرامی نے اس کتاب کے ذریعے تاریخی اور تعلیمی اعتبار سے زرخیز علاقے سہرام کو اُردو کے باذوق قارئین سے روشناس کرایا ہے۔ اس کتاب کی جہاں تاریخی اہمیت مسلم ہے وہیں اس کی ادبی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں۔ کتاب کے سرورق پر شیر شاہ شوری کے قلعے کی خوب صورت اور دل آویزاں تصویر قارئین کو پہلی ہی نظر میں اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ کتاب کی پشت پر سہرام کا نقشہ، سہرام کے دیدار، سیر و سیاحت کرنے والوں کے لیے کارآمد ثابت ہوگا۔ کتابت عمدہ کاغذ پر کی گئی ہے۔ کتاب کی اہمیت کے اعتبار سے اس کی قیمت مناسب ہے۔

صادقہ نواب سحر- شخصیت اور فن: فکشن کے تناظر میں

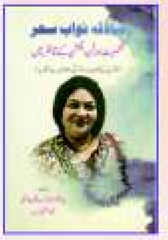

مرتبین: پروفیسر میر تراب علی یداللّٰہی اور محمد اسلم نواب

صفحات: 799، قیمت: 800 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی

مبصر: وفا اعظمی، D-1014/B، چوتھی منزل، 25 فٹا روڈ، کھڈا کالونی جیت پور ایکسٹینشن، پارٹ 2، بدر پور، نئی دہلی۔ 44

ساحل سے سمندر کا نظارہ کرنے کے بجائے موجوں کے تلاطم، گہرے پانی کی ہیبت اور طوفان کی بلاخیزی، بھنور کے ابتلا، موتیوں کے لے غواصی کا دکھ درد ہم تک پہنچانے میں ادیب، تخلیق کار اور افسانہ نگار کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ وہ جدید دور کے انسان کا ایسا شعور پیش کرتا ہے جس میں تاریخ بھی ہوتی ہے اور تہذیب بھی، تعمیر کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے اور تخریب بھی، پیچیدگی کی کھائیاں بھی ملتی ہیں اور پرواز کی بلندیاں بھی، ان تمام خوبیوں، اوصاف اور کردار کو آج کے دور میں اگر کسی ادیب سے منسوب کیا جائے تو ہماری نظروں کے سامنے ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کی شخصیت آجاتی ہیں۔

اس ادیبہ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر محیط 2017 میں شائع اور پروفیسر میر تراب علی یداللّٰہی اور محمد اسلم نواب کی مرتب کردہ کتاب 'صادقہ نواب سحر- شخصیت اور فن: فکشن کے تناظر میں' ناقدین کے تنقیدی اور تاثراتی مضامین کا ایسا انتخاب ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مجموعے میں ایک سماجی احساس ملتا ہے جو ہمارے ادب کی بہت بڑی دولت ہے۔ اس کی اپیل محدود نہیں بلکہ وسیع تر ہے، اس کا فنی شعور کسی خاص مقام پر جامد نہیں ہوتا بلکہ ہمہ وقت سیال ہے کیونکہ اس تنقیدی انتخاب میں اردو اکادمی، دہلی کے سابق وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، معروف ادبی رسالہ 'شاعر' ممبئی کے مدیر افتخار امام صدیقی، اردو ادب کا مستند رسالہ 'استعارہ' دہلی کے سابق معاون ایڈیٹر حقانی القاسمی، رفیعہ شبنم عابدی، جوگیندر پال، سلام بن رزاق، مجتبیٰ حسین، علی احمد فاطمی، ندا فاضلی، نگار عظیم، مناظر عاشق ہرگانوی، اسلم جمشید پوری، پیغام آفاقی، مسرور جہاں، وسیم بیگم، صالحہ صدیقی، ڈاکٹر وکرم چوپڑا، شائستہ فاخری، کالی داس گپتا رضا، دامودر کھڑسے، مادھوری چھیڑا اور نغمہ جاوید ملک جیسے ادب کے عظیم شہسواروں کے ناقابل تسخیر مضامین ہیں جو ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کی تخلیقات کو سند عطا کرتے ہیں۔ اتنا کہتا چلوں کہ مذکورہ بالا قلم کے شہسوار اگر کسی تحریر کی صرف نوک پلک سنوار دیتے ہیں تو اس تخلیق کی تقدیر بدل جاتی ہے لیکن اگر وہ کسی تخلیق کو اپنی سند عطا کردیں تو پھر اس کی پختگی، عمدگی اور کامیابی کا اندازہ صرف اور صرف لگایا ہی جاسکتا ہے۔

'صادقہ نواب سحر- شخصیت اور فن: فکشن کے تناظر میں' میں برصغیر کے کم و بیش 250 معروف ادبا اور ناقدین کی تنقیدیں اور مشورے درج ہیں جو ڈاکٹر نواب صاحبہ کی صلاحیت، اہلیت، فنی مہارت اور ادبی شناخت کی غماز ہیں۔

یہ تنقیدی مجموعہ دراصل 'کہانی کوئی سناؤ متاشا'، 'جس دن سے ...'، 'خلش بے نام سی'، 'مکھوٹوں کے درمیان' پر دی گئی وہ قیمتی آراء ہیں جو ڈاکٹر نواب صاحبہ کی نثری خدمات کو سلام کرتی ہیں۔

مصنفہ کے تصنیف کردہ افسانے، ڈرامے اور ناولوں میں فن کار کی اپنے فن سے پوری وفاداری ملتی ہے۔ ان کی تخلیقات میں زندگی کو برابر دیکھنے اور پوری طرح پرکھنے کا عزم نظر آتا ہے۔ ان کی نثری تحریروں میں وہ آدمیت ملتی ہے جو آدمی کے ہر رنگ سے آشنا ہے۔ ان کے ادبی شاہکاروں میں وہ دانش مندی ملتی ہے جو اپنے کو پہچاننے اور دوسروں کو جانچنے میں مدد دیتی ہے۔ ان کے فن پاروں میں وہ شوخیاں بھی ملتی ہیں جو ہمیں رنج و راحت اور تختی و سستی سے باہر نکالتی ہیں۔

'صادقہ نواب سحر- شخصیت اور فن: فکشن کے تناظر میں' دو ابواب پر مشتمل ہیں۔ دونوں ابواب میں سب سے پہلے برصغیر میں ادبی افق پر چمکنے والے ستاروں کے گراں قدر مضامین ہیں۔ اس کے بعد ادیبہ کے ناولوں، ڈراموں اور افسانوں پر تحریر کردہ تبصروں کا ذکر کیا گیا ہے اور سب سے آخر میں نقد پارے کے عنوان سے شمس الرحمٰن فاروقی، قاضی عبدالستار، پروفیسر قمر رئیس، جوگیندر پال، پروفیسر علی احمد فاطمی، جیلانی بانو، سلمیٰ صدیقی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، وارث علوی جیسے عظیم ادیبوں اور نثری و تنقیدی میدان میں نمایاں نام حاصل کرنے والے فنکاروں کی آرا درج کی گئی ہیں۔ اس انتخاب کے آخر میں 'انٹرویو' کا بھی ایک عنوان ہے جس میں معروف نقاد حقانی القاسمی اور معروف شاعر افتخار امام صدیقی کے ذریعے کیے گئے سوالات کے جوابات درج ہیں۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کی شخصیت پر مشتمل 'صادقہ نواب سحر- شخصیت اور فن: فکشن کے تناظر میں' میں درج اردو کی پرانی روایت سے بغاوت کرتے ہوئے حق کی بات کرنے والے عظیم نقاد حقانی القاسمی کا ایک انٹرویو ہے جس کے شروع میں انہوں نے لکھا ہے: ''ڈاکٹر صادقہ نواب سحر اس خوبصورت احساس کی حامل ہیں جو خزاں کو بھی بہار میں بدل دیتا ہے اور ریگ زار کو بھی گلزار بنادیتا ہے۔ وہ بہت مثبت اور تعمیری ذہن رکھتی ہیں۔ ہر باب میں ان کا نقطۂ نظر متوازن ہے۔''

زیر تبصرہ تنقیدی انتخاب کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ڈاکٹر نواب کی تحریروں اور تخلیقات میں ایسا خمار ہے جس میں رات کا کرب اور سحر کا نشاط پایا جاتا ہے جس نے اپنے عہد کے باطنی اضطراب کو نہ صرف سمیٹ لیا ہے بلکہ اس میں ایک نیا اضطراب پیدا کردیا ہے۔ ان کی تحریریں اپنے عہد کے شکنجوں کو توڑ دیتی ہیں اور ماضی اور مستقبل کی وسعتوں میں پھیل جاتی ہیں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ حقانی صاحب کے سوال 'کیا عورت ذہنی اور جسمانی اعتبار سے کمزور ہے؟' کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر سحر صاحبہ کہتی ہیں: 'یہ کیا بات ہے کہ عورت کو کم عقل اور کمزور مانا جائے!... یہ سب سوچنے کی باتیں ہیں... کتنے ہی جسمانی طور پر یا قوتِ ارادی اور خود اعتمادی میں نازک اور کمزور مرد بھی ملتے ہیں... سائنس نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ ماں کے پیٹ میں بھی لڑکی لڑکے سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔'

'صادقہ نواب سحر-شخصیت اورفن: فکشن کے تناظر میں' میں صادقہ نواب کی کوئی اپنی نئی تخلیق تو نہیں ہے، ہاں، ان کی نثری اور منظوم تحریریوں، ادبی افسانوں اور ڈراموں پر معتبر و مستند ادبا، نقادوں کی آرا، تنقید اور مشورے ضرور ملیں گے جن سے استفادہ کرنے، انہیں سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کے لیے قارئین کو اس تنقیدی انتخاب کو ایک بار ضرور اپنے مطالعہ میں لانا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ 800 صفحات پر مشتمل یہ ضخیم علمی سرمایہ 'صادقہ نواب سحر-شخصیت اورفن: فکشن کے تناظر میں' اپنی صداقت کی چھاپ قارئین کے دلوں پر ضرور چھوڑ جائے گا۔

سقوط ماسکو اور ترقی پسند ادب

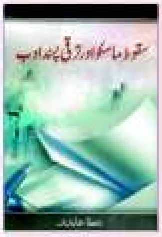

مرتب: ڈاکٹر عطا عابدی

صفحات: 304، قیمت: 400 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

مبصر: سنتوش کمار، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی 7

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ادب سماج کا آئینہ ہے۔ ادب ہی ایک ایسا فن ہے جس میں سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں اور اچھائیوں کی ہو بہو عکاسی کرتا ہے اور ہماری نظروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ادب ہی ہمیں ادب و احترام کرنا سکھاتا ہے۔ اسی لیے زیادہ تر ادبا و شعراء نے ترقی پسند ادب اختیار کیا، جس سے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کا خاتمہ ہو سکے۔ ترقی پسند ادب غریب، مظلوم، لاچار، کمزور اور مزدوروں کے حق کی بات کرتا ہے۔ ان کے حق کے لیے آواز بلند کرتا ہے۔

ہندوستان میں بہت سے ترقی پسند ادیبوں کی آواز بلند اسی کے زیر اثر ہوئی ہے اور ان کے بہت سے سارے ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اسی سے متعلق عطا عابدی نے اپنی کتاب 'سقوط ماسکو اور ترقی پسند ادب' مرتب کی ہے جو ترقی پسندوں کی طرف اور ان کے خیالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ترتیب کی نوعیت یہ رہی ہے کہ پہلے ترقی پسند ادبا و شعرا کے خیالات کو ترجیح دی ہے۔

ترقی پسند ادیبوں نے جو بحث کا مدعا آزادی کو لے کر اٹھایا تھا وہ آج بھی کتنا کارآمد ہے یہ کتاب اسی بحث کے سلسلے میں پیش کی گئی ہے۔ یوں تو ترقی پسند ادیبوں ومصنفوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ لیکن وہ ادبا و شعراء نے اپنی اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے نہ صرف مشہور ہوئے بلکہ ظلم و ستم کے سامنے چٹان بن کر کھڑے رہے۔ ''سقوط ماسکو اور ترقی پسند ادب'' دلچسپ اور قابل قدر ہے۔

زیر نظر کتاب 'سقوط ماسکو اور ترقی پسند ادب' ڈاکٹر عطا عابدی نے ترتیب دی ہے۔ کتاب پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بہت سے ادبا و شعرا کی گفتگو سے ہمیں بہت سی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

یہ کتاب چار باب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں سوالنامہ اور مکالمہ پر بحث کی گئی ہے جب کہ دوسرے باب میں ادبا و شعراء کے خیالات پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں مکتوبات پر بحث کی گئی ہے۔ چوتھے اور آخری باب میں تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور کتاب کے آخر میں مصنف و ترتیب کردہ کا تعارف و دیگر تفصیلات ہیں۔

غلام ربانی تاباں، قمر رئیس، قرۃ العین حیدر، الیاس احمد گدی، محمد حسن، محمود ہاشمی، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، شہپر رسول، مجروح سلطانپوری اور مشرف عالم ذوقی کی ادبی خدمات کا تذکرہ ہے۔ باب دوم میں ردعمل کے حوالے سے ذکاء الدین شایاں، قاضی عبدالباسط، سلیم انصاری اور عزیز مرادآبادی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اس میں کل 14 ادبا وشعرا نے ردعمل پر بحث کی ہے۔ تیسرے باب میں تقریباً 24 ادبا وشعرا ترقی پسند ادب پر (مکتوب) کے حوالے سے بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ آخری باب میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔

غرض کہ ترقی پسند ادب سے دلچسپی رکھنے والے کو یہ کتاب ضرور اپنے مطالعے میں شامل کرنی چاہیے۔ کتاب کا سرورق سادہ ہے اور کتاب کی زبان بھی عمدہ ہے۔ پروف ریڈنگ کی خامیاں تقریباً نہیں کے برابر ہیں۔ کتاب کی قیمت مناسب ہے۔ کل ملا کر یہ کتاب کامیاب اور مفید کوشش ہے جسے قارئین و اہل علم یقیناً خوب پسند کریں گے۔

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

نام مصنف: ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی

صفحات: 248، قیمت 300 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: راحت علی صدیقی، محمد پور معافی کھتولی، مظفر نگر۔ 251201 (یوپی)

زیر تبصرہ کتاب آفاق عالم صدیقی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، کتاب کا مطالعہ مصنف کے لب ولہجے کی خوبی اور زبان و بیان کی چاشنی، نثر کی شیرینی اور جملوں کی ساخت و پرداخت کی عمدگی سے واقف کراتا ہے، اُن کا اسلوب اور لب ولہجہ دلکش ہے، جو قاری کو متاثر کرتا ہے، تعبیرات اور اُن کے استعمال کا طریقہ صاحب کتاب کی مداحی پر مجبور کرتا ہے۔

کتاب 22 مضامین پر مشتمل ہے، جن میں شاعری اور شعری مجموعوں پر مضامین کی تعداد زیادہ ہے، قدیم و جدید نظریات کے حامل شعرا کے فن کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے، جن کے لہجے مختلف ہیں، عہد اور نظریات مختلف ہیں، رنگ و اسلوب جدا جدا ہیں، کتاب کا مطالعہ مختلف النوع شعرا کے فکر وفن کو آشکار کرتا ہے۔

کتاب کا پہلا مضمون جوش کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے، جوش کی شاعری کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ جوش کی شاعری کا بڑا حصہ شاعری کی عمدہ مثال نہیں ہے، البتہ ان کی عشقیہ نظمیں اُن کی شاعری کا وقار ہیں، جن میں ان کے فن کی بلندی ظاہر ہوتی ہے۔

مظفر حنفی کی شاعری پر بھی گفتگو کی گئی ہے، وہ خیالات جو ان کی شاعری کے بارے میں رائج ہیں، ان کی تردید کی گئی ہے، ان کے چند اشعار کو پیش کر کے واضح کیا گیا ہے کہ یہ جدید شاعری کی مثال نہیں ہے، حالانکہ مظفر حنفی جدید شاعری میں پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں، مظفر حنفی کے تعلق سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے، کہ وہ طنز کرتے ہوئے شاد عارفی کا لب ولہجے کا استعمال کرتے، اس کی تردید کی گئی ہے اور دلائل کے ذریعے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے، مظفر حنفی کی شاعری کے بہت سے اہم پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔

پریم کمار نظر کے شعری مجموعے 'لوح جہاں' پر تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے نظر کی شاعری کا مقام واضح ہوتا ہے، ان کی شاعری قدیم و جدید کا خوبصورت سنگم ہے، جدت کے باوجود کلاسکیت سے وہ بھرپور استفادہ کرتے ہیں، ان کی کتاب پر تبصرہ سے یہ حقیقت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے،

خلیل مامون کی نظموں کے تجزیے کیے گئے ہیں اور ان تجزیوں کے تناظر میں

خلیل مامون کی فنی عظمت وندرت کو بھی آشکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جو لوگ خلیل مامون کو مہمل قرار دیتے ہیں، ان کی گرفت کی گئی ہے، دلائل کی روشنی میں خلیل مامون کے فن کی بلندی کو عیاں کیا گیا ہے، ساتھ ہی عہد حاضر کے ادبا کی صورت حال پر بھی طنز کیا گیا ہے۔

پروین کمار اشک کے شعری مجموعے 'دعا زمین' کے تناظر میں ان کی شاعری کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر راہی فدائی کی شاعری جدت پسند ادبا کے یہاں ان کی مقبولیت ان کی شاعری میں موجود لفظوں اور تراکیب کے خوبصورت نظام پر بخوبی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اوم پربھاکر کے شعری مجموعے 'تنکے میں آشیانہ' کے ضمن میں ان کی فنی چابک دستی کو عیاں کیا گیا ہے۔ ساجد حمید کے شعری مجموعے 'بہت ذرا سا' میں شامل کلام پر گفتگو کی گئی ہے۔ راشد طراز کی شاعری پر گفتگو کی گئی ہے، جس میں ان کی شاعری کی خصوصیات اور وقیع رنگ نمایاں ہوتے ہیں۔

راشد جمال فاروقی کے شعری مجموعے کاغذی ناؤ پر گفتگو کی گئی ہے، ساتھ ہی ان کی شخصیت کی خوبیاں بھی سپرد قرطاس کی گئیں ہیں۔ خورشید اکرم کے شعری مجموعے 'پچھلی پیت کے کارنامے' پر تبصرہ ہے، جس میں خورشید اکرم کا فن اور اس کا مقام عیاں ہوتا ہے۔ عشرت جالندھری کے شعری مجموعے 'پھر بھی' پر گفتگو کی گئی ہے، جس میں ان کے عمدہ اور کمزور دونوں پہلوؤں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ ذکی طارق کے شعری مجموعے 'صبح کی دہلیز پر' کے حوالے سے ان کے فن پر گفتگو کی گئی ہے۔ حافظ کرناٹکی کی رباعیات پر بہت ہی عمدہ مضمون ہے۔

سلیمان خمار کے شعری مجموعے 'سمندر جاگتا ہے' جس پر وارث علوی مظفر حنفی مخمور سعیدی اور ندا فاضلی جیسے ادبا کی تقریظات ہیں، جس سے کتاب کے وقیع ہونے کا تاثر قلب پر ثبت ہوتا ہے، لیکن 'شنیدہ کے بود مانند دیدہ' میں دلائل کے ذریعے اس شعری مجموعے کی خامیوں کو بیان کیا گیا ہے، اور شعری مجموعے سمندر جاگتا ہے کے نام کے ساتھ ساتھ مختلف اشعار کو پیش کر کے دلائل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے، کہ سلیمان خمار ندرت سے محروم ہیں، اور دوسروں کے موضوعات کو برتتے ہیں، ترکیب کی غلطیاں بھی واضح کی گئی ہیں، اور تقریظ نگاروں کی تعریف پیش کر کے اس کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے، نثار احمد صدیقی کی کتاب 'آئینہ' کا تعارف کرایا گیا ہے، جس میں 40 ادبا کے حالات موجود ہیں، تفصیل کے ساتھ اس کتاب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اس کی اہمیت و وقعت کو واضح کیا گیا ہے، رؤف خیر کی کتاب 'حق گوئی و بے باکی' پر تبصرہ کیا گیا ہے، جس میں رؤف خیر کا تعارف شامل ہے، اور اُن کی کتاب میں موجود خامیوں اور کوتاہیوں کو دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے۔ شاہد پٹھان کے شعری مجموعے 'جوئے شیر' کے تناظر میں شاہد پٹھان کے فن پر گفتگو کی گئی ہے، جس میں شاہد پٹھان کی شاعری کی خامیاں اور کمزوریاں نظر آتی ہیں۔ رئیس الدین رئیس کے مجموعے 'شہر بے خواب' کا تعارف کرایا گیا ہے، اور رئیس کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے، ساتھ ہی کتاب میں موجود عشرت ظفر کے مضمون کی خامیاں بیان کی گئی ہیں، خلیل الزماں نصرت کی کتاب 'برمحل اشعار اور ان کے ماخذ' کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کی خوبیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

عہد حاضر میں یونیورسٹیوں کے احوال اور ادبا کے احوال پر بہت ہی وقیع مضمون ہے، جس میں عہد حاضر کے ادب اور ادباء کی صورت حال عیاں ہوتی ہے، اس مضمون میں اسرار عالم کی کتاب سر سید کی بصیرت سے استفادہ کیا گیا ہے۔

'شنیدہ کے بود مانند دیدہ' فن پاروں کے مختلف اہم پہلوؤں تک پہنچنے میں معاون ہے، اور تنقید کا سلیقہ و شعور بھی عیاں کرتی ہے۔

شخصیات

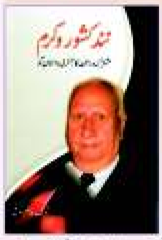

نند کشور وکرم: مشترکہ وراثت کا آخری داستان گو

ترتیب وتہذیب: مشرف عالم ذوقی

صفحات: 480، قیمت: 500 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: مبشر عالم، 275/6 ململیا پارک، لکشمی نگر، دہلی۔ 110092

نند کشور وکرم ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ افسانہ نگار بھی تھے، شاعر بھی، نقاد بھی۔ ناول نگار بھی اور مدیر بھی۔ وہ ایک ایسے اردو دوست تھے، جنھوں نے اپنی ساری زندگی اردو کے نام وقف کردی تھی۔ عالمی اردو ادب جیسا رسالہ اردو کو دیا۔ جس کا ہر شمارہ دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ دو ناول لکھے۔ یادوں کے کھنڈر اور انیسواں ادھیائے۔ انیسواں ادھیائے دراصل نند کشور وکرم کی زندگی کے وہ صفحات ہیں جو انھیں روحانیت کی طرف لے جاتے ہیں۔ مقدس گیتا اٹھارہ ادھیاؤں پر مشتمل ہے۔ انیسواں ادھیائے میں وکرم صاحب نے حیات وموت کے فلسفے پر جو ان کا نظریہ تھا، اس کو بہ کمال خوبی پیش کیا ہے۔ 90 برس کی عمر میں وکرم صاحب کا انتقال ہوگیا۔ مشرف عالم ذوقی ان کے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ یہ کتاب وکرم صاحب کو نہ صرف خراج عقیدت پیش کرتی ہے، بلکہ مشاہیر کے مضامین کے ذریعے ان کی زندگی اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ پیش لفظ کے تحت مشرف عالم ذوقی لکھتے ہیں:

''2017 کی بات ہے۔ وکرم صاحب اس کتاب کو اپنی زندگی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تین برس گزر گئے۔ 2019 آتے آتے وکرم صاحب کو اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ اب ان کی زندگی کی لو بجھنے والی ہے۔ لیکن انھیں اس بات کا یقین تھا کہ 90 سال کی عمر ہونے تک وہ زندہ ضرور رہیں گے اور اپنے جنم دن کو شرادھ کے طور پر منائیں گے اور اسی دن اس کتاب کا اجرا بھی عمل میں آئے گا۔ خواب اور خواہش کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ 27 اگست کا دن کتاب کو فائنل کرنے کے لیے مقرر کیا گیا اور کس کو پتہ تھا کہ اسی دن وکرم صاحب یہ دنیا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ہمارے درمیان سے چلے جائیں گے۔ وہ مشترکہ وراثت کے آخری داستان گو تھے۔ اب ایسے لوگ ہمارے درمیان نہیں۔ خوشتر گرامی، رام لعل، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، کشمیری لال ذاکر، جوگندر پال ایک ایک کر کے جانے والوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اب اس کارواں میں چند ہی لوگ رہ گئے تھے اور ان میں نند کشور وکرم کا نام ایک ایسا نام تھا جس نے اپنی ساری زندگی اردو کے لیے وقف کردی۔ وہ ترقی پسند قافلے کے آخری سپاہی تھے اور اب دور دور تک کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو مشترکہ وراثت کی دولت کو سنبھال سکے۔''

کتاب کا انتساب وکرم صاحب کی اہلیہ اور بچوں کے نام ہے۔ کتاب کئی ابواب پر مشتمل ہے۔ بقلم خود کے تحت وکرم صاحب کے تین مضامین شامل ہیں۔ دوڑ پیچھے کی طرف، پدرم سلطان بود اور جرثومے کا معجزہ۔ ان مضامین کے ذریعے وکرم صاحب نے ماضی کی طرف دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ پاکستان میں پیدا ہوئے۔ اس لیے ہجرت کے بعد بھی پاکستان سے نفرت نہیں کر سکے۔ سیاست اپنی جگہ، مگر وکرم صاحب بار بار پاکستان اس لیے جاتے رہے کہ اپنے اس گھر کو دیکھ سکیں، جہاں وہ پیدا ہوئے اور ان کا بچپن گزرا تھا۔

فرقہ وارانہ فسادات اور تقسیم نے وکرم صاحب کو حد سے زیادہ متاثر کیا۔ زندگی کی آخری سانس تک وہ تقسیم کے المیہ کو فراموش نہیں کر سکے۔ یادوں کے کھنڈر اس بات کا کھلا ثبوت ہے۔ ان کی کہانیوں میں بھی تقسیم اور ہجرت کے نئے نئے رنگ نظر آتے

ہیں۔ شخص و شخصیت کے تحت خالد اشرف، خورشید اکرم، دیپک بدکی، دیویندر اسر، زمرد مغل، ساحر داؤد نگر، شمیم حنفی، شہزاد انجم، فاروق ارگلی، گلزار جاوید اور مشرف عالم ذوقی کے مضامین شامل ہیں۔

ان کی شخصیت میں جادو کا رنگ تھا۔ جو بھی ان سے ملتا، ان کا ہو کر رہ جاتا۔ یہ نند کشور وکرم کی خوبی تھی۔ ہندوستان سے پاکستان تک ان سے محبت کرنے والے تھے۔ ان کی خدمات کے تحت انھیں عالمی دوحہ قطر انعام سے بھی سرفراز کیا گیا۔ کتاب کا ایک حصہ انٹرویو پر مبنی ہے۔ اجے مالویہ، اقبال خورشید، راشد عزیز، عبدالحی، گلزار جاوید، محمد اقبال عارف اور نسیم انجم کے مکالمے شامل ہیں۔

کتاب میں انیسواں ادھیائے کے کچھ باب بھی دیے گئے ہیں اور انیسواں ادھیائے پر احمد صغیر، حسن عابد، حقانی القاسمی، دیویندر اسر، ریاض صدیقی، ستیہ پال آنند، عطیہ رئیس، عمران عاکف، محبوب الرحمٰن فاروقی، مشرف عالم ذوقی، نامی انصاری اور نعیم کوثر کے مضامین شامل ہیں۔ منتخب افسانے کے تحت آدھا سچ، اتم پروچن، ایک اور سیتا، زمین میں دفن سچائی، طول شب فراق، عرس کملے شاہ، کابلی والا کی واپسی، کا کا سب تن کھائیو کو شامل کیا گیا ہے۔ وکرم صاحب کے افسانوں کا تجزیہ بشیر احمد، سیفی سرونجی، شباب للت، مشتاق اعظمی اور نورالحسنین نے کیا ہے۔ وکرم صاحب کی کتابوں پر خصوصی تبصروں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ فلموں پر مضامین بھی ہیں، بھولے بسرے مجاہدوں کے قصے بھی۔ غرض وکرم صاحب کی ذات میں جتنے بھی رنگ تھے، اس کتاب میں ہر رنگ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ وکرم صاحب کی حیات و خدمات کے مطالعے کے لیے اس کتاب کو پڑھنا ناگزیر ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے حقیقی معنوں میں دوستی کا حق ادا کیا ہے۔

سوانح حضرت امیر شریعت

مصنف: ڈاکٹر محمد وقار الدین لطیفی ندوی

صفحات: 335، قیمت: 300 روپے

ناشر: مجلس گیارہ ستارے انڈیا

مبصر: عاقل زیاد، B-76، پاکٹ-1، فیز-1، میور وہار، دہلی-91

گویا یہ قول مسلم ہے کہ جس طرح ہر اندھیرے کے بعد اجالا آتا ہے اسی طرح بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کے لیے ہر دور میں ایک مصلح کا ورود ہوتا ہے۔ حضرت منت اللہ رحمانی کا ورود بھی ایک مصلح کی حیثیت رکھتا ہے کہ آپ صوبہ بہار کے ضلع مونگیر میں دریائے گنگا کے کنارے آباد ایک وسیع خطے کو نور الٰہی سے منور کرنے کی غرض سے وارد ہوئے۔ زیر تبصرہ کتاب 'سوانح حضرت امیر شریعت' جو بظاہر پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، تاہم اس کی ترتیب و پیش کش عام قاری کے لیے چشم کشا اور خواص کے لیے وسیلۂ ترغیب ہے۔ اس کتاب کو تاریخی حوالہ جات سے منسوب کر کے دیکھا جاتا تو میرا اندازہ ہے کہ امیر شریعت کی قومی اصلاح پسندی کا نظریہ زیادہ روشن ہو سکتا تھا۔ حضرت امیر شریعت نے ایک کتاب 'تعلیمی ہند' کے عنوان سے 1934 میں شائع کروائی تھی جو انگریزی حکومت اور انگریز مصنفین کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوئی۔ لہٰذا اس کی خرید و فروخت پر حکومت کی جانب سخت پابندی عائد کر دی گئی۔ واضح رہے کہ اس وقت ان کی عمر محض بائیس تیئس سال تھی۔ ظاہر ہے یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں ہر چہار جانب سے مکمل آزادی کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایسے میں مولانا حسرت موہانی کی آواز شاید سب سے توانا تھی جس کی وجہ سے غاصب انگریزی حکام و افسران نے اپنے جابرانہ و جارحانہ عمل سے ملک کے باشندگان کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ دوسری جانب انگریزی مشنریاں مسیحیت کو عام کرنے اور ہندوستانی معیشت کی لوٹ میں لگی تھی۔ اس طرح مسلمان اس کے دوہرے مظالم کا شکار تھے۔ ایک طرف انھیں زبردستی عیسائی بنایا جا رہا تھا تو دوسری طرف علمائے اسلام کو نت نئے فروعی مسائل میں الجھایا جا رہا تھا۔ ایسے وقت میں حضرت مولانا مونگیری (مولانا محمد علی مونگیری علیہ رحمۃ) جن کی ربانیت وللٰہیت اور اتباع رسولؐ سے ایک دنیا واقف ہے، انھوں نے انگریزی سازشوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور حضرت منت اللہ رحمانی ان تمام دل سوز مناظر کے چشم دید گواہ ہوئے۔ یہاں یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ کتاب کی تکمیل میں دیگر عوامل و میلانات کی ضرورت کو یکسر نظر انداز کیا گیا جو اس کے استناد میں اضافہ کا سبب ہو سکتا تھا۔ تاہم ایک طرف والد بزرگوار کی سرپرستی اور دوسری طرف حضرت حسین احمد مدنی کی تربیت و قیادت میں پروان چڑھنے کا عمل۔ اس کے علاوہ حضرت فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، ایک صاحب نسبت بزرگ کی خلافت جنھیں ورثے میں ملی ہو، بھلا ایسی شخصیت کیوں نہ قابل فخر ہو۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی پیدائش کے وقت برصغیر ہندوستان اور اس کے ساتھ ہی عالمی منظر نامہ کس تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے اور پہلے باب کے ایک ذیلی عنوان 'امیر شریعت کا عہد' میں کافی حد تک گنجائش تھی لیکن امید کے برخلاف انتہائی اختصار سے کام لیا گیا۔ وسط بہار کا ایک وسیع خطہ قادیانیوں کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے ان تبدیلیوں میں کہا جا سکتا ہے کہ عالم اسلام اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی اور فکری اثاثوں کی پامالی کے نت نئے منصوبے بنائے جا رہے تھے، کتاب کے مشمولات کی روشنی میں ان نکات کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ کتاب کو اس زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ پہلی عالمی جنگ سے دوسری جنگ (1914-1919) تک ملک کی کیا صورت بنی، یقیناً حضرت دامت برکاتہم نے عہد طفلی میں بچشم خود ان سب کا مشاہدہ کیا۔ گویا ہر چند محل انقلابات رہا، والی کیفیت تھی۔ لیکن ان تمام انقلابات سے قطع نظر والد محترم مولانا محمد علی مونگیری کو ہندی مسلمانوں کے تئیں ان کے فکری اثاثوں کے تحفظات کی فکر لاحق رہی۔ گویا عہد طفلی سے شعور کی پختگی تک کے سفر کے دوران حضرت منت اللہ رحمانی کو حالات و حوادث کو سمجھنے اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل و مشکلات کی تدابیر کا ادراک والد کی سرپرستی میں حاصل ہوئی۔ غالباً یہی وجہ رہی کہ والد بزرگوار نے 1927 میں خانقاہ رحمانی کو جامعہ رحمانی میں تبدیل کر دیا کہ شاید قوم و ملت کو عقائد کی درستگی کے ساتھ تعلیمی طور پر بھی بیدار کرنا مقصود تھا۔ یہی جامعہ رحمانی جہاں اب بھی خانقاہ کا نظام روز اول سے بدستور قائم ہے اور جو مولانا ولی رحمانی کے زیر سایہ ایک بڑے خطے، نیز ملک و بیرون تک کے لیے رشد و ہدایت کا مرکز ہے۔

'سوانح حضرت امیر شریعت' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی اوقاف اور محصول کی بابت حکومت کی پالیسیوں کی خلاف حضرت نے جب بحیثیت رکن قانون ساز یہ اپنی آرا پیش کیں تو اس مسئلے کو سلجھانے کی غرض سے کانگریس اعلیٰ کمان کی جانب سے مولانا ابوالکلام آزاد کو پٹنہ بھیجا گیا تاکہ مل بیٹھ کر مسئلے کا کوئی مثبت حل تلاش کیا جا سکے۔ وہیں اس بات سے بھی واقفیت ملتی ہے کہ مسلم پرسنل لا اور خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق حضرت دامت برکاتہم کی کد و کاوش اور جانفشانی شامل رہی۔ اس طرح امیر شریعت کی دینی، ملی و سیاسی خدمات کے تذکرے کے ساتھ کتاب میں ان مخطوطات کا بھی سرسری ذکر ہے جو معاصر مشاہیر قلم اور علمائے عظام نے حضرت امیر شریعت کو وقتاً فوقتاً لکھے یا امیر شریعت کی طرف سے لکھے گئے۔ کتاب پر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا محمد ولی رحمانی اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جیسی مقتدر شخصیات نے اپنی آرا پیش کر کے کتاب کی معتبریت کو چار چاند لگایا ہے۔ البتہ مصنف نے 'اپنی بات' کے تحت محض انھی کا باتوں اعادہ کیا ہے جو کتاب کے مشمولات و مواد میں موجود ہیں، لہٰذا اسے دیباچہ کہنا مناسب نہیں معلوم پڑتا ہے۔

کتاب پی ایچ ڈی کے مقالے پر مبنی ہے اور اسے 'چند کلمات' میں حضرت ولی رحمانی صاحب نے واضح کردیا ہے، تاہم مصنف کو اپنی بات کے تحت اتنی آزادی تو تھی کہ اس موضوع کے انتخاب کے مراحل اور اس سے وابستگی کا وہ کھلے دماغ سے اظہار کرسکتے تھے۔ گویا یہ بھی خوب ہے کہ جن باتوں کا اظہار انھیں کرنا چاہیے حضرت ولی رحمانی نے مختصراً کردیا۔ خود مصنف نے کسی قدر صراحت سے کام لیا ہوتا تو شاید اس طرح امیر شریعت کے تئیں قاری کے والہانہ پن اور عقیدتمندی کو مزید تقویت مل سکتی تھی۔

فکشن

بیاباں سے پہلے

مصنف : غیاث اکمل

قیمت: 93 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر : ثمرین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

'بیاباں سے پہلے' کے خالق غیاث اکمل درس وتدریس سے وابستہ رہ چکے ہیں اور فی الحال جواہرات کے کاروبار سے منسلک ہیں۔ بوراپٹی، پوسٹ جھریا، دھنباد (جھارکھنڈ) سے ان کا تعلق ہے۔ مذکورہ مجموعہ 'بیاباں سے پہلے' ان کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل 'ڈھلان پر رکے ہوئے لوگ' کے عنوان سے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 2015 میں شائع ہوچکا ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں ان کے کل 16 افسانے ہیں جو سماج ومعاشرہ کی عکاسی بخوبی کرتے ہیں، اس کے علاوہ تقریظ کے عنوان سے ڈاکٹر محفوظ الحسن نے کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے ایک اور مضمون حلیم صابر کے قلم کا مرہون منت ہے اس کے علاوہ غیاث اکمل نے خود اپنی افسانہ نگاری کے متعلق خود احتسابی سے کام لیا ہے، ساتھ ہی کتاب کے بیک فلیپ پر معین الدین عثمانی اور شموئل احمد کی تحریر ہے۔ کتاب میں شامل افسانوں کو پڑھتے وقت اندازہ ہوتا ہے کہ غیاث اکمل نے زندگی کا گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کیا ہے اور اس کو ہو بہو اپنے افسانوں میں پیش کردیا ہے جس سے ان کے افسانوں میں ایک تلخ حقیقت کا احساس ہوتا ہے اور چونکہ سچائی ہمیشہ کڑوی ہی لگتی ہے اس لیے ان افسانوں میں تلخی کا عنصر نمایاں ہے جو قاری پر دیرپا اثرات مرتب کرتے ہیں۔

مجموعہ 'بیاباں سے پہلے' کے افسانوں میں عصر حاضر میں رونما ہونے والے واقعات مثلاً غریبی سے جوجھتے ہوئے انسان، ان کا استحصال، مینجمنٹ، سیاست اور کولکری میں کام کرنے والے مزدوروں اور ان کے لواحقین کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جن میں زندگی کی حقیقت عیاں ہے۔ کتاب میں شامل پہلا افسانہ 'وِش پان' کے عنوان سے ہے۔ اس افسانے میں اخلاقی اقدار کا انہدام اور شہرت حاصل کرنے کا یہ ذریعہ دکھایا گیا ہے کہ ڈاکٹر جاوید شہرت اور نوکری حاصل کرنے کے لیے اپنے ضمیر تک کا سودا کرلیتا ہے جہاں اسے مریضوں کا علاج نہیں کرنا ہوتا بلکہ بڑے لوگوں کا ڈاکٹروں کی فہرست میں ایک اضافہ کے طور پر منتخب کیا جاتا ہے جس کے عوض واپسی پر اس کو مستقل نوکری کی لالچ دی جاتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نوکری کے لیے آج انسان اپنا ضمیر تک بیچنے کو تیار ہے، خواہ اس کے لیے کچھ بھی داؤ پر لگانا پڑے اور اسی کے ساتھ اپنی نوکری برقرار رکھنے کے لیے آفس میں دوسرے افسران جیسا سلوک روا رکھنے کو بھی انسان مجبور ہوجاتا ہے اور ایمان داری ترک کرکے بے ایمانی اختیار کرلیتا ہے اور اس طرح رشوت کا بازار گرم ہوتا ہے اسی کو پیش کرتا ہوا افسانہ 'کاغذ کی کشتی' ہے جس میں ممتاز ایک ایمان دار افسر ہے مگر اس کو دوسرے افسران تلخ وتند لہجہ اور خوف سے اس کی ایمان داری پر بے ایمانی کی مہر ثبت کردیتے ہیں۔ کولکری اور اس میں کام کرنے والے مزدوروں سے متعلق اس مجموعے میں 2 افسانے موجود ہیں جو 'تلخ حقیقت' اور 'قصہ تمام' کے عنوان سے ہیں۔

غیاث اکمل کے بیشتر افسانے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور قاری پر ایسی کیفیت طاری کردیتے ہیں کہ وہ بھی ان سے بے حد متاثر اور رنج میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مایوسی وافسردگی چھائی ہوئی ہے اور المیہ اختتام لیے ہوئے ہے ساتھ ہی رشتوں کی ٹوٹتی ہوئی ڈور کو انھوں نے افسانوی انداز میں بخوبی پیش کیا ہے۔

غیاث اکمل نے اپنے زیادہ تر افسانوں میں سماج کے غریب طبقے جو محنت ومشقت کرکے بھی غریبی کی نچلی سطح پر زندگی گزارتے ہیں ان کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ الغرض غیاث اکمل کے افسانوی مجموعے میں ہر طرح کے افسانے پائے جاتے ہیں جو ہمارے سماج کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ افسانوی مجموعہ ''بیاباں سے پہلے'' میں بیشتر افسانوں کو پڑھ کر قاری پر مایوسی وافسردگی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور قاری بلکہ میں خود اپنی بات کروں کہ مجھ پر ان افسانوں کا اتنا اثر ہوا کہ میں رمضانی چاچا اور اس ماں کے تعلق سے سوچتی رہی (نرس) کہ ان کے دلوں پر کیا بیتی ہوگی۔ مگر ان افسانوں کے بعد مایوسی ذرا چھٹتی ہوئی نظر آئی جوان کے افسانے 'درد لا دوا' اور 'خشت مصلحت' سے دور ہوئی۔ یہ دونوں افسانے بھی مذکورہ مجموعے میں شامل ہیں اور یہ رومانی نوعیت کے ہیں۔ 'درد لا دوا' میں تجمل اور بلقیس کے عشق کی داستان ہے۔ اس افسانے کے ذریعہ غیاث اکمل نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر کسی مقصد کو سامنے رکھ کر محنت کی جائے تو کامیابی ضرور ہاتھ لگتی ہے اور اس طرح تجمل نے خوب محنت ومشقت سے کام کرکے ایک اچھی نوکری حاصل کی اور ساتھ ہی اپنی کھوئی ہوئی محبت کو شریک حیات کے روپ میں پالیا۔ اس کے علاوہ 'خشت مصلحت' میں سنیل اور سریتا کی پریم کہانی ہے۔ جس میں ان دونوں کے گھر والے اس لیے اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کردیتے ہیں کیونکہ ان کے گوتر الگ الگ ہیں اور آخر کار کٹر رسم ورواج اور مذہبی نابرابری کے باعث دونوں نے گھر سے بھاگ کر شادی کرلی۔ یہ دونوں افسانے جن میں ایک افسانہ پہلے پہل بیٹی کے رشتے کے لیے امیر خاندان اور اچھی پوسٹ دیکھتا ہے لیکن بعد میں جب لڑکا اچھی پوسٹ پر آجاتا ہے تو رشتہ قبول ہوجاتا ہے جبکہ یہی رشتہ پہلے ٹھکرادیا گیا تھا اور دوسرے میں مذہب اور فرسودہ رسم ورواج سے بھاگنے کی سعی کو پیش کیا گیا ہے۔

غیاث اکمل کے اسلوب کی بات کریں تو ان کا اسلوب اور زبان وبیان بے جا علامات سے پاک ہے۔ آسان وسلیس زبان کے استعمال سے افسانوں کے مفہوم تک رسائی بآسانی ہوجاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں کہاوتیں اور محاورہ بھی ملتے ہیں جن سے افسانوں میں دلکشی پیدا ہوگئی ہے مگر مطالعہ کے وقت اندازہ ہوا کہ شاید انھوں نے پروف ٹھیک سے نہیں پڑھا، یا ان کے املا میں غلطی ہے نیز یہ کہ جدید املا کے استعمال سے انھوں نے گریز کیا ہے اور جس طرح پہلے قدیم املا میں لکھا جاتا تھا جیسے کرونگا، جاؤنگا، لیکر، دیکر، اسکے، لکھینگے، کرینگے، ہملوگ، کیے، لیے، دیئے وغیرہ جیسے الفاظ کی بھرمار ہے اس کے علاوہ موصوف نے چاہیے کی جگہ 'چاہئے' کا استعمال کیا ہے۔ ایک اور بات قابل غور ہے وہ یہ کہ غیاث اکمل نے ہندی الفاظ کو بھی اپنی تحریر میں خوب جگہ دی ہے چند افسانوں کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوا کہ آیا یہ ہندی زبان کا افسانہ ہے یا پھر اردو؟ کچھ جگہوں پر یہ بھی دیکھا گیا کہ 'ے' کے بدلے 'ی' کو فوقیت کا درجہ دیا گیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جملوں کو پڑھتے ہوئے ایسا بھی لگا کہ اس میں کوئی لفظ درمیان میں چھوٹ گیا ہے اور جملہ بے ترتیب ہوگیا ہے یا پھر کھٹک رہا ہے۔ کتاب کے مصنف سے بھی درخواست ہے کہ وہ اس بے ترتیبی کو درست کرلیں۔ کتاب کی قیمت بہتر ہے اور سرورق بھی ٹھیک ہے۔

■

عالمی اردو نامہ

ڈھاکہ بنگلہ دیش میں بین الاقوامی اردو کانفرنس کا انعقاد

ڈھاکہ: اردو محبت کی زبان ہے۔ ہم اردو سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ بہت پہلے سے قائم ہے جو بنگلہ دیش میں اردو زبان وادب کے

فروغ میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار مہمان خصوصی اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر اخترالزماں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ عالمی کانفرنس (27 اور 28 جنوری) کے افتتاحی اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کانفرنس میں شریک تقریباً ایک درجن ممالک کے نمائندوں کا پرتپاک استقبال کرتے ہوئے پراعتماد انداز میں مزید کہا کہ شعبۂ اردو کی یہ عالمی اردو کانفرنس نئی صدی میں اردو ادب کا خاص مطالعہ پیش کرے گی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اس موقعے پر اپنے خطاب میں کہا کہ اردو ہندوستان میں پلی بڑھی ہے مگر پوری دنیا میں اس کی عظمت کا پرچم بلند ہے۔ جن ممالک میں اردو کو مقبولیت عام حاصل ہوئی، ان میں بنگلہ دیش بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بنگلہ دیش میں اردو زبان کی جڑیں بہت مضبوط ہورہی ہیں۔ یہاں اردو بولنے والوں کی اچھی خاصی تعداد پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے بلکہ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہاں سے اردو رسائل واخبارات نکلتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں اردو صحافت کا موجودہ منظرنامہ قابل رشک ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ بنگلہ اور اردو زبان کے مضبوط تعلق کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ بنگلہ اور اردو زبان میں سیکڑوں الفاظ مشترک ہیں۔ بنگلہ دیش سے ہمارا رشتہ صرف لسانی وثقافتی سطح پر ہی نہیں بلکہ سماجی، معاشی، سیاسی، اور صنعتی سطح پر بھی ہے۔ اس موقعے پر صبیح بخاری (قطر) نے شعبۂ اردو کے دو ٹاپرس (ایک طالب علم اور ایک طالبہ) کو ہر سال بزم صدف کی طرف سے نقد رقم اور نشان یادگار دیے جانے کا بھی اعلان کیا۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر محمودالاسلام، پروفیسر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر ولا جمال سعد احمد نے کی جس میں ڈاکٹر صفدر امام قادری، تسلیم عارف، ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی، ڈاکٹر محمد گوہر، پروفیسر ڈاکٹر شہیدالاسلام (راج شاہی) نے مقالے پیش کیے۔

تیسرے اجلاس (بعنوان 'اردو نان فکشن') کی صدارت ڈاکٹر رشید احمد، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اور سید قمر الہدیٰ نے کی۔ مقالے پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد ڈھاکہ، نیلوفر اختر پٹنہ، غلام مولا، ڈاکٹر رضا الکریم، نے پیش کیے۔

چوتھا اجلاس بعنوان 'اردو شاعری' پروفیسر ڈاکٹر اسرافیل، ڈاکٹر صفدر امام قادری، شہاب الدین احمد کی صدارتی مجلس کے تحت منعقد ہوا۔ اس میں جن مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں ڈاکٹر زاہد الحق حیدرآباد، ڈاکٹر رشید احمد ڈھاکہ، حسین البنا ڈھاکہ، حفصہ اختر ڈھاکہ، ڈاکٹر لطیف احمد راج شاہی (بیرسٹر سعدیہ ارمان ڈھاکہ کے نام خاص ہیں۔ شام چھ بجے مجمدار آڈیٹوریم میں ایک شاندار عالمی مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا جس میں بنگلہ دیش سمیت تقریباً پچیس شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان میں صبیح بخاری قطر، احمد الیاس بنگلہ دیش، شہاب الدین احمد قطر، سرور غزالی جرمنی، ولا جمال مصر، جلال عظیم آبادی بنگلہ دیش، ارمان شمسی بنگلہ دیش، شمیم زمانوی بنگلہ دیش، اشفاق احمد قطر، شائستہ حسن ناروے کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کانفرنس کے دوسرے دن پانچواں اجلاس بعنوان 'اردو فکشن' منعقد ہوا، جس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر جعفر احمد بھوئیاں، ڈاکٹر زاہدالحق اور سرور ظہیر نے انجام دیے اور مقالے پروفیسر اسلم جمشید پوری میرٹھ، پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی بنگلہ دیش، ڈاکٹر محمد کاظم دہلی، ڈاکٹر صوفیہ شیرین کلکتہ، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی بھارت نے پڑھے۔

چھٹا اجلاس 'نئی بستیوں میں اردو' کے عنوان سے منعقد کیا گیا۔ جس میں مقالہ نگار کی حیثیت سے سید سرور ظہیر جرمنی، شائستہ حسن ناروے، ڈاکٹر ولا جمال سعد احمد مصر، سید قمر الہدیٰ کناڈا نے شرکت کی اور صدارت کی ذمے داری پروفیسر ڈاکٹر نصیرالدین، ڈاکٹر محمد گوہر اور فہیم اختر نے نبھائی۔

ساتویں اجلاس بعنوان 'تاریخ' میں جن مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے ان کے نام اس طرح ہیں: پروفیسر ڈاکٹر اسرافیل ڈھاکہ، فہیم اختر برطانیہ، توصیف احمد ڈار کشمیر، ڈاکٹر محمد سمیع الاسلام راج شاہی، ارمان شمسی ڈھاکہ، ان م احسان المالکی ڈھاکہ، ڈاکٹر محمود الاسلام ڈھاکہ۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر پروفیسر غلام ربانی، پروفیسر ڈاکٹر محمد کاظم اور شائستہ حسن نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خیالات بھی پیش کیے۔ اختتامی اجلاس میں بیرونی ممالک کے مندوبین نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ شعبے کی طرف سے کامیاب کانفرنس پر شکریہ ادا کیا گیا اور مقالہ نگاروں کو سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 29 جنوری 2020

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں فارسی زبان وادب پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کا سارا سرمایہ فارسی زبان وادب میں محفوظ ہے۔ آٹھ سو سالہ تاریخ پر محیط عہدِ وسطیٰ میں فارسی زبان وادب کے حوالے سے مختلف النوع کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں۔ اس کے باوجود فارسی زبان

وادب کی مربوط تاریخ کا فقدان ہے۔ اس کمی کو دیکھتے ہوئے قومی اردو کونسل نے ایک مبسوط اور معتبر تاریخ کی ضرورت محسوس کی ہے تاکہ فارسی اور عہدِ وسطیٰ کے سرمائے کو نئی نسل تک پہنچایا جاسکے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ فارسی زبان وادب کے پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں صلاحیت پیدا کرنے کے لیے فارسی کا جاننا بہت ضروری ہے۔ بغیر فارسی کی افہام وتفہیم کے اردو زبان وادب پر عبور حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ یہ منصوبہ گزشتہ کئی سالوں سے زیرِ غور رہا ہے، تاہم اب اسے حتمی طور پر آئندہ چھ ماہ میں مکمل کرلیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ فارسی زبان وادب کی تاریخ کو چار ابواب میں منقسم کیا گیا ہے اور ہر باب کے کئی ذیلی ابواب ہوں گے۔ اس کام کی تکمیل کے لیے ماہرینِ فارسی کی مدد لی جارہی ہے۔

اس موقعے پر سید پروفیسر حسن عباس نے کہا کہ فارسی زبان وادب کی تاریخ کے منظرِ عام پر آنے کے بعد واقعی قومی اردو کونسل کی تاریخ میں ایک نئے روشن باب کا اضافہ ہوگا اور نئی نسل ملک کے مختلف حصوں میں بکھرے پڑے فارسی زبان وادب سے متعلق علوم وفنون سے آشنا ہوگی۔ پروفیسر ایچ ایس قاسمی نے کہا کہ ہم قومی اردو کونسل، بالخصوص جواں سال ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے ممنون ہیں جو ہندوستان کی گزشتہ سات سو سالہ تاریخ کو قلم بند کرنے کے لیے کوشاں ہیں جو یقیناً ایک غیر معمولی کام ہے۔ پینل کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کہا کہ یہ ایک انتہائی اہم موضوع ہے جس پر کونسل نے کام کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کے مختلف خطوں میں فارسی زبان وادب کا غلبہ تھا اور شعرا وادبا نے اپنی جو تخلیقات پیش کی ہیں، وہ اس عہد کی ترجمانی کرتی ہیں جسے ایک مربوط اور مبسوط شکل میں لانے کی بات ہورہی ہے۔ پینل میں پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر عبدالحلیم کے علاوہ کونسل کے اکیڈمک اسسٹنٹ ڈائریکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، ڈاکٹر فیروز عالم اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اور جناب ساجد الحق کے ساتھ ڈاکٹر شاہد اختر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 20 جنوری 2020

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں یوم جمہوریہ کے موقع پر پرچم کشائی کی تقریب

نئی دہلی: اردو نے جمہوری اقدار کی پاسداری اور تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے شعرا نے اپنی شاعری اور نثر نگاروں نے اپنی نثری نگارشات کے ذریعے ملک کی تعمیر وترقی اور امن ویکجہتی کو آگے بڑھایا ہے۔ اردو گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ اور بھائی چارے کی زبان ہے۔ اس نے ہمیشہ ملک میں محبت کو فروغ دیا۔ ان خیالات کا

اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے یوم جمہوریہ کے موقع پر منعقدہ پرچم کشائی کی تقریب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح ہمارے اسلاف نے ملک کی آزادی اور تعمیر وترقی کے لیے جدوجہد کی اور نوع بہ نوع قربانیاں پیش کیں، اسی طرح ہمیں بھی اپنے ملک کے تئیں ہمیشہ قربانی کا جذبہ رکھنا چاہیے اور ملک کو آگے بڑھانے کے لیے ایمانداری اور دیانتداری سے کام لینا چاہیے۔ واضح رہے کہ یوم جمہوریہ کے موقع پر قومی اردو کونسل جسولہ میں ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے پرچم کشائی کی اور کونسل کے عملہ کے ساتھ قومی ترانہ 'جن گن من' بلند آواز سے پیش کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 27 جنوری 2020

ڈاکٹر عبدالحی اور ڈاکٹر شاہد اختر کو الوداعیہ

نئی دھلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر جسولہ میں ماہنامہ اردو دنیا، سہ ماہی فکر و تحقیق ، ماہنامہ بچوں کی دنیا اور ماہنامہ خواتین دنیا کے نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحی اور اسسٹنٹ پروجیکٹ کے عہدے پر فائز شاہد اختر کے لیے ایک الوداعی تقریب کا انعقاد کیا گیا، جس

میں کونسل کے آفس سے وابستہ تمام افراد نے شرکت کی۔ اس موقع پر قومی کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے ڈاکٹر عبدالحی اور ڈاکٹر شاہد اختر کی خدمت میں تحائف پیش کیے اور ڈاکٹر عبدالحی اور ڈاکٹر شاہد اختر کی خدمات کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ جس محنت، لگن اور اخلاص کے ساتھ ان دونوں نے قومی کونسل کے لیے اپنی خدمات پیش کیں، انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر عبدالحی اور ڈاکٹر شاہد اختر قریب گزشتہ ایک دہائی سے قومی کونسل کے شعبۂ ادارت سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر عبدالحی مذکورہ چاروں رسالوں کے نائب مدیر کی حیثیت سے کام کررہے تھے اور شاہد اختر ان کی معاونت کے فرائض انجام دے رہے تھے، گزشتہ دنوں بہار میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ان دونوں حضرات کا تقرر ہوا ہے۔ ڈائریکٹر صاحب کے علاوہ دیگر قومی کونسل کے دوسرے افسران نے اس موقع پر اپنے خیالات و تاثرات پیش کیے۔

اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالحی نے کہا کہ کونسل میں ان کا بہت اچھا وقت گزرا اور یہاں سے انھیں بہت کچھ سیکھنے اور آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے ڈائریکٹر صاحب کے ذریعہ دیے گئے اعزازات کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر شاہد اختر انصاری نے اپنے خوشی و غم کے ملے جذبات کا اظہار کچھ یوں کیا کہ قومی اردو کونسل میں بتی ساعتیں مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی۔ انھوں نے کہا کہ یہاں سب لوگ بڑے ہمدرد اور مخلص ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ و مشفقانہ انداز میں پیش آتے ہیں۔

قومی اردو کونسل کا موبائل وین ٹور پروگرام (تلنگانہ، کرناٹک اور مہاراشٹر)

48 واں فیز

نمبر شمار	صدر دفتر	
1.	مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد (تلنگانہ)	4 تا 8 فروری 2020
2.	ظہیرآباد (تلنگانہ)	9 تا 10 فروری 2020
3.	گلبرگہ (کرناٹک)	11 تا 13 فروری 2020
4.	شولاپور (مہاراشٹر)	14 تا 17 فروری 2020
5.	عثمان آباد (مہاراشٹر)	18 تا 19 فروری 2020
6.	لاتور (مہاراشٹر)	20 تا 22 فروری 2020
7.	امباجوگی (مہاراشٹر)	23 تا 24 فروری 2020
8.	پرلی (مہاراشٹر)	25 تا 26 فروری 2020
9.	بیڑ (مہاراشٹر)	27 فروری تا 1 مارچ 2020

رابطہ: وی صدیق: موبائل نمبر: 9990597329, 8920490683

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

عابد سہیل: شخصیت اور خدمات

لکھنؤ: عابد سہیل بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے، انھوں نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی، صحافت سے بھی وابستہ رہے، لیکن اصلاً وہ افسانہ نگار تھے۔ فکشن ان کی شخصیت کا احاطہ کرتا ہے، ان کا اسلوب اور زبان افسانے کی ہے، عابد سہیل کی صفت یہ ہے کہ انھوں نے کم افسانے لکھے، لیکن اس کے باوجود ان کے افسانوں نے دیرپا اثرات مرتب کیے، وہ اپنے افسانوں کے اندر جیتے تھے، ان کے افسانوں کے کردار بہت متاثر کن ہوتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر شارب ردولوی نے اتوار کو یوپی پریس کلب میں نجب النسا میموریل ٹرسٹ کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے 'عابد سہیل شخصیت اور خدمات' کے موضوع پر منعقد سمینار میں صدارت کرتے ہوئے کیا۔ ڈاکٹر صبیحہ انور نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ عابد سہیل کی شخصیت بڑی عجیب طرح کی تھی، وہ بہت زیادہ محتاط رہتے تھے، سادہ دل اور منکسر المزاج تھے۔ انھوں نے عابد سہیل کی آپ بیتی 'جو یاد رہا' کے حوالے سے تفصیلی اور کارآمد گفتگو کی۔ مہمانِ خصوصی سینئر صحافی احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ اردو کے ممتاز فکشن نگار اور صحافی عابد سہیل کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے صرف فکشن میں اپنی شناخت مستحکم نہیں کی، بلکہ تنقید میں بھی اپنا اعتبار قائم کیا۔ مہمانانِ اعزازی شیخ عبدالماجد ندوی، اور شکیل صدیقی نے کہا کہ عابد سہیل ممتاز افسانہ نگار اور ایک باکمال صحافی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی کئی اہم اور پرمغز مقالے پیش کیے۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 4 فروری 2020

عندلیب گلشن نا آفریدہ

لکھنؤ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور موسسہ مطالعات فارسی ہند کے تعاون سے لائف گیٹ ہیومن سوسائٹی کے تحت 'غالب: عندلیب گلشن نا آفریدہ' کے عنوان سے ایک روزہ قومی سمینار ریجنل سائنس سٹی میں منعقد ہوا جس کے افتتاحی اجلاس میں بحیثیت صدر راجکمار امیر عالم خان، راجکمار محمود آباد و بحیثیت مہمان خصوصی پروفیسر عقیل احمد نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ارشد القادری اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی نے سمینار کی نظامت کی اور کرن ورما ریجنل آرٹسٹ ریجنل سائنس سٹی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ اس موقعے پر سمینار میں کلیدی خطاب کرتے ہوئے پروفیسر سید اختر حسین نے کہا کہ مرزا اسداللہ خاں غالب عہد حاضر کا ایک باب تھا۔ مرزا غالب کا روزمرہ کے کاموں میں انتہائی حد تک دل تھا۔ مرزا غالب کو سمجھنے کے لیے پہلے ان کے اشعار کو سمجھنا ہوگا۔ ان کے اشعار پڑھے اور سمجھے بغیر مرزا غالب کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر تقی عثمانی، احمد عرفان علیگ، کرن ورما، راج کمار امیر عالم نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سمینار کے کنوینز لائف گیٹ ہیومن سوسائٹی کے سکریٹری محمد رضوان احسن نے شکریہ ادا کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد دو تکنیکی سیشن منعقد ہوئے جن میں ملک کے نامور محققین و اسکالرس نے اپنے پرمغز مقالات پیش کیے جن میں پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی، پروفیسر عارف ایوبی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی و چیئرمین فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، ڈاکٹر شعیب لکھنؤ یونیورسٹی، ڈاکٹر نکہت فاطمہ مانو کیمپس لکھنؤ، ڈاکٹر سرفراز عالم مانو کیمپس لکھنؤ، ڈاکٹر غلام معین الدین مولانا آزاد کالج کلکتہ، ڈاکٹر سمیع الدین خضر پور کالج کلکتہ، ڈاکٹر خالد محمد زبیر مولانا آزاد کالج کلکتہ، ڈاکٹر محمد فیروز جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد ابرارالحق جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں لوگ موجود تھے۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 3 جنوری 2020

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

’بچوں کی دنیا‘ کے خصوصی شمارے کی مقبولیت

اورنگ آباد: طلبا میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے کے لیے ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن اورنگ آباد کی جانب سے یکم جنوری تا 31 جنوری ’پڑھو اور آگے بڑھو‘ کے عنوان سے مہم چلائی گئی تھی۔ اس مہم سے مہاراشٹر کے مختلف اردو اسکولوں میں قومی اردو کونسل دہلی سے شائع ماہنامہ ’بچوں کی دنیا‘ کے توسط سے طلبا سے خطاب کیا گیا۔ اردو اخبارات رسائل و جرائد کے تئیں بیداری پیدا کی گئی اور انھیں خرید کر پڑھنے کے لیے تعارف کے طور پر ماہنامہ ’بچوں کی دنیا‘ کا 26 جنوری پر شائع خصوصی شمارہ طلبا کو تحفے میں دیا گیا۔ فاؤنڈیشن نے اپنے دوست واحباب کے تعاون سے ’بچوں کی دنیا‘ کی پانچ ہزار کاپیاں مختلف اردو اسکولوں میں تقسیم کی۔ واضح رہے کہ ملک میں سب سے زیادہ رسالہ ’بچوں کی دنیا‘ اورنگ آباد میں پڑھا جاتا ہے۔ فاؤنڈیشن کے صدر مرزا عبدالقیوم ندوی نے کہا کہ ’بچوں کی دنیا‘ اس سال 12500 کاپیاں منگوائی گئی تھیں۔ مشن ’پڑھو اور آگے بڑھو‘ کے تحت اورنگ آباد، جالنہ، بیڑ، پربھنی، احمد نگر و دیگر اضلاع کے اسکولوں میں پہنچ کر طلبا سے کتابوں اور مطالعے کی اہمیت وضرورت پر خطابات کیے گئے۔ ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن کے صدر مرزا عبدالقیوم ندوی نے کہا کہ موجودہ دور میں درسی کتابوں کے علاوہ خارجی مطالعے کو بڑی اہمیت حاصل ہے، دنیا میں تیزی سے تغیرات وتبدیلیاں رونما ہورہی ہیں جن کا ہمیں علم ہونا بہت ضروری ہے اور یہ علم ہمیں کتابوں سے ہی حاصل ہوسکتا ہے اس کے لیے طلبا درسی کتابوں کے علاوہ خارجی کتابوں، مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات، رسائل و جرائد کا پابندی سے مطالعہ کریں۔ فاؤنڈیشن کے صدر مولانا ندوی نے کہا کہ روزانہ پابندی کے ساتھ غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہنے سے آپ کے علم میں اضافہ ہوگا اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ریاستی، قومی سطح پر منعقدہ ہونے والے مقابلہ جاتی امتحانات میں آپ حصہ لے سکتے ہیں۔ ’بچوں کی دنیا‘ (ماہنامہ) حکومت ہند کے ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی سے اردو میڈیم کے بچوں کے لیے شائع کیا جاتا ہے اور اس کی قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے تاکہ اسے طلبا آسانی سے خرید سکیں صرف دس روپے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل فاؤنڈیشن کی جانب سے مشن ’گھر گھر کتاب، ہر گھر میں کتاب‘ کے تحت سرپرستوں اور اساتذۂ کرام کے تعاون سے عوام میں مطالعہ بیداری مہم چلائی گئی تھی۔ اس مہم میں مختلف پروگراموں کے ذریعے لوگوں سے کتابیں خرید کر پڑھنے پر زور دیا گیا تھا ساتھ ہی شہر میں موجود عوامی کتب خانوں تک عوام کی رسائی کیسے ہو اس پر سماجی و تعلیمی تنظیموں کے ذمے داران سے گفتگو کر کے عوام کی توجہ کتب خانوں میں رکھی بے شمار کتابوں سے استفادہ کی طرف مبذول کرائی گئی تھی۔ شہر میں منعقد ہونے والے جلسوں، پروگراموں اور تعلیمی ورکشاپوں میں کتابوں کے اسٹال لگائے گئے۔ اسکولوں میں کتابوں کی نمائش رکھی گئی۔ طلبا میں کتابیں خرید کر پڑھنے کا شوق پیدا ہو اس کے لیے پانچ ہزار ’کلک‘ تقسیم کیے گئے۔ مختلف قومی، سماجی شخصیات کی یوم پیدائش پر ماہنامہ بچوں کی دنیا کے خصوصی شمارے تقسیم کیے گئے۔ کل ملاکر ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن کی جانب سے گذشتہ دو سالوں میں اٹھارہ ہزار کتابیں تقسیم کی گئیں۔ شہر کے مرچی کے تاجر مرزا افسر بیگ نے اپنے بیٹے کی شادی کے موقعے پر 1000 (ایک ہزار روپے) ماہنامہ ’بچوں کی دنیا‘ کی کاپیاں خرید کر تقسیم کی۔ اس طرح کی معلومات فاؤنڈیشن کے صدر مرزا عبدالقیوم ندوی نے اخباری نمائندوں کو دی۔

روزنامہ ’شمع رہبر‘ اورنگ آباد، 5 فروری 2020

دہلی :

آئی سی ٹی ٹولس ان ریسرچ

نئی دہلی: ریسرچ میں انفارمیشن اینڈ کمیونیکیشن ٹکنالوجی

کی کافی اہمیت ہے اور اس کے ذریعے ہی ریسرچ میں پختگی آتی ہے اور یہیں سے ریسرچ کے رموز وضوابط سے آگہی ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سنٹر فار ڈسٹنس اینڈ اوپن لرننگ کے ڈائرکٹر (اکیڈمک) پروفیسر احرار حسین نے کیا۔ انھوں نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ کسی بھی ادارے میں ریسرچ کے معیار سے اس ادارے کی اہمیت واضح ہوتی ہے کیونکہ ریسرچ ایک ایسا شعبہ ہے جس کے ذریعے نئی جہتیں وا ہوتی ہیں۔ پروفیسر حسین نے کہا کہ ڈسٹنس اینڈ اوپن لرننگ میں بھی ریسرچ کو فروغ دیے جانے کی جانب پہل کی جانی چاہیے تاکہ ریسرچ میں اضافہ ممکن ہوسکے۔ پروفیسر حسین نے آئی سی ٹی، سوشل نیٹ ورکنگ، موبائل ٹکنالوجی، ویئریبل ٹکنالوجی پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی اوپن اینڈ ڈسٹنس ایجوکیشن سے تعلق کو واضح کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ارجن سنگھ سنٹر فار ڈسٹنس اینڈ اوپن لرننگ کی جانب سے ’آئی سی ٹی ٹولس ان ریسرچ‘ کے عنوان سے لیکچر کا انعقاد عمل میں آیا۔ سنٹر کے ڈائرکٹر (اکیڈمک) پروفیسر احرار حسین نے کہا کہ حکومت کی جانب سے لگاتار ٹکنالوجی کو فروغ دینے کی کوشش کی جارہی ہے، لہٰذا سنٹر فار ڈسٹنس بھی ٹکنالوجی کو فروغ اور تقویت بخشنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ اس موقعے پر آئی سی ٹولس پلیٹ فارم اور اس کے ٹولس، ویڈیو میکنگ اینڈ ایڈیٹنگ سمیت سافٹ ویئر اور ڈسٹنس ایجوکیشن میں سافٹ ویئر کے استعمال پر گفتگو ہوئی۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سنٹر فار ڈسٹنس اینڈ اوپن لرننگ کے ڈائرکٹر (ایڈمنسٹریشن) آر پی بہوگنا نے کے علاوہ ڈپٹی ڈائرکٹرز، اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک کوآرڈینیٹر ودیگر نے شرکت کی۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 14 جنوری 2020

اترپردیش :

فارسی، عربی اور اردو زبان وادب کے فروغ میں نوابین وراجگان اودھ کا حصہ

لکھنؤ: لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقیہ کے زیراہتمام ’فارسی، عربی اور اردو زبان وادب کے فروغ میں نوابین و راجگان اودھ کا حصہ‘ کے عنوان سے منعقدہ بین الاقوامی سیمینار کے پہلے تکنیکی اجلاس میں پروفیسر عزیز الدین، سابق ڈائرکٹر رامپور رضا لائبریری، پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی، سابق صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، پروفیسر قمر جہاں،

سابق شعبۂ اردو بنارس یونیورسٹی، ڈاکٹر ابوذر متین، ڈاکٹر مظاہر علی رضوی، ڈاکٹر شائستہ پروین، ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی، ڈاکٹر عابد حسین حیدر اور ڈاکٹر ریحان حسن نے موضوع کے تعلق سے نہایت جامع اور پرمغز مقالے پیش کیے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر ایاز احمد اصلاحی اور پروفیسر احسن الظفر نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد قمر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی نے انجام دیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عزیز الدین، پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی اور پروفیسر حسنین اختر نے کی۔ متعدد مقالہ نگاروں نے مختلف ذیلی عناوین کے تحت اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے اور سامعین کے سوالات کا جواب بھی دیا۔ اس اجلاس کے مقالہ نگاروں میں تہران سے تشریف لائے پروفیسر احمد جوالائی کے علاوہ پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر فاطمہ بیگم پروین، پروفیسر خورشید فاطمہ حسینی، ڈاکٹر سعد بن مخاشن، ڈاکٹر سعدیہ جعفری، ڈاکٹر نیلوفر حفیظ، پروفیسر علیم اشرف دہلی یونیورسٹی، پروفیسر آصف نعیم نے پرمغز مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر عرفات ظفر نے انجام دی۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر علیم اشرف، پروفیسر اخلاق آہن، پروفیسر عزیز الدین، پروفیسر جوالائی نے کی جس میں تقریباً دس سے زیادہ مقالے پڑھے گئے۔ چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر قمر جہاں، پروفیسر عبدالقادر جعفری اور پروفیسر آقائی جوالائی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر منتظر قائمی نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں ایک درجن سے زائد مقالے پڑھے گئے۔ سارے اجلاس میں اساتذہ کے علاوہ ریسرچ اسکالر اور طلبا نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ پروگرام کے آرگنائزنگ سکریٹری ڈاکٹر ارشد علی جعفری نے تمام مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 29 جنوری 2020

ہندوستان-ازبکستان کے تاریخی اور قدیمی روابط پر مبنی نمائش کا افتتاح

رامپور: رامپور رضا لائبریری میں ہندوستان-ازبکستان کے تاریخی اور قدیمی روابط سے متعلق مخطوطات اور مصوری کے نمونوں پر مشتمل نمائش کا افتتاح ہندوستان میں ازبکستان کے سفیر جناب فرہاد عرضیو اور ڈائرکٹر پروفیسر سید حسن عباس نے مشترکہ طور پر کیا۔ واضح رہے کہ رامپور رضا لائبریری میں مخطوطات کی بڑی تعداد موجود ہے جس میں ازبکستان سے متعلق مصنفین، کاتبین اور تذکرہ نویسوں

کی تصانیف موجود ہیں جن میں مصوری کے کچھ بے حد اہم نمونوں اور رضا لائبریری کے اہم مخطوطات میں سے چند کو نمائش میں رکھا گیا ہے۔ نمائش دیکھ کر ازبکستان کے سفیر اور ان کے ہمراہ آنے والوں نے ازبکستان کی تاریخ وثقافت اور علوم وفنون سے متعلق نادر ونایاب مخطوطات کی موجودگی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا کہ یہی وجہ ہے کہ رضا لائبریری کو ازبکستان میں بھی جانتے ہیں اور اس لائبریری کا نام ازبکستانیوں کے لیے غیر معروف نہیں ہے۔ رضا لائبریری کے دربار ہال اور دیگر شعبوں کو دیکھنے کے بعد ازبکستان کے سفیر نے ڈائرکٹر رضا لائبریری پروفیسر سید عباس سے مستقبل قریب میں ازبکستان میں بھی رضا لائبریری میں موجود مصوری کے نمونوں اور مخطوطات کی مشترکہ نمائش کے اہتمام کی خواہش کا اظہار کیا۔ سفیر محترم کے اعزاز میں کانفرنس ہال میں ایک مختصر تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں عالمی شہرت یافتہ شاعر اظہر عنایتی کو قطر میں 'کاروانِ اردو قطر' کی جانب سے منعقدہ 'جشن اظہر' میں اعزاز سے نوازے جانے پر رضا لائبریری کے ڈائرکٹر سید حسن عباس، لائبریرین ابوسعد اصلاحی اور سفیر ازبکستان نے انھیں گلدستہ، شال اور رضا لائبریری کی طرف سے نشان امتیاز دے کر مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 فروری 2020

لکھنؤ یونیورسٹی کا صد سالہ جشن

لکھنؤ: لکھنؤ یونیورسٹی کے صد سالہ جشن کے موقعے پر شعبۂ علوم مشرقیہ کے تحت سہ روزہ بین الاقوامی سمینار کے

اختتامی اجلاس کا انعقاد بدھ کو یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں ہوا۔ سہ روزہ سمینار میں ملک وبیرون ملک کی متعدد دانش گاہوں کے دانشوروں اور مفکروں نے تقریباً سو سے زائد مقالے پیش کیے۔ بین الاقوامی سمینار کی اختتامی تقریب میں بطور مہمان خصوصی معروف فلم ساز وہدایت کار مظفر علی نے شرکت کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ فن اور زبان ہی وہ واحد راستہ ہے جو مختلف قوموں اور انسانوں کو باہمی ربط عطا کرتا ہے۔ اودھ کی تہذیب اور ادبی روایت کے تعلق سے موصوف نے فرمایا کہ اگر ہم اپنے اس قیمتی سرمایہ کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو یہ نہ صرف اودھ بلکہ پورے قوم وملک کی خدمت کے متوازی ہوگا۔ مہمان ذی وقار نواب جعفر میر عبداللہ نے اودھ کی مشترکہ تہذیبی اقدار کی بقا اور حفاظت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے نوابین اودھ کی انسان دوستی اور فنون لطیفہ میں گہری دلچسپی کے معاشرتی پس منظر پر اظہار خیال کیا۔ سابق آئی اے ایس ڈاکٹر انیس انصاری نے اپنے خطبہ میں تہذیب وثقافت کے سیاست سے باہمی تعلق پر اظہار خیال کیا۔ ایرا میڈیکل یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر عباس علی مہدی نے اودھ کے حکمرانوں اور راجاؤں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس طرف کے سمیناروں کی افادیت پر زور دیا نیز سمینار کی کامیابی کے لیے ڈاکٹر ارشد علی جعفری اور دیگر اراکین مجلس انتظامیہ کو مبارکباد دی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پروفیسر عزیز الدین ہمدانی نے اودھ کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے مختلف ادبی وعلمی مراکز کی خدمات کا جائزہ لیا۔ تہران یونیورسٹی، ایران کے پروفیسر احمد جوالائی نے ہند-ایرانی تہذیب کے نقوش کی بازیافت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے نوابین وراجگان اودھ کی فارسی خدمات کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے کلاسیکی ادب کے مطالعہ کی افادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے قدیم متون کی بازدید کی ضرورت پر زور دیا۔ ایران کی شقائق دلشاد نے عہد حاضر میں ہندوستان وایران کے درمیان ثقافتی وادبی روابط کو مزید مستحکم بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پروفیسر عراق رضا زیدی نے سہ روزہ بین الاقوامی سمینار کی کامیابی کے لیے ذمہ داران کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی کہ جلد ہی کتاب کی صورت میں ان تمام مقالوں کی اشاعت بھی عمل میں آئے گی۔ اختتامی اجلاس کی صدارت معروف نقاد ولکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو

کے سابق صدر پروفیسر انیس اشفاق نے کی۔ انھوں نے اودھ کی تاریخ اور ثقافت کی حقیقی تصویر پیش کرنے میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اور ان کے بیٹے پروفیسر نیر مسعود کی کاوشوں کی تحسین کرتے ہوئے 'اودھ کا شاہی اسٹیج' اور 'اودھ کا عوامی اسٹیج' جیسی اہم کتابوں کے مطالعہ نیز ان کی طباعت واشاعت کی ضرورت پر اظہار خیال کیا۔ اجلاس کے آخر میں بین الاقوامی سیمینار کے آرگنائزنگ سکریٹری ڈاکٹر ارشد علی جعفری نے بیرونی وملکی مہمانوں کے ساتھ سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اختتامی اجلاس کی نظامت خواجہ معین الدین چشتی، اردو، عربی فارسی یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر مرتضیٰ علی اطہر جائسی نے کی۔ تمام مقالہ نگاروں کو مہمان خصوصی اور مہمانان ذی وقار کے ہاتھوں یادگاری نشان پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 جنوری 2020

بابا فرید پر توسیعی خطبہ

امروھہ: ممتاز صوفی اسکالر اور ادیب پروفیسر ناشر نقوی نے پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں منعقدہ اپنے توسیعی خطبے میں کہا کہ برصغیر ہند و پاک کی روحانی طرز معاشرت کی جو عمارت ہے اس کے مضبوط ستون بابا فرید گنج شکر ہیں۔ چشتیہ نظامیہ فریدیہ اور صابریہ ہر صوفی خاندان بابا فرید کو مرکزیت دیتا ہے۔ خواجہ غریب نواز، کی قطب صاحب، محبوب الٰہی حضرت نظام الدین بابا فرید کو اپنے سے قریب رکھتے تھے۔ امیر خسرو اور علاؤالدین کلیری فریدی روحانیت کے مبلغ تھے۔ ان بزرگوں کی دعائیں اور عطائیں ہی ہماری تہذیب کی بنیاد ہیں۔ پروفیسر نقوی نے کہا کہ بابا فرید واحد ایسے صوفی اور شاعر ہیں کہ ان کا کلام آیات کی طرح گورو گرنتھ صاحب میں شامل ہے۔ ایسے بزرگوں نے ہی نفرت اور تعصب کی دیواریں گرائی ہیں۔ انھوں نے غیریت کو ختم کیا۔ یونیورسٹی کے وی سی پروفیسر بی ایس گھمن نے صدارتی تقریر میں کہا کہ صوفیوں کی شہرت دلوں میں بھروسہ پیدا کرنے سے ہوتی ہے کسی سیاسی قانون سے نہیں ہوتی۔ ڈین اکادمک پروفیسر جی ایس بترا نے صوفی سینٹر کے مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ آج کی نسل اور طلبا میں اخوت اور اعتماد بحال کرنے کی سخت ضرورت ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب تصوف کا شعور زندگی کا منشور بنایا جائے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 جنوری 2020

بہار: ————————————

نئی نسل اور اردو: حالات و اقدامات

بھاگلپور: اردو ڈائرکٹوریٹ بہار پٹنہ کے زیر اہتمام اردو اساتذہ گول میز کانفرنس بمقام ابھی لیکھ بھون، پٹنہ میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر اسلم جاوداں نے بخوبی انجام دیے۔ گول میز کانفرنس کا موضوع تھا 'نئی نسل اور اردو حالات و اقدامات' اس کانفرنس میں مونگیر یونیورسٹی کے ایسوی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر شاہد رضا جمال (شاہد رزمی) نے شرکت کی۔ دیگر مندوبین میں پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، پروفیسر منظر اعجاز، ڈاکٹر جاوید حیات، پروفیسر حسین احمد، ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، ڈاکٹر انور ایرج، ڈاکٹر محسن رضا رضوی، ابوبکر رضوی، ڈاکٹر سورج دیو سنگھ، ڈاکٹر ممتاز احمد وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ اس کانفرنس میں یادگاری خطبے کے لیے پٹنہ تشریف لائے دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر مولا بخش خصوصی طور پر مدعو تھے۔ اس کانفرنس میں مندوبین نے اردو کی صورت حال، مسائل اور عملی اقدامات وتجاویز پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اخیر میں ڈاکٹر امتیاز احمد کریمی نے تمام شرکا کا کانفرنس میں آمد پر اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی 4 فروری 2020

جشن اردو

سہرسہ: فروغ اردو سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کوسی کمشنری کے مشہور آرتھوپیڈک سرجن اور انڈین ریڈ کراس سوسائٹی کے چیئرمین الحاج ڈاکٹر ابوالکلام نے کہا کہ ہم جب تک زمینی سطح سے بچوں کی ذہن سازی نہیں کریں گے اس وقت تک بچوں میں اردو زبان کے تئیں دلچسپی اور رغبت پیدا نہیں کر سکتے، جب تک درخت کی جڑ مضبوط نہیں ہوگی، درخت مضبوط نہیں ہوگا۔ اس لیے ابتدائی سطح پر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اردو کے گرتے معیار پر بھی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لوگوں کو اردو کے لیے بیداری مہم چلا کر اردو سے جوڑنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ڈاکٹر ابوالکلام ریاستی حکومت کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ حکومت اردو کے فروغ کے لیے مختلف منصوبے چلا رہی ہے۔ اس کا فائدہ اردو داں حضرات کو اٹھانا چاہیے۔ کلا بھون میں ریاستی حکومت کے محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائریکٹوریٹ بہار حکومت کی ہدایت کے مطابق ضلع سطحی فروغ اردو ورکشاپ اور سیمینار سے وہ خطاب کر رہے تھے۔ اس موقعے پر ضلع انتظامیہ اردو سیل کے انچارج افسر محمد سہیل احمد بھی موجود تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں ضلع کے مختلف بلاکوں سے آئے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے سہیل احمد نے کہا کہ ضلع انتظامیہ کے ذریعے یہ پروگرام اردو داں طبقہ کو جگانے کے لیے ہے، انھوں نے اردو میں درخواست وغیرہ دینے کی اپیل کی۔ انھوں نے کہا کہ ضلع انتظامیہ کے اردو سیل میں اردو مترجم موجود ہیں، اردو داں حضرات کو اردو کے فروغ کے لیے مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ حکومت اردو کے فروغ اور اسے عام کرنے کے لیے کوشاں ہے، یہ اس وقت ممکن ہے جب آپ تک تعاون ملے۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے آمنہ میموریل اسپتال کے چیئرمین ڈاکٹر محمد طارق نے کہا کہ ہم لوگوں کو اردو کی تعلیم بچوں میں کم دی گئی لیکن آج اردو کی اہمیت ایسی ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہندوستان کی زبان ہے جو بہت ہی میٹھی ہے۔ آج ہندوستان میں زیادہ تر لوگ اردو کا استعمال کرتے ہیں۔ حکومت اپنا کام کر رہی ہے، ہم لوگ بھی اپنی ذمے داری کو سمجھیں اور آنے والی نسلوں کے لیے اردو کو زندہ رکھنا اور پڑھنے پر مجبور کرنا ہم لوگوں کی بڑی ذمے داری ہے۔ پروگرام کی صدارت محمد بدرالزماں نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 جنوری 2020

کرناٹک: ————————————

ڈاکٹر عابد معز کی ادبی اور علمی خدمات

بیدر: گورنمنٹ فرسٹ گریڈ وومنس ڈگری کالج، مقوعہ جنواڑہ روڈ بیدر کے شعبہ اردو کی جانب سے منعقدہ سیمینار بعنوان 'ڈاکٹر عابد معز کی علمی اور ادبی خدمات' پر بحیثیت

مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عموماً طنز و مزاح نگار خود کو ایک مثال بنا کر پیش کرتا ہے اور تحریک دیتا ہے۔ مزاح نگار معاشرے کو خامیوں سے پاک دیکھنا چاہتا ہے جس میں ڈاکٹر عابد معز جیسے طنز و مزاح نگار بھی شامل ہیں۔ ان کے فکاہیہ، شگفتہ افسانے، مضامین اور انشائیوں میں یہی چیز جھلکتی نظر آتی ہے اور یہ چیزیں خاندان کی طرف سے تربیت اور عطیہ ہوتی ہیں۔ درسِ انسانیت دیکھنا ہو تو عابد معز کی تحریریں پڑھیں۔ یہاں طالبات نے اپنے اپنے مضامین کے ذریعے عابد معز کی 34 کتابوں کا تذکرہ کیا۔ ان طالبات کے مضامین دیکھ کر کہنا چاہتی ہوں کہ آج اردو اتنی خوشحال، توانا، تندرست اور باصلاحیت ہے کہ نئی نسل اس قسم کے مضامین لکھ سکتی ہے جیسا کہ آج

ان طالبات نے پیش کیے۔ پروفیسر فاطمہ بیگم پروین صاحبہ نے اردو زبان کو اپنے ہی گھر میں بیگانہ بنا دیے جانے کی شکایت کی اور کہا کہ اردو کا کوئی صوبہ نہیں ہے، سرکاری امداد نہ ہونے کے باوجود بھی اس زبان میں استادم ہے کہ وہ پارلیمنٹ، تجارت (اشتہارات کے ذریعہ)، فلم اور بازاروں میں بولی، سمجھی اور اپنے جذبوں کے اظہار کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس سیمینار کا انعقاد کرنے والے ڈاکٹر ماجد میاں، ڈاکٹر شمس الدین اور ڈاکٹر عطیہ جیسے لیکچررس اور اس سیمینار کو اسپانسر کرنے والی محترمہ شمس النسا بیگم لائق صد تحسین ہیں۔ یہ بات ہم سب کے لیے اہم ہے کہ تیکھا، خوشگوار، مسکراتا اور جھنجھلاتا ہوا عابد معز کا قلم آج بھی رواں دواں ہے۔ صدر جلسہ ڈاکٹر راجپا لکچپا وڈی پرنسپل گورنمنٹ فرسٹ گریڈ ڈگری کالج بیدر نے اپنے صدارتی خطاب میں بتایا کہ زبانیں صرف رابطہ کے لیے ہوتی ہیں اور ہمارا ملک کئی زبانوں کی آماجگاہ ہے۔ ڈاکٹر عابد معز کے بارے میں سیمینار سن کر اچھا لگا اور پتہ چلا کہ موصوف کا کام ایک سائنٹفک ڈیولپمنٹ ہے۔ سیمینار کا آغاز طالبات نصرت بیگم اور سمیرہ بیگم کی تلاوت کلام پاک اور اردو/ کنڑا ترجمے سے ہوا۔ ڈاکٹر ماجد میاں لیکچرر گورنمنٹ فرسٹ گریڈ وومنس ڈگری کالج نے استقبالیہ کلمات کہے، طالبہ عرشیہ بیگم نے 'ڈاکٹر عابد معز کی تصانیف' عنوان پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ طالبہ اقصیٰ فاطمہ نے 'ڈاکٹر عابد معز- بحیثیت طنز و مزاح نگار' مقالہ پیش کیا اور محفل زعفران زار ہوگئی۔ طالبہ نازنین بیگم نے 'عابد معز- شگفتہ افسانہ نگار' عنوان پر خامہ فرسائی (تحریری) کی۔ طالبہ نیہا بیگم نے 'ڈاکٹر عابد معز کی کالم نگاری' عنوان پر لکھا اور بہتر طور پر پیش کیا۔ طالبہ سلطانہ بیگم نے ڈاکٹر سید خواجہ عابد معز بحیثیت MBBS ڈاکٹر' عنوان پر مضمون پیش کیا اور شہاب الدین بیدری قریشی کی مثنوی کو اردو زبان کی پہلی طبی کتاب بتایا کیونکہ اس مثنوی کا ایک حصہ جنسیات اور طب پر مشتمل ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 فروری 2020

گجرات:

محمد علوی: شخصیت اور شعری کائنات

احمد آباد: شعبۂ اردو/ فارسی، گجرات یونیورسٹی کے زیر اہتمام 18 جنوری 2020 بروز سنیچر کو اردو کے ممتاز اور جدید شاعر محمد علوی کی شاعری اور شخصیت پر ایک روزہ سیمینار بہ عنوان 'محمد علوی: شخصیت اور شعری کائنات' کا انعقاد گجرات یونیورسٹی کے بھاشا ساہتیہ بھون کے 'اوما شنکر جوشی

ہال' میں کیا گیا۔ اس موقع پر شعبہ کے صدر مسیح الزماں انصاری نے شعبے کی سرگرمیوں کا ذکر کیا۔ پروگرام کا آغاز محمد یاسین قریشی (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو/ فارسی گجرات یونیورسٹی) نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ بعدازاں معظم ہاشمی (شاعر، احمد آباد) نے خوبصورت اور مترنم آواز میں بارگاہِ رسالت میں نعتِ پاک کا نذرانہ پیش کیا۔

سیمینار کا افتتاح بھاشا ساہتیہ بھون کے ڈائریکٹر ڈاکٹر کملیش چوکشی نے کیا۔ اجلاس کی صدارت اور ساتھ ہی کلیدی خطبہ پروفیسر محی الدین بمبئی والا (ڈائریکٹر حضرت پیر محمد شاہ لائبریری) نے پیش کیا۔ انھوں نے محمد علوی کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے نمایاں کارناموں کا ذکر کیا اور ساتھ ہی ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو بھی اجاگر کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ محمد علوی نے جب شاعری کی ابتدا کی اس وقت ترقی پسندی کا دور تھا۔ شروع میں وہ بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ احمد آباد میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالی گئی اور 1947 میں ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس جو احمد آباد میں منعقد ہوئی اس میں محمد علوی، وارث علوی اور مظہر الحق ہی اس کے روح رواں رہے تھے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ محمد علوی کی شاعری میں غالب کی طرح محبوب کی لہراتی ہوئی زلفیں نہیں ملتی بلکہ زندگی کی تلخ سچائیوں کی مرقع کشی کرتی ہے۔ اس افتتاحی اجلاس میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر ندیم احمد (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)، ڈاکٹر محمد کاظم (پروفیسر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی)، پروفیسر نثار احمد انصاری، پروفیسر نصیر میاں قاضی اور میڈم شلونی جوشی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

پہلے اجلاس میں کل آٹھ مقالات پڑھے گئے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت کے فرائض پروفیسر محمد کاظم (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے انجام دیے اور کہا کہ محمد علوی کو جدیدیت کا نمائندہ شاعر کے ساتھ ساتھ وہ ایک کلاسیکی، ترقی پسند شاعر تھے۔ ان کے کلام میں میر کی سادگی اور احساس ہے، تو کلامِ غالب کی طرح غالب کی بے باکی اور شوخی بھی ہے نیز ان کے کلام میں ترقی پسند موضوعات و خیالات بھی پائے جاتے ہیں۔ اس موقعے پر کسی پر مغز مقالات پیش کیے گئے۔

صدارتی کلمات سے قبل سیمینار کے تعلق سے شرکاء کے تاثرات کا دور بھی رکھا گیا جس میں ابہام رشید، مولانا مظفر ہاشمی، جناب شبیر ہاشمی، حاجی میاں قادری اور زین العابدین انصاری (ممبر، گجرات اُردو ساہتیہ اکادمی) نے اپنے خیالات پیش کیے۔ صدارتی کلمات میں پروفیسر ندیم احمد نے پڑھے گئے تمام مقالات پر اظہار خیال کیا اور کہا کہ محمد علوی کی نظم 'ابن مریم ہوا کرے کوئی' ن م راشد کی نظم 'حسن کوزہ گر' کی یاد دلاتی ہے جس میں وہ ناسٹلجک ہو جاتا ہے اور ماضی میں چلا جاتا ہے۔ انھوں نے سلطان احمد کے مقالے جس میں انھوں نے محمد علوی کی شاعری کو قنوطی شاعری سے تعبیر کیا ہے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ محمد علوی قنوطی شاعر نہیں تھے بلکہ ان کی شاعری بھرپور زندگی کا پتہ دیتی ہے اور مایوسی سے نکلنے کی رہنمائی بھی کرتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ مستقبل کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر مسیح الزماں انصاری، صدر شعبۂ اردو، فارسی، گجرات یونیورسٹی، احمد آباد 6 فروری 2020

اعزاز و اکرام:

پروفیسر سید حسن عباس

رامپور: رامپور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر سید حسن عباس کو گذشتہ دنوں انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نئی دہلی میں

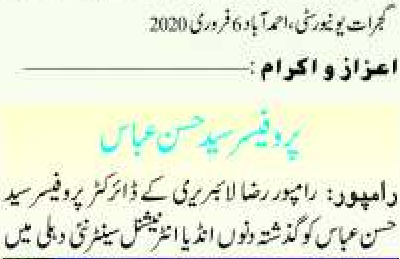

وزارت ثقافت حکومت ایران کی طرف سے منعقدہ تقریب میں ایرانی حکومت کی طرف سے معاون وزیر ارشاد ثقافتی امور حکومت ایران محسن جوادی کے ہاتھوں خصوصی ایوارڈ

سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ کلیات آزاد بلگرامی مرتب کرنے کے سلسلہ میں دیا گیا ہے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی 12ویں صدی ہجری، 18ویں صدی عیسوی کی نابغۂ روزگار شخصیت ہیں۔ انھوں نے عربی اور فارسی زبان و ادب کے لیے جو عظیم علمی خدمات انجام دی ہیں ان کے ذکر سے تواریخ ادب کے صفحات مملو ہیں۔ وہ معروف تذکرہ نویس کی حیثیت سے ہندوستانی تذکرہ نویسوں کے مابین سرفہرست شمار کیے جاتے ہیں۔ فارسی میں ان کے تین تذکرے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت کم تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے تین تین تذکرے لکھے ہیں۔ پروفیسر سید حسن عباس نے 8 نسخوں کی مدد سے آزاد بلگرامی کے کلیات کی ترتیب، تدوین و تصحیح کا مشکل ترین کام حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ ان کی یہ کتاب ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی نے 678 صفحات پر مشتمل 2015 میں شائع کی ہے جس پر انھیں یہ خصوصی اعزاز دیا گیا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر سید حسن عباس نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی اور رضا لائبریری کے ہم کاروں کو اس ایوارڈ کا حقدار قرار دیا اور کہا کہ دراصل یہ اعزاز ان تمام بزرگوں اور دوستوں کا ہے جنھوں نے علمی کاموں میں ہمیشہ میری دست گیری کی ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 جنوری 2020

شاہد ندیم اکبرآبادی

آگرہ: میوہ کٹرہ فوارہ پر واقع آستانہ حضرت میکش میں 'یادگار آگرہ' تنظیم کی جانب سے 'جشن بسنت' کے پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں مختلف قسم کے پروگرام پیش کیے گئے۔ شاہد ندیم اکبرآبادی کو نظیر اکبرآبادی ایوارڈ 2020 دیا گیا۔ اس موقعے پر صوفی و عظیم شاعر حضرت امیر خسرو، نیاز بے نیاز، محمد شاہ 'راج' کے علاوہ 'جن کوی' نظیر اکبرآبادی اور علامہ میکش اکبرآبادی کے کلاموں کو 'اپنا' اور 'جن کلا منچ' کے فنکاروں کے ذریعے پروگرام پیش کیا گیا۔ پروگرام کی شروعات 'جن کوی' نظیر اکبرآبادی کا کلام 'بھول ٹھٹھک ہٹ سنگ لگا لے اٹھ کا بیراگ' اور آخر میں 'آج رنگ ہے ری مارنگ ہے' جسے قلم بند کیا۔ امیر خسرو کے کلام سے اختتام پذیر ہوا۔ 'جن کوی' نظیر اکبرآبادی کے بھجن، بنجارنامہ اور میکش اکبرآبادی کی غزلوں کو آواز کمل گوسوامی نے 'بڑھاپا' لیش اپریتی نے 'جاڑے کی بہاریں' اور مانس رگھوونشی نے 'کورا برتن' پر جوہی تیواری نے 'ہولی' گا کر جشن بسنت کو رنگ برنگا کر دیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر کوی اشوک راوت، مہمان ذی وقار سماجی کارکن چودھری

اعجاز الدین قریشی کو مومنٹو دے کر نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 جنوری 2020

شبانہ محفوظ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ الیکٹریکل انجینئرنگ کی پروفیسر شبانہ محفوظ کو عالمی انوویشن اور سائنسی تحقیق (جی آئی ایس آر) فاؤنڈیشن کی جانب سے 'بیسٹ وومن

فار مران گورنمنٹ' کے زمرے میں انٹرنیشنل انسپائریشنل ویمن ایوارڈ 2020 سے نوازا گیا ہے۔ بین الاقوامی انسپریشن وومن ایوارڈز (آئی آئی ڈبلیو اے) 2020 جی آئی ایس آر فاؤنڈیشن کا ایک ایسا قدم ہے جو خواتین میں تبدیلی لانے والوں کی ناقابل تسخیر صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اعزاز سے نوازتا ہے۔ آئی آئی ڈبلیو اے سبھی جہتوں اور جغرافیائی حدود میں خواتین کی غیر معمولی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور ان کے عزم کو مزید مضبوط کرنے کے لیے کام کرتا ہے۔ جی آئی ایس آر فاؤنڈیشن سینئر محققین کے ایک گروپ کے ذریعے قائم کردہ ایک غیر منفعتی ادارہ ہے، جس کا مقصد مختلف شعبوں میں تحقیق، سیکھنے اور ترقیاتی سرگرمیوں کے فروغ کے ساتھ ساتھ معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے تعلیمی فضا ہموار کرنا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 30 جنوری 2020

سید کلیم اصغر

نئی دھلی: شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے سینئر اسسٹنٹ پروفیسر، ڈاکٹر سید کلیم اصغر کو انڈیا انٹرنیشنل سینٹر دہلی میں ایران کے ڈپٹی کلچرل منسٹر محسن جوادی،

ایران کے ہندوستان میں سفیر ڈاکٹر علی چگنی، جامعہ ہمدرد کے چانسلر سید شاہد مہدی کے دست مبارک سے 'دوسرا عالمی کتاب سال ایوارڈ (ایران)' فارسی کے مشہور فکشن نگار مجتبیٰ رحمان دوست کے فارسی افسانوں کے مجموعہ 'مفقود سوم' کے ترجمہ 'تیسرا لاپتہ' پر ایران کے باوقار اعزاز سے نوازا گیا۔ مجتبیٰ رحمان دوست انقلاب اسلامی ایران کے دوران کے مشہور فکشن نگار ہیں۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہیں کہ جنھوں نے انقلاب اسلامی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کی تمام تحریکوں میں شریک رہے۔ اس کتاب کا نہایت خوبصورتی کے ساتھ ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے اردو میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ خانہ فرہنگ ایران نئی دہلی سے شائع ہوا۔ اس ترجمہ کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 جنوری 2020

'سلام لکھنؤ' کے تحت متعدد قلمکاروں کو مصنف اودھ ایوارڈ

لکھنؤ: 'سلام لکھنؤ آئینۂ ثقافت دی میر آف کلچر سوسائٹی نے ہندی اور اردو مصنفین کو یوپی پریس کلب میں 'مصنف اودھ اعزاز 2020' سے نوازا۔ تقریب کی صدارت سینئر سماجی کارکن سید صوفی اظہار علی نے کی۔ تقریب میں کلاسیکی موسیقی کے استاد، قومی اور بین الاقوامی گلوکار استاد گلشن بھارتی اور انٹرنیشنل پلیئر تائیکانڈو کے استاد کھلاڑی، مارشل آرٹس کے قومی/ بین الاقوامی اداروں کے ڈائریکٹر سید رفعت رضوی مہمان خصوصی تھے۔ اعزازی پروگرام میں گیسٹ آف آنر کے طور پر آل انڈیا کلچرل ایسوسی ایشن کویت کے بانی/ صدر عثمان صدیقی، ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے گلوکار سماجی کارکن سہیل خان، ہومیوپیتھی کے نامور طبیب، سماجی کارکن ڈاکٹر امنگ کھنہ، سینئر سماجی کارکن رشی رام بھٹ موجود تھے۔ معزز شخصیت کو شال اور علامتی نشان اور توصیفی سند اور پودا پروگرام کے صدر صوفی اظہار علی اور مہمان خصوصی گلشن بھارتی، سید رفعت، عثمان صدیقی نے پیش کیا۔ ادارہ کے سبھی مہمانوں کا استقبال شال، پودا اور علامتی نشان دے کر کیا۔ اس موقعے پر بچوں کو اسکول بیگ، کاپیاں، کتابیں مہمانوں کے ہاتھوں دے گئیں۔ قابل ذکر ہے کہ 'سلام لکھنؤ' ادب، آرٹ کلچر، سماجی اور تعلیمی شعبوں میں نمایاں کام کرنے کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں سے تنظیم کی جانب سے مختلف شخصیات کو اعزاز دیا جا رہا ہے۔ سلام لکھنؤ کی جانب سے جن ادبا کو اعزاز دیا گیا ان میں ہماچل پردیش کے مصنف اور دلت شاعر ڈاکٹر جوگراج یوگ، سینئر مصنف ڈاکٹر سلیم احمد اور ڈاکٹر اسرارالحق قریشی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کے مصنف ڈاکٹر محمد معین الاسلام صوفی بستوی، ڈاکٹر محمد عارف خان عارف نجمی، ڈاکٹر صفت الزہرا زیدی،

ہندی کے اسسٹنٹ پروفیسر مصنف/ شاعر ڈاکٹر امت کمار اوستھی، اردو کے مصنف ڈاکٹر علی عباس، اردو کے مضمون نگار و صحافی محمد غفران نسیم، ہندی کی مصنف ڈاکٹر کیرتی اوستھی اور ڈرامہ نگار و مصنف کمال اختر کو اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 جنوری 2020

ڈاکٹر انور سعید

دیوبند: ہمارا یونانی ریسرچ اینڈ ٹریننگ سینٹر اور ہمارا ریمیڈیز پرائیویٹ لمیٹڈ کی جانب سے 2 روزہ ورکشاپ منعقد کیا

گیا، جس میں ملک کے طول وعرض سے مختلف اطبا اور ماہرین طب نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر حکیم سید احمد خاں نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر احسان احمد نے انجام دیے، جبکہ جامعہ طبیہ دیوبند کے سکریٹری ڈاکٹر انور سعید نے مہمانانِ خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ پروگرام کے دوران ڈاکٹر انور سعید کو حکیم عبدالعزیز خاں نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ورکشاپ کے پہلے اجلاس میں چنئی سے ڈاکٹر عبداللہ بیگ، بھوپال سے ڈاکٹر احسان احمد حکیم مولوی حامد علی خاں اور دیگر یونانی ماہرین شریک رہے۔ اجلاس کی صدارت جامعہ ہمدرد دہلی کے سینئر استاذ پروفیسر محمد اختر صدیقی نے کی۔ پروگرام میں شریک تمام طبیبوں کا گل پوشی کرکے استقبال کیا گیا۔ پروفیسر محمد اختر صدیقی نے اپنے صدارتی خطبہ میں طب یونانی کی اہمیت وافادیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اس تابناک مستقبل سے متعلق تفصیلات بھی بیان کیں، انھوں نے کہا کہ انھیں قوی امید ہے کہ ہمارا یونانی ریسرچ اینڈ ٹریننگ سینٹر طب یونانی کے فروغ کے لیے جدوجہد جاری رکھے گا۔ پروگرام کے اختتام پر ملک کے مختلف شہروں سے ورکشاپ میں شرکت کے لیے تشریف لانے والے اساتذہ اور اطبا کو ان کی خدمات کے اعتراف میں حکیم عبدالعزیز خاں نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایوارڈ پانے والوں میں پروفیسر محمد اختر صدیقی، ڈاکٹر ضمیر احمد، ڈاکٹر شاہد بدر اور ڈاکٹر محمد عارف کے نام قابل ذکر ہیں۔ آخر میں ڈاکٹر عبدالماجد نے تمام مہمانان کرام کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 3 فروری 2020

62 ویں آل مہاراشٹر اردو تقریری مقابلے کا انعقاد

بھیونڈی: جمعہ 10 جنوری 2020 کو رئیس ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج، بھیونڈی کا 62 واں آل مہاراشٹر بین المدارس

اردو تقریری مقابلہ کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر جناب اسلم فقیہ کی صدارت میں اسکول گراونڈ پر منعقد ہوا۔ اس اہم مقابلے کا اہالیانِ بھیونڈی اور محبانِ اردو کو شدت سے انتظار رہتا ہے جس میں بھیونڈی، ممبئی، ناسک، مالیگاؤں، دھولیہ اور قرب وجوار کے اسکولوں کے طلبہ و طالبات شریک ہوکر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں نیز اپنی بے ساختہ تقریروں سے سامعین کا دل جیت لیتے ہیں۔ امسال بھی 42 اسکولوں سے طلبہ شریک ہوئے۔ صبح 9 بجے دو گروپوں میں ابتدائی مقابلوں کا آغاز ہوا۔ گروپ الف کے جج مولانا حبیب الرحمٰن، جناب زاہد حسین سید، جناب سجاد اختر اور گروپ ب کے جج مولانا مصور الاسلام ندوی، ڈاکٹر ابوطالب انصاری اور جناب فاران آتش خان نے ہر گروپ سے دس دس بہترین مقررین کا انتخاب حتمی مقابلے کے لیے کیا۔ حتمی مقابلہ منتخب بیس طلبہ کے بیچ اسکول گراونڈ پر سہ پہر تین بجے منعقد ہوا۔ اس مقابلے میں مہمان خاص کی حیثیت سے حکومتِ مہاراشٹر کے رکن اسمبلی جناب رئیس قاسم شیخ موجود تھے۔ مہمانان کے طور پر جناب فاروق سید (مدیر، ماہنامہ گل بوٹے)، جناب اعجاز ہندی (معروف شاعر) اور جناب فرید خان (صدر اردو کارواں) کے علاوہ کے ایم ای سوسائٹی کے عہدے داران واراکین بالخصوص ڈاکٹر مصدق باقر پٹیل (اعزازی جنرل سکریٹری)، جناب معید مظہر آغا (جوائنٹ سکریٹری)، جناب شفیع محمود میاں مقری (چیئرمین، رئیس ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج)، جناب ندیم تاسے، جناب دانیال قاضی، ڈاکٹر راشد سید اور جناب سائمن ابوجی وغیرہ بھی موجود تھے۔ جناب فاروق سید، جناب اعجاز ہندی اور جناب فرید خان نے فائنل مقابلے میں جج کا فریضہ بھی انجام دیا۔ ججوں کے فیصلے کے مطابق نیشنل اردو ہائی اسکول آزاد نگر دھولیہ کے طالب علم انصاری محمد سدلیس محمد ساجد کو اول انعام، بھیونڈی میونسپل کارپوریشن اسکول نمبر 68 کی طالبہ انصاری کاظمہ محمد اسرائیل کو دوم، اقصی گرلز ہائی اسکول، بھیونڈی کی طالبہ انصاری قنوت فاطمہ ارشاد احمد کو سوم انعام، کے ایم ای سوسائٹی ہائی اسکول پڈگھا کی طالبہ مریم نثار احمد کو چہارم انعام اور مومن گرلز ہائی اسکول کی طالبہ انصاری حبا محمد اسلم کو پنجم انعام کا حق دار قرار دیا گیا اور مہمانان کے ہاتھوں انعامات دیے گئے۔ علاوہ ازیں پانچ حوصلہ افزائی کے انعامات بالترتیب شیخ مطلیحہ فراہیم رشید، خان انوشا خانم محمد اسرائیل، خان طوبیٰ ارم قطب الدین، عبداللہ شاہد انور فاروقی اور مومن اشعر ساجد انور کو دیے گئے۔ اس کے علاوہ بہترین مقرر، بہترین مقررہ اور بہترین مصنف کا بھی انعام دیا گیا۔ اس موقعے پر خواتین و حضرات کی ایک بڑی تعداد مقابلے کے آغاز سے اختتام تک ان تقریروں سے محظوظ ہوتی رہی۔ تقریب کا اختتام راشٹرگان پر ہوا۔

پریس ریلیز: رئیس ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج، مہاراشٹر، 14 جنوری 2020

رسم اجرا:

خون کے آنسو

آکولہ: بزم نایاب، آکولہ کے زیر اہتمام بروز جمعرات بتاریخ 23 جنوری 2020 کو شام میں جناب اسمٰعیل عطا

صاحب کے مکان پر بعد نماز عشا 9 بجے گلشن ریاست، اسلام پورہ، آکولہ میں مشہور ادیب وشاعر حمید ادیبی ناندوری کے شعری مجموعے 'خون کے آنسو' کی رسم اجرا جناب رفیع الدین مجاہد صاحب کے مبارک ہاتھوں سے انجام پائی۔ ان کی چھ کتابیں منظر عام پر آکر خاص وعام سے داد

حاصل کرچکی ہیں۔ ان کی اب یہ ساتویں تخلیق ہے۔ جناب عرفان ظفر نے کہا کہ حمید ادیبی ناندوری کے فکر انگیز مضامین ہمیشہ اخبارات کی زینت بن کر پڑھنے کو ملتے ہیں۔

ڈاک سے: حمید ادیبی ناندوری، ممبئی 28 جنوری 2020

بڑے شہر کا بڑا چاند

رامپور: مہاراجہ ہریش چندر پوسٹ گریجویٹ کالج کے شعبۂ اردو کی جانب سے منعقدہ شعبہ جاتی بیت بازی اور غزل سرائی کی تقریب میں ڈاکٹر شریف احمد قریشی (پرنسپل:

شری ہیرالال میموریل ڈگری کالج مہدی پور) کی 24 ویں تصنیف 'بڑے شہر کا بڑا چاند' (باتصویر بچوں کی کہاوتوں کا مجموعہ) کی رسم رونمائی کالج کے منیجر کاویہ سوربھ، پرنسپل ڈاکٹر مینا کول کے بدست عمل میں آئی۔ اس موقعے پر کالج چیف پراکٹر ڈاکٹر سدھیر کمار اروڑہ، صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عبدالرب، ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر اسما عزیز فاروقی کے علاوہ بڑی تعداد میں معزز خواتین و حضرات اور طلبا و طالبات موجود تھے۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کی مذکورہ کتاب ادب اطفال میں ایک گراں بہا تحفے سے کم نہیں۔ اس کتاب میں بچوں سے متعلق حکایتی کہاوتوں کو تصاویر یا اسکیچ کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 فروری 2020

کلکتے کا جو ذکر کیا

کلکتہ: کلکتہ گرلس کالج، شعبۂ اردو کے زیر اہتمام نوجوان ادیب فیضان الحق (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ

اسلامیہ) کی اوّلین کتاب 'کلکتے کا جو ذکر کیا' (سفرنامہ) کی رسم رونمائی کلکتہ گرلس کالج کی پرنسپل ڈاکٹر ستیہ اپادھیائے کے ہاتھوں کالج ہال میں عمل میں آئی۔ یہ سفرنامہ دراصل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون اور کلکتہ گرلس کالج، شعبہ اردو کے زیر اہتمام گذشتہ سال 29 اور 30 مارچ کو منعقد ہونے والے دو روزہ قومی سمینار بعنوان 'اکیسویں صدی میں اردو نظم' کی روداد اور شہر نشاط کے مختلف تاریخی مقامات کے ذکر پر مشتمل ہے۔ جس میں موصوف نے بحیثیت مقالہ نگار شرکت کی تھی اور 'اکیسویں صدی کے چند نظم گو شعرا: موضوعات و اختصاصات' کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔ موصوف کا یہ سفرنامہ 120 صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر امتیاز وحید (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) نے اپنی تقریر میں شہر نشاط کلکتہ کی اپنائیت کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ جو محبت اور فوری قبولیت نئے قلم کاروں کو کلکتہ میں ملتی ہے، وہ کہیں اور نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر فرزانہ شاہین (صدر شعبۂ اردو، سیرامپور کالج) نے اس کالج کی سابق طالبہ ہونے پر اپنے فخر کا اظہار کرتے ہوئے کتاب کی رسم اجرا پر فیضان کو دعاؤں سے نوازا۔ ہدیۂ تشکر کی رسم شعبہ اردو کی گیسٹ لیکچرر شیریں ظفر نے ادا کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 15 جنوری 2020

گرے ٹاور

نئی دہلی: ثنا فاطمہ کی کتاب 'Grey Tower' کی جے این یو کیفے ٹیریا میں رسم رونمائی عمل میں آئی۔ 'گرے ٹاور' انگلش زبان میں تخلیق کیا گیا تقریباً سو صفحے کا ناول

ہے جس میں بچوں کی نفسیات، عادات اور ان کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ ادب اطفال کا مواد اردو میں بہت کم ہے مگر انگریزی زبان میں اس پر مواد وافر مقدار میں موجود ہے۔ اس کے باوجود ثنا فاطمہ کا یہ ناولٹ انگریزی کے ادب اطفال میں بہت اہم اضافہ ہے۔ اکیسویں صدی کے بچے متعدد مسائل سے دوچار ہیں۔ نفسیاتی دباؤ کا ماحول ہے، اس نفسیاتی دباؤ میں ثنا فاطمہ کا یہ ناولٹ اہمیت کا حامل ہے جس میں بچوں کے متعدد مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ثنا فاطمہ دہلی یونیورسٹی میں گریجویشن کی طالبہ ہیں اور اردو کے ممتاز دانشور اور استاذ پروفیسر خواجہ اکرام صاحب کی بیٹی ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 30 جنوری 2020

قاری ابوالحسن اعظمی کی تصنیف 'یادوں کی کہکشاں' کا اجرا

یادوں کی کہکشاں

دیوبند: دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر القراء و رکن رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ مولانا قاری ابوالحسن اعظمی کی تصنیف کردہ 'یادوں کی کہکشاں' کی رسم اجرا قاسم پورہ روڈ پر واقع مولانا ابراہیم قاسمی کی رہائش گاہ پر موقر علما کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ تقریب کا آغاز سعد لکھنوی کی تلاوت قرآن کریم سے ہوا، اس موقعے پر دارالعلوم وقف دیوبند کے استاذ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ 'یادوں کی کہکشاں' ایسی یادوں کا بیان ہے جو ایک ممتاز انسان کی یادیں ہیں، یہ ان یادوں کا مجموعہ ہے جس میں زندگی کا حسن، زندگی کی عظمتیں، بلندیاں اور خوبیاں موجود ہیں۔ یہ کتاب عام شخص کی یادوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک محترم انسان کی یادوں کی سوغات ہے جس نے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو کارآمد اور مثالی بنانے میں جدوجہد، لگن، محنت کے ساتھ صرف کیا۔ خودنوشت کے باب میں یادوں کی کہکشاں، قابل ذکر اضافہ ہے۔ یہ ایسے شخص کی یادیں ہیں جس کی زندگی دوسروں کو مہمیز کرتی ہے۔ مدرسہ اصغریہ کے استاد قاری راغب نے کی۔ قاری صاحب کی زندگی کے متعدد پرکشش پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ تقریب کی نظامت کررہے سید وجاہت شاہ نے کہا کہ قاری صاحب کا قرطاس وقلم سے تعلق بے حد گہرا اور قدیم ہے، ان کی کثیر تصانیف ان کے علم، درک اور اپنے فن میں مہارت کا ثبوت ہیں۔ پروگرام کے آخر میں مولانا ابراہیم قاسمی نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 فروری 2020

وفیات :

عبید صدیقی

نئی دہلی: مشہور شاعر اور براڈ کاسٹر عبید صدیقی کا 9 جنوری کو انتقال ہوگیا۔ وہ 63 سال کے تھے۔ وہ طویل عرصے سے علیل تھے۔ کوشامبی ضلع غازی آباد کے ہاسپٹل میں ان کا علاج چل رہا تھا۔

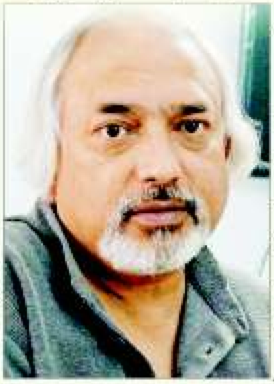

عبید صدیقی 1957 کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد 1988 میں آل انڈیا ریڈیو سری نگر سے وابستہ ہوئے۔ بی بی سی اردو سروس لندن سے بھی ان کی وابستگی رہی جہاں وہ 1996 تک رہے۔ 2004 میں انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا اے جے کے ماس کمیونی کیشن سنٹر جوائن کیا اور وہ ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔

عبید صدیقی مشہور براڈ کاسٹر کے علاوہ عمدہ شاعر بھی تھے۔ جمعہ کے دن جامعہ کے قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔ ان کا شعری مجموعہ 'رنگ ہوا میں پھیل رہا ہے' بہت مشہور ہوا۔

صاحب علی

ممبئی: اردو کے معروف اسکالر، مترجم، استاد اور سابق صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی پروفیسر صاحب علی کا 24 جنوری کو انتقال ہوگیا۔ وہ بہت متحرک اور فعال تھے۔ اکثر ادبی سیمناروں میں وہ شریک ہوتے تھے۔ ان کی اہم کتابوں میں

مبادیات عروض، ترقی پسند تحریک اور ممبئی، اردو فکشن ایک مطالعہ، قرۃ العین حیدر شخصیت اور فن، رانی کیتکی کی کہانی، اردو اور عربی کے لسانی روابط قابل ذکر ہیں۔ ریاض خیرآبادی کی صحافت پر ان کا بہت وقیع کام ہے۔ اس کے علاوہ گلدستہ پیام یار بھی ان کا اہم تحقیقی کام ہے۔ وہ اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ ان کی نگرانی میں بہت سے تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں۔ ان کے انتقال سے علمی وادبی حلقہ سوگوار ہے۔

قاری محمد میاں مظہری

نئی دہلی: قاری محمد میاں مظہری (سابق چیئرمین قومی اقلیتی ترقیاتی و مالیاتی کارپوریشن، حکومت ہند) جو روزنامہ 'سیکولر قیادت' اور ماہنامہ 'قاری' کے سابق ایڈیٹر تھے۔ 6 فروری 2020 کو حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تدفین بعد نماز جمعہ دہلی گیٹ قبرستان میں کی گئی۔ قاری صاحب گذشتہ کچھ عرصے سے عارضہ قلب میں مبتلا تھے۔ ان کے انتقال سے دہلی ایک صاحب طرز صحافی اور جید اسلامی اسکالر سے محروم ہوگئی۔ وہ مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے اور سیاست میں بھی دور تک رسائی رکھتے تھے۔ اٹل بہاری واجپئی نے اپنے دور اقتدار میں انھیں 6 سال کے لیے این ایم ڈی ایف سی کا چیئرمین بنایا تھا جس میں انھوں نے ملک کے پسماندہ طبقوں خصوصاً مسلمانوں کی مالی حصے داری کے لیے بہت سے منصوبے بھی تیار کیے تھے۔ قاری مظہری کے پسماندگان میں تین صاحبزادیاں اور ایک فرزند ہیں۔ ان کی عمر تقریباً 67 سال تھی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 7 فروری 2020

اجمل سلطانپوری

سلطانپور: مشہور شاعر اجمل سلطانپوری کا بدھ کی شام 20 جنوری کو انتقال ہوگیا۔ وہ 97 سال کے تھے۔ 'کہاں ہے وہ میرا ہندوستان جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں' ان کی نظم نے انھیں دنیا میں شناخت دلائی۔ ادب کی دنیا میں بے حد عزت و

احترام کے ساتھ اجمل سلطانپوری کا نام لیا جاتا ہے۔ اپنی تخلیق میں جذبات کی عکاسی کرنے والے اجمل نے اپنی شاعری کو مشاعروں میں زندہ کیا۔ اردو میں نغمے لکھنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اجمل سلطانپوری کو زندگی کے آخری لمحے تک ہندستان کی تقسیم کا درد رہا۔ 'میرے بچپن کا ہندوستان' اور 'تاج محل' ان کی یادگار تخلیق ہیں۔ انتقال پر حبیب اجمل نے کہا آج شاعری کی دنیا میں ایک دور کا خاتمہ ہوگیا۔ انھیں دبئی کی ایک تنظیم نے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا تھا۔ طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے وہاں نہیں جاسکے تھے تو ادارے کے نمائندوں نے خود جاکر سلطانپور میں انھیں ایوارڈ سے نوازا تھا۔ اترپردیش اردو اکادمی نے بھی انھیں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 جنوری 2020

نصرت بدر

ممبئی: مقبول نغمہ نگار اور شاعر نصرت بدر کا 23 جنوری 2020 کو انتقال ہوگیا۔ وہ مشہور شاعر بشیر بدر کے صاحب زادے تھے۔ انھوں نے ایکٹر کی حیثیت سے میرٹھ کی سرزمین سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ بعد میں فلمی دنیا سے وابستہ ہوگئے جہاں

انھوں نے تقریباً 800 نغمے لکھے اور بہت سے میوزک البم میں بھی ان کے نغمے ہیں۔ سنجے لیلا بھنسالی کی فلم 'دیوداس' میں 'ڈولا رے ڈولا' اور 'ہم پہ یہ کس نے ہرا رنگ ڈالا' ان کے لکھے نغمے بہت مقبول ہوئے۔ نصرت بدر کو ان کے بہترین نغمے کے لیے کئی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔

مشکور احمد فاروقی اسد مرادآبادی

مرادآباد: مرادآباد کے مشہور و معروف بزرگ شاعر اور سابق ایڈیشنل مجسٹریٹ و انفارمیشن آفیسر اور 'نوائے اسد' کے خالق مشکور احمد فاروقی اسد مرادآبادی کا 30 جنوری 2020 کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی عمر 79 سال تھی۔ مرحوم ایکتا وہار رامپور روڈ میں قیام رکھتے تھے۔

وہ با اخلاق و صوم وصلاۃ کے پابند تھے۔ ان کے مجموعہ

غزل 'نوائے اسد' کا جلد ہی اجرا عمل میں آنے والا تھا جسے ان کے چھوٹے بھائی رضوان احمد فاروقی نے بہت جانفشانی سے تیار کرایا تھا اور وہ چھپ کر تیار بھی ہے۔ جامعہ مسجد میں مسجد ہذا کے پیش امام قاری محمد ابراہیم نے نماز جنازہ ادا کرائی اور ان کے آبائی قبرستان خواجہ مصطفی میں سیکڑوں سوگواروں نے نم آنکھوں کے ساتھ سپرد خاک کیا۔ مرحوم کے دو بیٹے عارف عدیل اور کمال افضل ہیں جن کی شادیاں ہو چکی ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 31 جنوری 2020

پروفیسر محمد عرفان

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے سابق کنٹرولر امتحانات اور سینئر ماہر طبعیات پروفیسر محمد عرفان کا 8 جنوری کو جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج اسپتال میں علاج کے دوران انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 73 سال تھی۔ پروفیسر محمد عرفان 2007 سے 2009 تک اے ایم یو میں کنٹرولر امتحانات رہے۔ وہ 2004 تا 2007 شعبۂ طبعیات کے چیئرمین رہے۔ انھوں نے شعبہ کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے سرن (CERN) پروجیکٹ کے تحت بطور کوآرڈینیٹر سائنسدانوں کی ٹیم کی قیادت کی اور تحقیقی پروجیکٹ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ پروفیسر محمد عرفان اے ایم یو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے سکریٹری بھی رہے۔ وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے ان کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر عرفان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی، ان کی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کا سبھی نے اعتراف کیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 جنوری 2020

انوار احمد خاں

نئی دہلی: آل انڈیا ریڈیو کے سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور مشہور براڈ کاسٹر انوار احمد خاں کا طویل علالت کے بعد 6 فروری 2020 کو انتقال ہوگیا۔ وہ 63 برس کے تھے۔ مرحوم کو کینسر کا عارضہ لاحق تھا، جس کی تشخیص دو سال قبل ہوئی تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ نسرین ہاشمی کے علاوہ ایک بیٹی فرح خان اور ایک بیٹا فیصل انوار ہیں۔ انوار احمد خاں کی پیدائش 25 دسمبر 1957 کو بہار کے سیتامڑھی ضلع میں ہوئی تھی۔ انھوں نے 1975 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا تھا۔ بطور براڈ کاسٹر انھوں نے اپنے کریئر کا آغاز 1984 میں آل انڈیا ریڈیو اورنگ آباد سے کیا۔ وہ گورکھپور، لکھنؤ، سری نگر، بھوپال ریڈیو اسٹیشنوں سے وابستہ رہے۔ وہ دسمبر 2017 میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے سے آل انڈیا ریڈیو کی غیر ملکی نشریات کے شعبے سے سبکدوش ہوئے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 فروری 2020

خراج عقیدت:

عابد کرہانی کی یاد میں تعزیتی نشست

نئی دہلی: عابد کرہانی ایک قابل ادیب، قادر الکلام شاعر اور ایک حساس انسان تھے۔ وہ انتہائی منکسر المزاج، ملنسار اور خوش اخلاق تھے۔ ان خیالات کا اظہار معزز مقررین نے سماجی و ثقافتی تنظیم آئیڈیا کمیونکیشن کے زیر اہتمام معروف شاعر و ادیب اور ماہنامہ آجکل کے سابق مدیر عابد کرہانی مرحوم کی یاد میں منعقد ایک تعزیتی نشست میں کیا۔ نشست کی صدارت آئیڈیا کے نائب صدر ڈاکٹر سید فاروق نے کی۔ اہم مقررین و شرکا میں ان کی اہلیہ ناہید کرہانی، مراد کرہانی، سلمان کرہانی، اعظم عباس شکیل، سطوت زہرا، آئیڈیا کے ڈائرکٹر آصف اعظمی، دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول، دور درشن کے سابق ڈائرکٹر مظہر محمود، دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر ابوبکر عباد، سینئر صحافی معصوم مرادآبادی، منور حسن کمال اور سہیل انجم، سماجی کارکن حاجی میاں فیاض الدین، دوست نبی خان وغیرہ شامل تھے۔ واضح رہے کہ ممتاز شاعر شمیم کرہانی کے فرزند عابد کرہانی (اصل نام سید عابد اختر) کی پیدائش 18 نومبر 1950 کو دہلی میں ہوئی تھی۔ انھوں نے پی آئی بی، آل انڈیا ریڈیو اور پبلی کیشن ڈویژن کے علاوہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ میں خدمات انجام دیں۔ وہ طویل عرصے سے عارضۂ جگر کا شکار تھے اور علاج کے سلسلہ میں میدانتا ہسپتال میں ایڈمٹ تھے اور وہیں 23 نومبر 2019 کو انھوں نے آخری سانس لی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 20 جنوری 2020

علی انوار زیدی

امروھه: شہر کے دربار میر انخاں واقع عابدی ہاؤس میں حسن آرا ٹرسٹ کے زیر اہتمام موانہ کے مشہور شاعر علی انوار زیدی کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں مرحوم شاعر علی انوار زیدی کی ادبی خدمات کی پذیرائی کی گئی۔ اس دوران صحافی علی عابدی نے بتایا کہ مرحوم علی انوار زیدی صحافی انجم زیدی کے والد تھے۔ وہ ایک اصلاحی شاعر تھے، مسلسل نعت، منقبت و مرثیہ لکھنے میں مصروف رہتے تھے، حال ہی میں رثائی کلام و مرثیہ کے حوالہ سے ان کی کتاب منظر عام پر آئی تھی۔ سلیم امروہوی نے کہا کہ علی انوار زیدی دہلی کی ادبی محافل کی رونق تھے، ان کے انتقال پر ملال کے بعد ادبی نشستوں میں ان کی کمی محسوس کی جائے گی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 جنوری 2020

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے لیے موصول ہونے والے مضامین کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ہر مضمون کی اشاعت نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ہر مضمون نگار سے رابطہ آسان ہے۔ اسی لیے دسمبر 2018 تک موصول ہونے والے مضامین کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔ اب مضامین کی اشاعت یا عدم اشاعت کی اطلاع مضمون موصول ہونے کے ایک ماہ کے اندر ہی دے دی جائے گی۔ اگر اطلاع نہ ملے تو آپ مندرجہ ذیل نمبر 011-49539009 پر اپنے مضمون کے بارے میں استفسار کر سکتے ہیں۔

ایک اور گذارش یہ ہے کہ میر، غالب، اقبال یا ان ادبا پر جن کے حوالے سے کافی کتابیں اور مقالے لکھے جا چکے ہیں، مضامین بھیجنے سے اولاً تو گریز کریں اور اگر ان شخصیات پر مضامین بھیجیں بھی تو مضمون میں نئے زاویے یا نئی جہت کی نشان دہی ضرور فرمائیں، اس کے بغیر اس نوع کے مضامین شائع نہیں کیے جائیں گے۔ اردو زبان کی زمینی صورت حال، تاریخ، آثار قدیمہ، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، علاقائی ادبی صورت حال، ہندوستان کی علاقائی زبانوں کا ادب، عالمی ادبیات، تکنیکی اور سائنسی ترقیات اور گمنام، فراموش کردہ قلم کاروں، رسائل کے خصوصی شماروں، اور نئے موضوعات کے حوالے سے لکھے گئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی

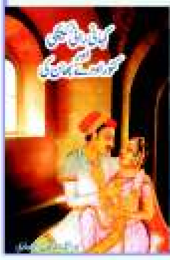

مصنف: میر انشاء اللہ خاں انشا دہلوی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 30

قیمت: 35 روپے

لفظ (کچھ نظمیں اور غزلیں)

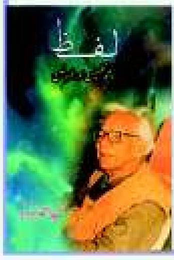

مصنف: آل احمد سرور

دوسری طباعت: 2019

صفحات: 95

قیمت: 70 روپے

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ

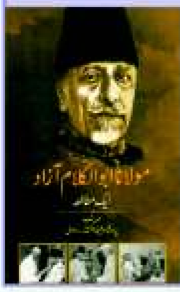

مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی

دوسری طباعت: 2019

صفحات: 474

قیمت: 215 روپے

قطبی علاقے کیا ہیں؟

مصنف: ہایانون

اردو مترجم: انیس الحسن صدیقی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 20

قیمت: 20 روپے

مثنوی مولانا روم (جلد اوّل، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم)

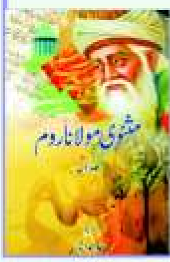

مترجم: سید احمد ایثار

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 223 (جلد اوّل)، 191 (دوم)، 251 (سوم)، 200 (چہارم) 238 (پنجم)، 256 (ششم)

قیمت: 780 روپے (فی سیٹ)

صحت الفاظ

مصنف: سید بدر الحسن

ساتویں طباعت: 2019

صفحات: 253

قیمت: 90 روپے

کہکشاں (اقبال کے بعد نظمیہ شاعری)

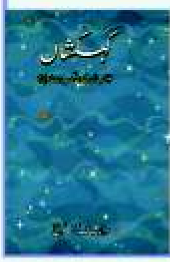

مصنف: وارث علوی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 527

قیمت: 240 روپے

عام لسانیات

مصنف: پروفیسر گیان چند جین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 910

قیمت: 395 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, March-2020, Vol.22, Issue:03
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/02/2020
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

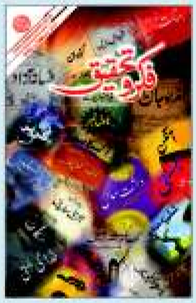

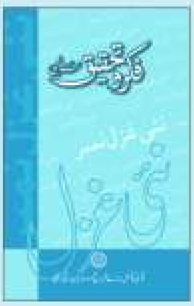
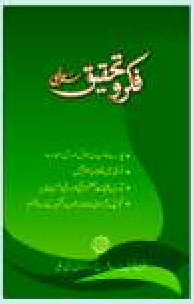

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025